

مستنصر حسین تارڑ

"ہیلو ہالینڈ"

(سفرنامہ)

TORONTO PUBLIC LIBRARY
37131 141 898 965

"ہیلو ہالینڈ"

(سفرنامہ)

مستنصر حسین تارڑ

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

نوفل۔مشال۔یاشار۔ابراہیم اور طلحہ کے نام..ٹیولپ کے ایسے سدا بہار پُھول جو میرے آنگن میں بہار بن کر اترے..آنے والے کل میں کیا جانئے کہ وہ اپنے نانا اور دادا پر فخر کرتے ہیں یا اُس کے حوالے سے شرمندہ ہوتے ہیں..

خصوصی شکریہ..

ناجیہ اور اعزاز احمد۔

اعجاز سیفی۔عمران ثاقب۔صدف مرزا اور وہ سینکڑوں اجنبی چہرے جو ہیگ، برسلز اور کوپن ہیگن میں میرے لیے محبتوں کے چراغ روشن کیے موسموں کے عذاب سہتے آئے..اور ٹیولپ کے وہ پُھول جو ان دنوں میرے صحن میں ہالینڈ کی یاد کے رنگ رنگ صحیفے رقم کرتے کِھلتے ہیں...اِن سب کا احسان اور شکریہ۔

910.4 Tarar, Mustansar Hussain
"Hello Holland"/ Mustansar Hussain Tarar.- Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2011.
224pp.
1. Urdu Literature - Travelogue.
I. Title.

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ سنگ میل پبلی کیشنز/ مصنف سے باقاعدہ تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اس قسم کی کوئی بھی صورتحال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے۔

2011

نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2454-3
ISBN-13: 978-969-35-2454-3

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

''ہیلو ہالینڈ''

1- ''گُل لالہ کے دیس میں..چالیس برس بعد..محبتوں کے چراغ'' 7

2- ''ستمبر 1956ء، ایک پنکھوں والا جہاز ایمسٹرڈیم کو اُڑا جاتا ہے'' 13

3- ''مُونا ہالینڈ..ایک پن چکّی تو یہ ہالینڈ ہے'' 19

4- ''ہیگ کی شب..اُس شب میں نے مینڈرلے کو خواب میں دیکھا'' 23

5- ''ملکہ جولیانا، ناجیہ اور اعزاز'' 29

6- ''وزیرستان کا شیر دھاڑتا ہوا ہمیں برسلز لے جا رہا ہے'' 37

7- ''ایک کیوبن، دو فرانسیسی لڑکیاں اور صرف ایک پاکستانی
ایک ہی فلیٹ میں خوابیدہ گئے زمانوں میں'' 40

8- ''پیشاب کرتا بچّہ اور گرم اور گیلے بوسے'' 47

9- ''بلجیم گٹ ہیرے اور ہم برسلز میں تھے'' 57

10- ''میرے اعزاز میں ایک یادگار غافل محفل'' 64

11- ''شب برسلز میں..آئے کُچھ ابر کُچھ رباب آئے'' 70

12- ''واٹرلُو کے میدان میں..نپولین بہت ہو گیا'' 74

13- ''نپولین کافی اور جوزفین آج کی شب نہیں'' 84

14- ''ہیگ میں خزاں کے زرد آنسو پتّے گرتے جاتے ہیں'' 88

15- ''کُچھ مقامی ''دوستوں'' سے ملاقات'' 92

16- ''ہینڈل بار مونچھیں، کارڈرائے کا کوٹ اور وہ حنیف جو مر چکا'' 97

17- ہیگ کی ایک شبِ بے مثال..جس میں سارے چہرے میری محبت میں دمکتے تھے'' 106



Digitized by the Internet Archive
in 2022 with funding from
Kahle/Austin Foundation

https://archive.org/details/hellohalaindsafa0000tara

''گُل لالہ کے دیس میں.. چالیس برس بعد.. محبّتوں کے چراغ''

''محض خواہش کی شبنم گرانے سے بیتے زمانے لوٹ کر نہیں آتے..
نہ وہ خواہش کی شبنم تمہارے رخساروں کو نم بوسوں سے چھوتی ہے..
اور نہ ہی محض آواز دینے سے وہ بیتے زمانے لوٹ کر آتے ہیں..
اور نہ ہی تمہارے بدن میں دوبارہ مہک مچاتی ہیں وہ زرد کلیاں..
جنہیں زمانوں کی راکھ میں دفن ہوئے مدتیں بیت گئیں اور نہ وہ گُل لالہ..
پھر سے کھلتے ہیں جو کب کے مُرجھا چکے..
کہ اس دوران ایمسٹرڈیم کی جادوگرنیاں نہروں کے پُلوں تلے
بے انت زمانوں کے پانی کب کے بہہ چکے..
یہ زرد کلیاں اور گُل لالہ اور نہروں کے پانیوں پر بہتے خزاں رسیدہ پتّے..
مجھے نہیں پہچانتے..
اور کیسے پہچان سکتے ہیں کہ ہر شے تغیّر کے ایک بہاؤ میں ہے..
ان سب نے مجھے تب.. چالیس پچاس برس پہلے دیکھا تھا تو
کیسے پہچان سکتے تھے..
انہوں نے مجھے تب دیکھا تھا جب..
جوانی کی مُنہ زور وحشت میری باچھوں کو چیرتی تھی..
میرے گھنے گھنگھریالے سیاہ بالوں میں انگلیوں کی نزاکت..

18- ''میمونہ کی سیال سیاہ آنکھوں میں ایمسٹرڈیم کی نہریں بہتی ہیں'' 112
19- ''سوہنا شہر اے ایمسٹرڈیم'' 119
20- سیکس میوزیم۔واڈ کا میوزیم اور ایمسٹرڈیم کی ہیرا منڈی'' 127
21- ''آئینے میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں'' 143
22- ''حنوط شدہ لوگ'' 146
23- ''کوپن ہیگن میں..برف گرتی ہے، ساز بجتے ہیں'' 148
24- ''برف میں دفن شہر میں دو محبت کرنے والے'' 157
25- ''برف کے عذاب ہیں''خس وخاشاک زمانے'' 165
26- ''ریڈیو، ٹیلی ویژن اور پھر ایک ''یادگار'' انٹرویو'' 171
27- ''دیئر از سم تھنگ راٹن ان دے سٹیٹ آف ڈنمارک'' 178
28- ''سویڈن کی شب میں، میمونہ اور میں برف میں حنوط ہوتے ہیں'' 182
29- ''جاٹ سنڈروم'' اِن یورپ..جٹ لینڈ'' 192
30- ''ننھی جل پری چین سے واپس آ گئی'' 201
31- ''ہالینڈ کی کنجوس ملکہ اور ناجیہ کی ناکام سازش'' 208
32- ''ذاتی ڈائنوں کے ہمراہ ایک ایرانی ریستوراں میں اور کیا پاکستانی بھی پھولوں سے پیار کرتے ہیں'' 213
33- ''ایمسٹرڈیم ایئرپورٹ..''پلیژر پرفیوم'' آئس کریم اور ٹیولپ کے بلب'' 219

وہی ہو گیا جو کہ میں کبھی تھا..
ایک جست لگاتے چیتے کی مانند خوش بدن اور خوش آثار..
گُلِ لالہ جو مرجھا چکے تھے پھر سے بہار آور ہونے لگے..
دفن ہو چکی کلیاں اس سرزمین میں سے پُھوٹنے لگیں..
اور ایمسٹرڈیم کی نہروں میں وہی پانی پھر سے رواں ہونے لگے..جو..
مُجھے پہچانتے تھے..
اے ہالینڈ تیرا شکریہ..
اس طویل جُدائی کے دوران صرف میں نہیں، تُو بھی تو تغیر آشنا ہوا..
تُو اب صرف گُلِ لالہ کا دیس نہیں رہا..
تجھ میں اب چمبیلی اور موتیے کے پُھول بھی مہک آور ہوتے ہیں..
مجھے کیکر کے زرد پُھولوں کی ہلکی خوشبو محسوس ہوتی ہے..
زرد کلیوں کے رُوبہ رُو سرسوں کی زردی کی بہار ہے..
اے ہالینڈ.. یہاں صرف فان خوخ کی ''ستاروں بھری رات'' کا طلسم ہی نہیں..
بلکہ شبِ معراج کے ستارے بھی درخشاں ہوتے ہیں..
تیری نہریں ابھی تک اُس عشقِ خاص سے آشنا نہ تھیں..
جس کے بارے میں حافظ برخوردار نے کہا تھا کہ..
حافظ ہاتھی عشق دا، پوش کریندا پوش..
اور سُخن کے وارث نے بیان کیا تھا کہ..
عشق بولدا نڈھی دے تھاؤں تھائیں..
آج اُن نہروں میں چناب کی سوہنیاں اترتی ہیں..
سندھ کی ماروئیاں اپنے کومل بدن نکھارتی ہیں..
میرے وطن کے مہینوال، رانجھے اور مرزے اس ہالینڈ میں..
اپنی مشقتوں کے پسینے سے اسے سنوارتے ہیں..
اُنہوں نے ہالینڈ کو میرے لیے ایک اور پاکستان بنا دیا ہے..

اٹک اٹک جاتی تھی..
ایک جَست لگاتے ہوئے چیتے کی مانند میرا بدن..
سُتا ہوا، تُند اور جھپٹنے والا ہوا کرتا تھا..
اور اب تغیّر کے بہاؤ کی زد میں آ کر میں اجڑ چکا تھا..
رگوں میں کبھی دوڑتا خون تھم تھم کر ہانپتا تھا کہ
اُس میں برف کی کرچیاں سرد ہوتی تھیں..
ایک بے ڈھب بوڑھا بدن جس کی توند کو گھیرے میں لینے والی..
کوئی بیلٹ ابھی تک ایجاد نہیں ہوئی..
جس کے بال خال خال ہیں اور اُن میں سے چُندیا چمکتی ہے..جیسے..
کسی دیوداسی کی بِندیا چمکتی ہے..
اور یہ بوڑھا ان خال خال بالوں کو اپنے نامۂ اعمال کی سیاہی سے رنگتا ہے تو
شائبہ ہوتا ہے کہ اُس نے خضابِ الٰہی لگا رکھا ہے..
جھپٹنا پلٹنا اور پلٹ کر جھپٹنا تو کب کا موقوف ہو چکا..
اب تو آسانی سے پلٹنا بھی مشکل ہوا جاتا ہے کہ کہیں کمر میں بل نہ پڑ جائے..
یہ بوڑھا ایک چھوٹا سا گملا اٹھانے سے بھی گریز کرتا ہے کہ کہیں..
اُسے چَک نہ پڑ جائے..
اور اُس کے چند ایک دانت بوسیدہ ہو کر جل ترنگ بجاتے گرنے کے بہانے..
تلاش کرتے ہیں..
اُن میں سے ایک دانت آبنائے الاسکا کے سمندروں میں دفن ہے..
اور وہ اپنے لیے خواہش کرتا ہے کہ جس روز قضا آئے..
اُسے اپنے ماں باپ کی قبروں کے آس پاس جگہ مِل جائے..
پر یہ کیسا معجزہ ظہور پذیر ہوا کہ ہالینڈ نے پھر سے مجھے یاد کر لیا..
اتنے اَن گنت برسوں کے بعد مجھے اپنے پاس بُلا لیا یُوں کہ..
میں پھر سے جو محبت مجھ پر نچھاور کی گئی اُس کی مسیحائی پھونک سے..

لاہور کے نسبتاً گرم دسمبر میں بھی یُوں کھلے ایسے گُل بہار ہوئے کہ اُن کے جامنی اور گلابی پُھولوں کی مہک اتنی خمار آور حد تک ہر سُو پھیلی کہ پورا گھر مہکنے لگا..ہم رات کو اُنہیں صحن سے اٹھا کر اپنے بیڈ روم کی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیتے اور پوری شب جب کبھی جاگتے اُن کی مست مہک سے مدہوش ہو کر پھر سے سو جاتے اور وہ ہمارے خوابوں کو بھی یُوں معطّر کرتے جیسے وہ کسی فرید الدین عطّار کی دکان میں کشید کردہ ہوں..ان دونوں کے سوا..تیسرا ایک مختصر گملے میں قید امریلس کا ایک بلب تھا جو کہ ایک شیر کا چہرہ کہلاتا تھا..اور واقعی جب اُس میں پُھول کھلے تو وہ اتنے بڑے اور سُرخ رنگت کے تھے کہ جو بھی مجھ سے ملاقات کرنے آتا وہ اُن کے قریب آ کر ٹھٹک جاتا، وہ اتنے بڑے تھے..اُن کا بوجھ اتنا تھا کہ وہ ذرا سی ہوا کے چلنے سے ہی اوندھے ہو کر گر جاتے..

اور وہ جو چوتھا اور آخری تھا وہ ایمسٹرڈیم سے خریدا ہوا ایک جاپانی ''بانسائی'' تھا..ایک مختصر درخت تھا..

تو یہ وہ چار وِں تھے جو دسمبر کی اُس رات میں جب میں نے ہالینڈ کے سفر کی روئداد قلمبند کرنے کے لیے قلم تھاما مجھے اُس گُل لالہ کی سرزمین کی یادوں میں یُوں لیے جاتے تھے جیسے ہولے ہولے بڑھتا نشہ آپ کو اپنے عشقِ خاص کی جانب لیے جاتا ہے..

''جب موسمِ بہار کا آغاز ہوگا میں ایک مرتبہ پھر
اپنی محبوبہ کے لیے ایمسٹرڈیم سے گُلِ لالہ لے کر آؤں گا..
ہاں، ایک محبت بھرے دل کا تحفہ..
میں تمہارے لیے ایمسٹرڈیم سے گُلِ لالہ لے کر آؤں گا..''

(ایک ڈچ لوک گیت)

جب میں اور میمونہ لاہور سے اڑتے ہوئے..اور میں بن پتنگ اُڑ جاؤں رے..ہم دونوں تقریباً آٹھ گھنٹوں کی آزار کن اڑان کے بعد ایمسٹرڈیم کے ایئرپورٹ شپ ہول پر اترے..اپنے دونوں بیگ گھسیٹتے ہوئے باہر آئے تو ہمیں خدشہ تھا کہ شاید ہمیں وصول کرنے کے لیے وہاں کوئی نہ ہو..موسم سرما کی شدتوں کی پہلی کپکپاہٹ موسموں سے کشید ہوتی ہمارے بدنوں میں اترتی تھی، اگرچہ ہم دونوں کارنیل ایسے سرد ترین علاقوں کی شدت جھیل جانے والی نہایت اعلیٰ سیاہ جیکٹوں میں ڈھکے ہوئے

اور اُنہوں نے میرے لیے اپنے دل کے دیے جلائے ہیں۔ عشق کے چراغ روشن کیے ہیں..

؎ بال چراغ عشق داتے کر دے روشن سینہ..
دل دے دیوے دی روشنائی جاوے وچ زیناں..

تو اے ہالینڈ تیرا شکریہ..

تُو نے نہ صرف میرے مہینوالوں، رانجھوں اور مرزوں کو اپنی پناہ میں لیا بلکہ..
مجھ بے توقیر کو بھی دوبارہ ملاقات کے لیے سندیسہ بھیج دیا..
میرا دل بھی تیری محبتوں کے چراغوں سے روشن ہو گیا ہے..
اے ہالینڈ..

''چار چیزیں ہیں جو ہر دسمبر میں مجھے بلاتی ہیں، ان میں سے ایک شکار ہے، قادر آباد کے آس پاس اور وادیٔ سوات کا ایک سلیٹی منظر ہے اور کامران کی بارہ دری سے لگ کر بہتا ہوا دریائے راوی ہے.. اور چوک چکلہ ہے.. چار چیزیں ہیں۔''

(ناول ''راکھ'' کا آغاز)

ہالینڈ نے مجھے دسمبر میں نہیں نومبر میں بلایا..

اور آج اس سرد سیاہ شب میں جب میری سٹڈی کے باہر دسمبر کی رُت کے پالے اترتے ہیں.. چیڑ کے درخت کے بالوں میں ایک ہلکی دُھند تیرتی ہے.. یہاں تک کہ گارڈن لائٹس کی روشنیاں بھی ٹھٹھرتی مدھم ہوتی ہیں، چار چیزیں ہیں جو مجھے ہالینڈ کی یاد کی قربت میں لیے جاتی ہیں.. اور اُن چاروں میں نہ تو قادر آباد کی جھیلوں کا کوئی شکار منظر ہے نہ کوئی دریا اور سوات کا ایک سلیٹی منظر بھی نہ تھا اور نہ ہی کوئی چوک چکلہ ہے.. بلکہ چار گُل بدن بُوٹے ہیں جنہیں میمونہ نے اتنی احتیاط سے ایک سُوٹ کیس میں پیک کیا کہ ایمسٹرڈیم سے لاہور تک کہ فضائی سفر کے دوران اُن کی نازکی کو کوئی گزند نہ پہنچے.. کہ وہ گُل بُوٹے اور اُن کا پتہ پتہ ہالینڈ میں ہمارا حال جانے تھا.. اُن چاروں میں سے سنگ مرمر کے گملوں میں بوئے ہوئے دو ہائی سنتھ پھولوں کے بلب تھے جو ابھی پُھوٹ رہے تھے جنہیں میں نے ہیگ کی ایک گُل فروش مہربان مائی سے خریدا تھا.. اور وہ دونوں جو برف آلود موسموں میں ہی کھلتے تھے

''ستمبر 1956ء، ایک پنکھوں والا جہاز ایمسٹرڈیم کو اڑا جاتا ہے''

کے ایل ایم.. یعنی رائل ڈچ ایئر لائن کا سُپر کانسٹیلیشن ہوائی جہاز، پنکھ لگیں تو اڑ جاؤں میں کی مانند اپنے پنکھوں کی مدد سے اڑتا جاتا ہے کہ ابھی جیٹ ہوائی جہاز ایجاد نہیں ہوئے.. کراچی ایئر پورٹ سے اڑنے والے اس اڑن کھٹولے میں ایک سترہ برس کا نوجوان جو ابھی باقاعدگی سے شیو نہیں کرتا اپنی نشست میں دبکا بیٹھا ہے اور غالباً ابھی ابھی اُس کی آنکھوں میں سے موٹے موٹے آنسو اترے تھے کہ اُسے اپنی امّی یاد آ رہی تھیں.. اگرچہ اُس کی امّی نے اُس کے لیے خصوصی طور پر دیسی روئی سے بھری ایک رضائی اپنے ہاتھوں سے تیار کی ہے تاکہ اُن کے بیٹے کو انگلستان کی برفوں سے محفوظ رکھے پر.. وہاں امّی کے ہاتھوں کے بنائے ہوئے پراٹھے تو نہ ہوں گے.. اور یہ خیال اُسے پھر سے آبدیدہ کر دیتا ہے.. کراچی ایئر پورٹ پر اُس کے ابّا جی اور ماموں اُسے چھوڑنے آئے تھے اور وہاں اُسی پرواز سے سفر کرنے والے ایک سویٹ سے مولوی جی بھی تھے تو انہوں نے اُن سے درخواست کی تھی کہ بچّہ ہے، ذرا اس کا دھیان رکھیے گا حالانکہ ایک نوخیز بچّے کو کسی مولوی جی کے سُپرد کر دینا خطرے سے خالی نہیں ہوتا کہ کیا پتہ اُن میں بھی عِلّت مشائخ ہو لیکن یہ مولوی جی نہایت معصوم اور سویٹ سے تھے جو انگلستان میں تبلیغ کرنے کی غرض سے گھر سے اور اپنی مسجد سے نکل کھڑے ہوئے تھے.. سفر کے دوران کُھلا کہ انگریزی سے یکسر ناواقف تھے کیونکہ ہم راستے میں جس کسی ائر پورٹ پر اُترے اور وہاں ہمیں کُچھ امیگریشن فارم وغیرہ پُر کرنے کے لیے تھما دیئے گئے تو مولانا انہیں میری جانب کھسکا کر کہتے ''لو بیٹا.. ان میں جو بھرنا ہے وہ میری طرف سے بھر دو..'' چنانچہ بجائے اس کے کہ وہ دورانِ سفر بچّے کا خیال رکھتے، بچّہ اُن کا خیال رکھتا رہا.. جب میں نے پوچھا کہ مولوی انکل آپ کو انگریزی تو آتی نہیں تو

تھے..میں نے سُمیر کی اور میمونہ نے اُس کی بیگم طیبہ کی فَر کے براؤن کالر والی جیکٹ پہن رکھی تھی یعنی ہم دونوں مستعار شدہ ملبوسات میں ملبوس تھے..شب کے سیاہ آسمانوں میں سے ٹپ ٹپ بارش کے سرد آنسو گرتے تھے تو ایسے میں اگر ایئرپورٹ کے باہر کوئی بھی ہمارا منتظر نہ ہوا تو ہم کیا کریں گے..لیکن وہاں ایک ولندیزی شکل وصورت کا معنک شخص نہایت دھیرج سے ہماری جانب چلا آتا تھا''میرا نام شاہد ہے اور میں پاکستانی سفارت خانے کی جانب سے آپ کو لینے کے لیے آیا ہوں..ہیگ میں پاکستان کے سفیر اعزاز احمد چوہدری اور اُن کی اہلیہ رات کے کھانے پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں..آیئے..''

ہم دونوں جو سفر کی تھکاوٹ سے مرجھا چکے تھے ٹیولپ کے پھولوں کی مانند یک بارگی کھل گئے..

شاہد ایک دھیمی طبیعت اور دھیمی رفتار کا ڈرائیور تھا..

بارش سے بھیگتی شاہراہ پر اَن گنت کاروں کی روشنیاں پھسلتی چلی جاتی تھیں..میں نے کھڑکی کے شیشے سے ناک جوڑ کر اُس رات کے اندر کسی ایسے آثار کو دریافت کرنے کی جستجو کی جو مجھے خبر کرے کہ میں ہالینڈ میں ہوں..اور پھر تاریکی میں گُم ایک ہموار کھیت کے درمیان میں مجھے ایک پن چکّی کا ہیولیٰ سا نظر آیا..نظر آیا اور گزر گیا..تو میں واقعی ہالینڈ میں تھا..

یہ کونسی جگہ ہے گزرے تھے ہم جہاں سے..

♦♦.....♦♦.....♦♦

تھے۔ اگرچہ کن اکھیوں سے تکتے بھی جاتے تھے اُس بیلی ڈانسر کو جس کی ناف میں ایک ہیرا.. یا شاید کانچ کا کوئی ٹکڑا پیوست تھا اور جانے کیسے قائم تھا کہ وہ ناف گویا بھونچال کی ایک آنکھ تھی جہاں شدید تلاطم کی پرجوش تھرتھراہٹ تھی.. اور وہ بی بی صرف دو گرہ کپڑے میں ملبوس تھی.. ایک گرہ وہاں جہاں وہ الگ باندھ کے رکھتے ہیں جو مال اچھا ہے اور دوسری گرہ وہاں جہاں بھونچال کی دوسری آنکھ تھی.. اور یہ دونوں گرہیں اُس بیلی ڈانسر کے تھرکنے سے یوں محسوس ہوتا تھا کہ ابھی کُھلیں کہ ابھی کُھلیں.. یہ ایک قابل عبرت مقام تھا اور قابل غور بھی کہ ایک کچی عمر کا نوجوان جس نے کبھی کسی لڑکی کے ٹخنے بھی عریاں نہیں دیکھے تھے اُس کے سامنے صرف دو گرہیں تھرکتی ہیں جو کُھل کُھل جانے کو لگتی ہیں اور ایک ناف میں ایک ہیرا ہے جو بھونچال کی زد میں آیا ہوا ہے تو اُس پر کیا گزری ہوگی.. مولوی صاحب پر بھی کچھ نہ کچھ گزری ہوگی لیکن مُجھ پر جو گزری اور میرا یقین محکم ہے کہ آئندہ زندگی میں میرے اخلاق کو جو ضُعف پہنچا اُس کی ابتداء قاہرہ کی اُس شب میں ہوئی.. وہ شب نہ ہوتی تو یقیناً میں ایک پارسا ہوتا..

اور اگر میں ایک پارسا ہوتا تو یہ حیات کتنی روکھی اور پھیکی ہوتی..

ہم قاہرہ سے اڑے تو اڑتے ہی چلے گئے..

اگلا قیام روم میں تھا..

ہمیں دوپہر کے کھانے کے لیے ٹوکن ایشو کیے گئے جنہیں ہم سینے سے لگائے ایئرپورٹ کے شاندار ریستوران میں خوفزدہ بھیڑوں کی مانند داخل ہوئے.. مولوی صاحب سب سے زیادہ اگرچہ معصوم ڈری ہوئی بھیڑ تھے.. روم کے ویٹر سیاہ سُوٹوں میں ملبوس تھے اور اُن کے سروں پر قاہرہ کے ویٹروں کی مانند تُرکی ٹوپیاں نہ تھیں.. وہ مینو کارڈ جو نہایت ادب سے ہمارے سامنے رکھا گیا وہ شاید اطالوی میں تھا یا فرانسیسی میں تھا حالانکہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی.. اور وہاں جو ناآشنا زبان تھی اُس میں مُجھے کہیں ''پُولے'' کا لفظ دکھائی دے گیا اور میں جو کبھی کبھار ''شیزان کونٹی نینٹل'' کی بالائی منزل پر یورپی خوراکوں میں سے ''پُولے ڈے لا کیو'' نہایت رغبت سے کھایا کرتا تھا، جان گیا کہ یہ تو چکن ہے.. چنانچہ میں نے اُس ''پُولے'' پر انگلی رکھ کر ویٹر سے درخواست کی کہ.. بس یہی.. یہی لے آؤ..

چونکہ یہ طے ہو چکا تھا کہ مولوی صاحب نے بچے کا نہیں بلکہ بچے نے مولوی صاحب کا خیال رکھنا ہے اس لیے میں انہیں ساتھ ساتھ رکھتا تھا.. اُنہوں نے ویٹر کے ساتھ میری مختصر گفتگو کا مشاہدہ کیا اور بولے ''برخوردار کھانے کے لیے کیا منگوایا ہے؟''

انگلستان میں قدم رنجہ فرما کر اُن گورے کفار کو تبلیغ کیسے کریں گے تو از حد معصومیت اور گہرے تیقن سے بولے ''بیٹا اسلام کا نور جب اُن کے سینوں میں روشن ہوگا تو وہ میری پنجابی اور اردو سب سمجھنے لگیں گے اللہ کے فضل سے۔''

یہ وہ زمانے تھے جب مذہب کی ترویج اسی نوعیت کے معصوم جذبے کرتے تھے۔ درویش اور صوفیانہ عجز سے لوگ متاثر ہو کر اسلام کے پرامن پیغام کو صدقِ دل سے قبول کر لیتے تھے۔ مذہب کو وہ خنجر نہ بنایا گیا تھا جو ہر اختلاف کرنے والے شخص کے سینے میں بے دریغ گھونپ دیا جاتا تھا۔

آج کے فضائی مسافر یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ اُن دنوں ہوائی جہاز یوں لاہور سے اڑ کر سیدھے نیویارک یا ٹورنٹو میں نہیں جا اترتے تھے۔ وہ تو دو چار گام چلنے بلکہ اڑنے کے بعد ہانپنے لگتے تھے کہ اُن کے پیٹ میں جمع شدہ پٹرول کا ذخیرہ دو چار گام کے بعد ہی ہچکیاں لینے لگتا تھا کہ دمِ آخر آن پہنچا۔ چنانچہ کراچی سے اڑتے ہی ہمارا جہاز تہران ایئرپورٹ پر جا سرنگوں ہوا اور وہاں اُس کے پیٹ کی پٹرول سے پُوجا کی گئی۔ وہاں سے مائلِ پرواز ہوا تو ہم نصف شب کے قریب قاہرہ کے شہر کی روشنیوں کے قریب ہوتے پھر سے اترنے لگے۔ اُن دنوں جمال عبدالناصر کی ہر دل عزیزی عروج پر تھی۔ شاہ فاروق کو معزول کر کے دھیما جنرل نجیب اقتدار میں آیا اور پھر کرنل ناصر کی شعلہ بیان اور عرب قومیت کی عزت نفس نے غلبہ حاصل کر لیا۔ لکشمی مینشن کے بچہ کراوڈ میں سعادت حسن منٹو کے بعد اگر کوئی ہیرو تھا تو وہ ناصر تھا اور ہم اُسے ہمیشہ مصری لہجے میں جمال کی بجائے گمال کہتے۔ قاہرہ میں تقریباً تین گھنٹے کا پڑاؤ تھا۔ ڈچ ایئر لائن کی جانب سے ہمیں ایئرپورٹ سے باہر منتظر ایک کوچ میں سوار کیا گیا۔ اور یہ کوچ قاہرہ کی رات کے اندھیاروں میں بھٹکتی، دریائے نیل کے کسی پُل پر سے گزرتی، کسی عجیب سی مخدوشی گلی میں جا رُکی جہاں ہمارے لیے کسی ریستوران میں ڈنر کا انتظام تھا۔

وہ کوئی۔ اور نصف صدی پیشتر کے کسی قصّے کو زندہ کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ زمانے اور معاملات آپس میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں لیکن مجھے اتنا یاد ہے کہ وہ کوئی علی بابا چالیس چور نوعیت کا ریستوران نائٹ کلب تھا جس کے ویٹر سُرخ پھندنے والی تُرکی ٹوپیاں اوڑھے۔ جیبی جیبی کرتے پھرتے تھے اور نائٹ کلب میں سب سے نمایاں گمال عبدالناصر کی بلیک اینڈ وہائٹ تصویر تھی اور وہ اُن دنوں ہمارا جیبی جیبی تھا۔ میں یہ تو فراموش کر چکا ہوں کہ وہاں ہم نے کس نوعیت کی خوراک تناول فرمائی اور اُس میں مصری ذائقے کیسے تھے البتہ یہ اب تک یاد ہے کہ معصوم مولوی جی مسلسل لاحول پڑھ رہے

اترتی گئی، اتنا خستہ تھا..اُس کا ایک پارچہ منہ میں ڈالا تو اُس کے گرم ذائقے کے حظ سے میری آنکھیں بند ہونے لگیں..

مولوی جی نے پہلے تو پھول گوبھی کا اُبلا ہوا ایک ڈنٹھل مُنہ میں رکھا اور پھر خاصی تگ و دو کے بعد مٹر کے دو دانے کانٹے میں پرونے میں کامیاب ہو گئے..وہ کن انکھیوں سے مجھے ندیدوں کی مانند اُس چکن کے ساتھ انصاف کرتے دیکھتے رہے اور پھر ذرا لاپروائی سے پوچھا'' کیسا ہے؟''

''خستہ، گرم اور انکل جی..مُنہ میں گھل رہا ہے....''

اُنہوں نے کچھ لمحے تو توقف کیا جس کے بعد وہ قدرے استغراق میں چلے گئے اور پھر سر اٹھا کر کہنے لگے'' یہ مجھے حلال لگتا ہے..میرے لیے بھی یہی منگا دو..''

روم میں دوپہر تھی اور جب وہاں سے اڑے تو اڑتے ہی چلے گئے اور جب جرمنی کے شہر ڈسلڈوف میں اترے تو شام ہونے کو تھی..جہاز نے وہاں بھی اپنا پیٹ بھرا اور ہم پھر سے فضا میں اٹھ گئے..کچھ دیر تک اٹھے رہے اور پھر ہالینڈ کے شہر ایمسٹرڈیم میں لینڈ کر گئے..رائل ڈچ ایئر لائن کی سروس یہاں تمام ہوتی تھی اور لنڈن کے مسافروں کو تقریباً تین گھنٹے بعد برٹش ایئر لائن کی پرواز سے روانہ ہونا تھا..اس طویل وقفے کے دوران ہمیں کے ایل ایم کی ایک کوچ میں ایمسٹرڈیم کے شہر کی تفصیلی سیر کروائی گئی..

میری نوخیز حیات میں سب سے پہلا یورپی شہر..اور یہ تو وہی کوہ قاف تھا جس کا تذکرہ میں نے سرکلر روڈ کے فٹ پاتھ پر فروخت ہونے والے بچوں کے ناولوں میں پڑھا تھا..اور وہاں ہر سُو پریاں جلوہ افروز ہوتی تھیں اور کہیں کہیں جوجن وغیرہ تھے وہ بھی گورے چٹے صاحب لوگ تھے..میں کوچ کی کھڑکی کے شیشے کے ساتھ اپنی آنکھیں جمائے حیرت، استعجاب اور سراسیمگی کا شکار اُس نیلے سحر کی دُھند کو دیکھتا تھا جس نے اس طلسمی شہر کے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا..اس نیلی دُھند میں کیسے کیسے خواب اور سراب دکھائی دے رہے تھے، جو کچھ بھی نظر آتا وہ اس نیلی دھند میں رنگا نظر آتا تھا... چکا چوند رنگ و نور میں ڈوبی ہوئی شاہراہیں اور وہ نہریں جو اس شہر طلسم میں شریانوں کی مانند پھیلتی تھیں اُن کے پانی بھی نیلو نیل تھے یہاں تک کہ اُن کے کناروں پر ایلم کے جو گھنے شجر تھے اُن کے پتے بھی سبز نہ تھے، نیلے تھے..اور اُن کا سایہ جو نہروں کی روانی پر پڑتا تھا، وہ بھی نیلے رنگ کا تھا۔ یوں وہ

''چکن..''

''حلال ہے؟''

''پتہ نہیں انکل..''

''تو کیوں کھا رہے ہو؟''

''اس لیے کہ بھوک لگی ہے..''

''یہ پتہ نہیں کہ حلال ہے؟''

''نہیں انکل..''

''تو پھر کیوں کھا رہے ہو؟''

''اس لیے کہ بھوک لگی ہے..''

یہاں میں ایک وضاحت پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں..اُن زمانوں میں..جو یقیناً جاہلیت کے زمانے تھے، کھانے کے حوالے سے اتنی تفتیش نہیں کی جاتی تھی.. انگلستان کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ہوسٹلوں میں جو خوراک میسر تھی سوائے سؤر کے گوشت کے وہ سب کُچھ کوئی بھی سوال کیے بے دریغ کھا لیا جاتا تھا.. یہ شرعی بکھیڑے بہت بعد میں وجود میں آئے..اور جب وجود میں آئے تو ہم تھوڑے بہت پچھتائے لیکن اب کیا ہو سکتا تھا جب چڑیاں کھیت چُگ چکی تھیں..

مولوی جی لمحہ بھر کے استغراق میں گُم ہوئے اور پھر کہنے لگے ''برخوردار..ویٹر سے کہو میرے لیے کُچھ سبزیاں لے آئے لیکن وہ تلی ہوئی نہ ہوں..اُبلی ہوئی ہوں..''

ایک مناسب مدت کے بعد ویٹر ایک ٹرالی دھکیلتا ہوا کچن میں سے برآمد ہوا..ٹرالی کے اوپر ایک سِلور ٹرے میں خزاں رنگوں کا بھورا ہوتا مکمل چکن سُلگتا تھا جس پر مختلف نوعیّتوں کے گھنے شوربے انڈیلے ہوئے اُس کی اشتہا کی دھومیں مچاتے تھے..اس گرم بھاپ چھوڑتے چکن کے گرد سلاد اور تلے ہوئے آلوؤں کی زیبائش تھی..ویٹر نے وہ سِلور ٹرے اٹھا کر میرے آگے سجا دی اور پھر ذرا جُھک کر ٹرالی کے نچلے خانے میں سے ایک مختصر پلیٹ برآمد کی جس میں ایک پھول گوبھی کے کُچھ حصے بخرے تھے، آدھی گاجر پژمردہ حالت میں پڑی تھی اور مٹروں کے چند دانے ڈولتے پھرتے تھے..ویٹر نے یہ پلیٹ مولوی جی کے آگے رکھ دی..

میں نے اُس خزاں رنگت حدّت بھرے چکن پر چھری رکھی تو وہ خود بخود اُس کے گوشت میں

''مُونا ہالینڈ...ایک پن چکّی..تو یہ ہالینڈ ہے''

اس ڈچ دعوت ہیگ کی پیشکش کی ابتداء نیویارک میں ہی ہوگئی تھی جن دنوں میں اور میمونہ کبھی کارنیل یونیورسٹی میں سُمیر کی گریجوایشن تقریب میں شامل ہوکر اُس پر فخر کرتے سٹیڈیم کے ہجوم میں کھڑے ہوکر اُسے ہاتھ ہلاتے تھے کہ وہ ہزاروں سیاہ گاؤن اور مزاحیہ ٹوپیاں اوڑھنے والے ڈگری ہولڈرز میں سے اپنی دراز قامتی کے باعث ممتاز نظر آتا تھا..اور کبھی قرۃ العین کی ریذیڈنسی مکمل ہونے پر سٹونی بُرک ہسپتال نیویارک کی جانب سے منعقدہ تقریب میں شامل ہوتے اور مزید پُرفخر ہوتے کہ اُس نے اس تین برس کی مشقت کے دوران جب کہ میمونہ نے اُس کے بیٹے نوفل کی دیکھ بھال کی تھی.. ٹاپ پوزیشن حاصل کی تھی..لیکن میرے لیے سُمیر اور عینی کی گریجوایشن سے بڑھ کر سب سے زیادہ فخر کا وہ لمحہ تھا جب میری پوتی مشال کی نیویارک کے ایک سکول میں پہلی جماعت کی گریجوایشن منعقد ہوئی اور وہ اپنے گلے میں ایک تمغہ آویزاں کیے میرے ساتھ چلی آتی تھی جب اپنے فلیٹ کے باہر سیڑھیوں پر بیٹھے ایک موٹے امریکی نے اُسے مخاطب ہوکر کہا''ہے لیڈی..تم نے ایک میڈل جیت لیا ہے..میری جانب سے مبارکباد'' اور مشال نے فوراً اپنا میڈل اٹھا کر اُس امریکی کو دکھایا اور وہ باقاعدہ اُس پر لٹو ہوگیا اور کہنے لگا''لیڈی..یُو آر بیوٹی فُل..''

تو یہ وہی دن تھے جب یو این او میں پاکستان کی نمائندگی کرنے والے میرے بیٹے سلجوق نے مجھے بتایا کہ''ابا..کیا آپ پاکستان ڈچ فورم نیدرلینڈ کی دعوت پر ہالینڈ تشریف لے جاسکتے ہیں، اُنہوں نے آپ کو پاکستان میں نہ پا کر مجھ سے رابطہ کیا ہے..میرے سینئر کولیگ ہالینڈ میں پاکستانی سفیر اعزاز احمد چوہدری نے بھی اس سلسلے میں مجھے فون کیا ہے..''

کیا ہم ہالینڈ تشریف لے جاسکتے ہیں؟..ہماری تشریف تو ایک عرصے سے بیکار پڑی تھی تو کیوں نہیں..ذرا امریکہ سے واپس پاکستان پہنچ کر اپنے لاہور میں کُچھ سانس لے لیں پھر اس تشریف کو

سایہ نیلے پانیوں میں گھلتا اُنہیں گہرے نیلگوں سمندروں کی نیم سیاہی عطا کرتا تھا.. میں نیل کرائیاں نیلکاں تے میرا تن من نیلو نیل..

بے شک یہ میری نوخیزی کی حدّت کے کرشمے تھے..حقیقت نہ تھے پر وہ شہر..میرا پہلا یورپی شہر مجھے تب ایسا ہی دکھائی دیا تھا اور میں اس کے بیان میں کچھ مبالغہ نہیں کر رہا، وہ مجھے واقعی نیلی دُھند میں ڈوبا ایک جادوئی شہر نظر آیا تھا..میری آنکھوں میں ایک عرصہ اُس کی نیلاہٹ نقش رہی، میری رگوں میں دوڑتے خون میں بھی ایمسٹرڈیم کی اُس پہلی ملاقات کے نیلے رنگ آمیزش میں رہے اور جب انگلستان میں قیام کے دوران میں اپنا رُک سیک اور خیمہ کاندھے پر بوجھ کیے دوبارہ اس شہر میں آیا تو آنکھوں میں نقش نیلاہٹ زائل ہونے لگی، رگوں میں دوڑتے نیلے رنگ بھی کافور ہوئے کہ بے شک ایمسٹرڈیم اب بھی ایک پرکشش اور ہنگامہ خیز شہر تھا لیکن نیلا نہ تھا، بلیک اینڈ وہائٹ تھا..جیسے پہلی محبت کا بخار آمیز ہیجان.. پہلے بوسے کی دیوانگی گیلاہٹ، پہلے بچے کی پیدائش کی خبر..پہلی بار شاہ گوری کا دیدار..پہلی بار وینس ڈی میلو کے مجسمے پر یُوں نظر کرنا کہ وہ اپنے تمام تر بدنی تناسب کی حدّت میں آپ کے بدن کو بھی زرد کرتی ہو.. یا پہلی بار حجرِ اسود کو چُومنا.. یہ سب بدن کو ہیجان میں لے جانے والی کیفیتیں بس پہلی بار ہی نیلاہٹ میں رنگی ہوتی ہیں اور پھر دوسری بار..بلیک اینڈ وہائٹ ہو جاتی ہیں..

ایمسٹرڈیم سے آخری ملاقات اردو محاورے کے بقول 1969ء میں ٹھہری تھی جس کا تفصیلی تذکرہ ''نکلے تری تلاش میں'' کے ابواب ''پھولوں کے دیس میں''، ''ایک خوبصورت نظم..ایمسٹرڈیم'' اور ''نہریں اور زرد کلیاں'' میں رقم ہو چکا..

تو میں اتنی طویل چالیس برس کی جدائی کے بعد پھر سے ہالینڈ سے ملاقات کے لیے چلا آیا تھا بلکہ بلایا گیا تھا..

تاریکی میں گم ایک ہموار کھیت کے درمیان میں ایک پن چکّی کا ہیولیٰ نظر آیا اور گزر گیا..تو میں واقعی پھر سے ہالینڈ میں تھا..

♦♦.....♦♦.....♦♦

''میں اُس ٹرکش ایئر لائن کا ایک مسافر تھا جو ایمسٹرڈیم ایئر پورٹ پر لینڈ کرنے کے لیے اپنی بلندی کم کرتی ہوئی نیچے آ رہی تھی جب وہ نزدیکی کھیتوں میں کریش کر گئی.. کچھ مسافر ہلاک ہو گئے اور ہم میں سے بیشتر جب دھماکے کے بعد اپنے حواس میں آئے تو زخمی ہو چکے تھے، میرے چہرے پر خون کی آبشاریں اترتی تھیں.. کریش کے دھچکے سے میرے بدن کے اندر جانے کیا ٹوٹ پھوٹ ہوئی تھی کہ صحت مند ہونے کے بعد میرے کانوں میں عجیب سی آوازیں آنے لگیں جیسے کسی ناقص مشینری کی گراریاں اٹک اٹک کر گھومتی ہیں اور یہ دن رات کی اذیت سہی نہ جاتی تھی.. میں اب بھی باقاعدگی سے ایک نفسیات دان کے پاس جاتا ہوں جو حادثوں اور ذہنی صدموں کے شکار مریضوں کی راہنمائی کرتا ہے.. اس حادثے کی شدت سے میرا دماغ بھی متاثر ہوا اور کبھی کبھار اس مسلسل اذیت سے نجات حاصل کرنے کے لیے میں خودکشی کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگتا ہوں... وہ مسافر جو اس حادثے میں متاثر ہوئے ایک مدت سے یہ کوشش کر رہے ہیں، اُنہیں ایئر لائن یا حکومت کی جانب سے کم از کم اتنا ہرجانہ تو ادا کیا جائے کہ وہ اس اذیت ناک صورتِ حال کا مالی آسودگی سے مقابلہ کر سکیں لیکن عدالت ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر پائی.. اور میں اکثر خودکشی کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں..''

میمونہ نہایت تفصیل سے اُس کے کانوں میں ہمہ وقت برپا اذیت ناک شور کے بارے میں مختلف سوال کرتی رہی کہ وہ بھی تو اسی عذاب میں مبتلا تھی، اُن دونوں کا دُکھ سانجھا تھا.. اُس کے کانوں میں بھی اسی طور پن چکیاں سی چلتی رہتی تھیں، ایک ناگوار شور کی گونج مسلسل تھی.. ظاہر ہے اس آزار کو کم کرنے کی خاطر ہم نے دنیا جہان کے خصوصی معالجوں اور نفسیات دانوں سے مشورے کیے اور آخری فیصلہ یہی تھا کہ بی بی اب آپ کو اس اذیت کے ساتھ سمجھوتہ کرنا پڑے گا.. میمونہ آسانی سے حوصلہ ہارنے والوں میں سے نہیں ہے، ایک باہمت عورت ہے اور وہ اس بیماری میں بھی مجھے موردِ الزام ٹھہرانے کا کوئی نہ کوئی بہانہ پیش کر دیتی.. ایک بار وہ درویش صفت شخص حکیم محمد سعید میری والدہ کی بیماری کے دوران انہیں دیکھنے میرے گھر آئے تو میمونہ نے بھی اپنا مسئلہ پیش کر دیا.. اُن کی بنیادی تشخیص بھی یہی تھی کہ بیگم صاحبہ آپ کے کانوں کے پردوں کا وہ پانی سُوکھ چکا ہے جو بدن کا توازن قائم رکھتا ہے.. اس پر میمونہ کہنے لگی، حکیم صاحب یہ سب مستنصر کا کیا دھرا ہے.. انہوں نے مجھے اپنے اتنے سفرنامے اور ناول زبردستی سنائے ہیں کہ میرے کانوں کا پانی سُوکھ گیا ہے.. میں تو نہ ہوا لیکن حکیم سعید صاحب میمونہ کی اس حسِ مزاح سے بے حد محظوظ ہوئے..

ہالینڈ لے جائیں گے..کیوں نہیں..

پاکستان واپسی پر اس دعوت کے درمیان متعدد رکاوٹیں حائل ہونے لگیں اور ان میں سب سے بڑی رکاوٹ میری ازلی سُستی اور کاہلی تھی..میں ایک ایسے کیکڑے کی مانند تھا جو کسی سمندری چٹان کے ایک شگاف میں پوشیدہ راہب ہو چکا تھا..مجھے اس شگاف سے باہر نکالنے کے لیے تھوڑی بہت زبردستی درکار تھی اور یہ پاک ڈچ فورم کے کوئی اعجاز سیفی تھے جو مجھ سے زبردستی کرتے مسلسل فون کرتے رہے..ویسے تو بہانہ ساز عاشق ہمیشہ سے کہتے چلے آئے ہیں کہ ہم عشق تو کرتے پر ہمیں کام بہت تھے..اور ہمیں کام بھی کُچھ نہ تھے پھر بھی بہانہ کرتے رہے..لیکن سیفی صاحب کے مسلسل فونوں کے باعث، میرے کام کُچھ نہ آیا یہ کمالِ بہانہ سازی..

اور بالآخر..

شاہراہ کے دائیں جانب..تاریکی میں گُم ایک ہموار کھیت کے درمیان میں ایک پن چکّی کا ہیولیٰ نظر آیا اور گزر گیا تو میں نے میمونہ کو کچوکا دے کر کہا ''مُونا ہالینڈ..'' تو میمونہ نے اپنی روایتی بے رُخی سے کہا ''میں لاہور سے ایمسٹرڈیم کے سفر کی تھکاوٹ میں ہوں تو مجھے اونگھنے دو۔''

''لیکن مُونا..ہالینڈ۔''

''تم حسب عادت حماقت کی باتیں کرتے ہو..کہ مُونا ہالینڈ..ہم نے ہالینڈ میں نہیں تو کیا ٹمبکٹو میں ہونا ہے..میں جانتی ہوں کہ ہم ہالینڈ میں ہیں۔''

''دیکھو بیگم..آپ یورپ کے کسی بھی ملک میں چلی جاؤ تو اُس کے زمینی مناظر سے اندازہ نہیں لگا سکتے کہ آپ کہاں ہیں..لیکن جب آپ ایک پن چکّی دیکھتے ہیں تو فوراً جان جاتے ہیں کہ یہ ملک ہالینڈ ہے..''

''اور تم ہمیشہ سے ہی سروانتے کے وہ ڈان کے خوتے رہے ہو جو خوابوں اور خیالوں کی پن چکیوں پر اپنے قلم کا نیزہ تانے حملہ آور ہوتے رہے ہو..تو مجھے اونگھنے دو۔''

شاہد ایک نپا تلا اور دھیمے مزاج کا شخص تھا، ہالینڈ میں رہنے والے بیشتر پاکستانیوں کی مانند ایک مدت سے یہاں مقیم تھا۔گفتگو کے دوران اس نے اپنی داستانِ حیات کے کُچھ ورق پلٹے..اور تب میں نے جانا کہ اُس کے بدن میں جو ایک میکانکی کیفیت ہے اُس کا ماخذ کیا تھا..

''ہیگ کی شب، اُس شب میں نے مینڈرلے کو خواب میں دیکھا''

ہالینڈ میں اہلِ ہیگ کے علاوہ کوئی بھی ڈچ اس شہر کو اُلفت سے اپناتا نہیں بلکہ مثل مشہور ہے کہ شہر تو ایمسٹرڈیم ہے جب کہ ہیگ ایک قصبہ ہے جو ذرا سا پھیل گیا ہے اس لیے کہ ایک شہر ہونے کی شرط یہ ٹھہرتی ہے کہ وہ پُر ہجوم اور پُر شور ہو.. ٹریفک ایسی ہو کہ کاروں کے بمپر سے بمپر چھلتے ہوں جیسے کھوے سے کھوا چھلتا ہے، کچھ بدمعاشی اور طوائف الملو کی ہو یعنی ملکی طوائفیں کثرت میں ہوں اور اُس کی شبوں میں کوئی بھی سوتا نہ ہو.. اور جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے اور یہاں پنجابی والا ''کھوتا'' مُراد ہے.. ہیگ غریب کا قصور یہی ہے کہ وہ خاموش اور خوابیدہ سا ہے.. اُس کا قدیم نزاکت بھرا حُسن ایک خواب کی مانند حقیقی نہیں لگتا اور وہ اپنے اِس حُسن کا ایمسٹرڈیم کی مانند چرچا نہیں کرتا، چُپ رہتا ہے..

تو جب ہم ہیگ کی پُر وقار خاموش اور دل کش خوابیدگی میں داخل ہو رہے تھے تو اتر چکی شام جورات میں ڈھلنے کو تھی اُس کے پہلو بہ پہلو موسم سرما کے اوائل کی سرد دُھند بھی اترتی تھی اور اُس دُھند کے سفید ذروں میں سے قدیم کلاسیکی کھمبوں پر ٹھٹھرتی روشنیوں میں سے ایک کار ظاہر ہو رہی تھی جس کی ہیڈ لائٹس اُس دُھند کے پار دیکھنے کی تگ و دو میں مدھم ہوتی جاتی تھی اور وہ کار جس کی پچھلی نشست پر مرجھا چکی حیات کا ایک شخص ہے اور اُس کے برابر میں ایک ایسی خاتون ہے جس کے کانوں کے پردوں کا پانی اُس کے زبردستی سنائے ہوئے سفرناموں اور ناولوں کی وجہ سے خشک ہو چکا ہے، کسی پرنس اورنج کے دُھند میں ڈوبے مجسّمے کے یادگار چوک ''پلین 1813'' میں ایک ایسے آہنی سیاہ پھاٹک کے سامنے رک رہی ہے جس کے پس منظر میں ایک سفید در و دیوار کی کولونیل طرز تعمیر کی شاہانہ رہائش گاہ کی قدامت اُس سفید دُھند میں ظاہر ہو رہی ہے۔

میمونہ نے شاہد سے کچھ ایسی دوائیوں کا تذکرہ کیا جو اس کے کانوں میں خراشیں ڈالنے والے شور کو کم کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں.. میں اس دوران لب بستہ رہا کہ ان دونوں کے آزار مشترک تھے..

یورپ میں کار پر سفر کرتے ہوئے آپ ایک ایسے سرکس میں چلے جاتے ہیں جہاں شاہراہوں کے بے انت بکھیڑے اور تانے بانے ہیں، سُرنگیں اور طویل پُل گزرتے جاتے ہیں.. سڑک کے فیتے ایک دوسرے کو کاٹتے ابھرتے چلے جاتے ہیں.. ہزاروں کی تعداد میں کاریں، ٹرک، ٹریلر، کوچز کبھی تو لال بیگوں کی مانند رینگنے لگتے ہیں اور کبھی رفتار پکڑ کر اتنی تیزی سے گزرتے ہیں کہ آپ کی آنکھوں پر اپنا نقش نہیں خراشیں چھوڑتے چلے جاتے ہیں.. اگر شام اتر رہی ہو جیسا کہ ہیگ کی جانب سفر کرتے اتر چکی تھی تو ہزاروں ہیڈ لائٹس آپ کی جانب بھیڑیوں اور لگڑ بگڑوں کی بے انت لشکتی روشن آنکھوں کی مانند غول کے غول چلی آتی ہیں اور آپ کے دل میں ہول بھرتی ہیں.. گمان بھی نہیں ہوتا یہاں آس پاس کوئی بستی کوئی شہر بھی ہو سکتا ہے اور پھر آپ کسی ذیلی راستے پر مڑتے ہیں تو کچھ دیر بعد آپ کو انسانی رہائش کے آثار نظر آنے لگتے ہیں.. تو یوں ہم شاہراہ سے جدا ہوئے اور ایک مختصر سفر کے بعد ہیگ کی متانت اور خاموشی میں داخل ہو گئے..

♦♦.....♦♦.....♦♦

کہ یہاں کس مقصد کے لیے آئے ہیں.. بلکہ میمونہ نے بے زار ہو کر کہا تھا کہ ان سے درخواست کریں کہ ہمیں کسی عام کمرے میں شفٹ کر دیں جہاں میں بیڈ سے اٹھوں تو واش رُوم چلی جاؤں.. یہاں تو بڑا پینڈا کرنا پڑتا ہے..

اور اس رہائش گاہ کے پچھواڑے میں ایک خزاں رسیدہ باغ تھا جس کے درختوں کے ہاتھ خالی ہو رہے تھے.. زرد پتے خشک ٹہنیوں کے ساتھ گندھارا کے قدیم زیوروں کی مانند جھمکے بالے لٹک رہے تھے..

اور وہاں اعجاز سیفی بھی ہمارے لیے منتظر تھا جس کی منظم کارستانیوں کی وجہ سے ہم آج کی شب ہالینڈ میں بسر کرنے کو تھے.. ابتدائی ملاقاتوں میں تو میں نے اُسے کسی حد تک جذبات سے عاری ایک سرد مزاج لیکن ڈسپلن کا پابند شخص پایا.. اُس کے چہرے پر میرے لیے سوائے ایک غیر جانبدار مسکراہٹ کے اور کچھ نہ تھا، ازاں بعد جب اُس کی شخصیت پر جو برف منجمد تھی وہ دھیرے دھیرے پگھلی تو اندر سے نہایت جذباتی، دُکھی اور انقلاب کے خواب مسمار ہونے پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ایک شخص نظر آنے لگا۔ پیپلز پارٹی کا اوریجنل جیالا دانشور جس نے ضیائی دور کی تاریک رات میں مصطفےٰ کھر کو اپنے ہاں پناہ دی تھی، وطن واپسی پر جب ماڈل ٹاؤن پارک میں مصطفےٰ کھر سے آمنا سامنا ہوا.. اور وہاں کھر صاحب پر مجال ہے اور جتنے برس کے وہ تھے بس کم و بیش اتنی ہی شادیاں اُنہوں نے کی تھیں، مجال ہے عُمر کسی طور پر اثر انداز ہوئی ہو.. بدن چھریرا اور کمر تیر کی مانند سیدھی، چال میں ایک غزال ایسی لچک.. جانے یہ یوگا، سادہ خوراک یا کثرت ازدواج کے معجزے تھے یا کیا تھے.. تو میں نے کھر صاحب سے کہا کہ ہالینڈ میں ایک شخص اعجاز سیفی نام کا ملا تھا، آپ کو سلام کہتا تھا.. توقع تھی کہ اُن کے چہرے پر حیرت ہو گی کہ کون سیفی.. لیکن اُنہوں نے خصوصی طور پر نہایت اُلفت سے اُس کا سلام قبول کر کے اُسے یاد کیا..

ہمارے کمرے سے منسلک کھسک جانے والی چوبی دیوار کے پار ایک سورج کا کمرہ یعنی سن روم واقع تھا جس کی شیشہ کھڑکیاں اُس خزاں رسیدہ باغ پر کھلتی تھیں اور سورج کی پہلی کرنیں اس کمرے میں داخل ہو کر اس میں سجے آرائشی گل بوٹوں، تصویروں اور قدیم فرنیچر کو منور کرتی تھیں.. ایک زرد روشنی کا چراغ ہوتی تھیں.. ان میں سے ایک چاندی رنگ کے پتوں والا گھنا پودا ایسا تھا کہ اُس کے ایک پتے کو انگلیوں میں مسلنے سے ایسی سحر انگیز خوشبو پھوٹتی تھی جسے شاید فرانس کے عطر کشید کرنے والے بھی آج تک دریافت نہیں کر سکے.. وطن واپسی پر ناجیہ نے اُس کی کچھ شاخیں ہمیں عنایت کر دیں

آہنی پھاٹک کہیں کسی ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبانے سے ایک بے بسی کی کیفیت میں نہ چاہتے ہوئے بھی ہولے ہولے وا ہونے لگا..اتنی آہستگی سے جیسے وہ حقیقت میں نہیں کسی خواب میں کھلتا ہو..اور یہ پھاٹک یوں دھیرے دھیرے پہلے بھی کہیں کُھلا تھا..الفرڈ ہچ کاک کی فلم ''ربیکا'' کے آغاز میں یہ مدھم خوابناک حرکت میں یونہی وا ہوتا گیا تھا'' پچھلی شب میں نے مینڈرلے کو خواب میں دیکھا'' اور پھاٹک کے پس منظر میں مینڈرلے کا شاہانہ گھر ظاہر ہو رہا تھا..

یہ مینڈرلے سفیر پاکستان کی سرکاری رہائش گاہ تھا..

اعزاز اور ناجیہ پورچ میں جانے کب سے کھڑے ہمارے منتظر تھے..

اعزاز کو دیکھ کر پہلے تو میں اس شک شبے میں مبتلا ہوا کہ غالباً وہ سفیر صاحب کا بیٹا ہے کہ وہ بظاہر اتنا چست بدن اور نوخیز دِکھتا شخص تھا کہ اگر اُسے گورنمنٹ کالج کا سرخ بلیزر پہنا دیا جاتا تو وہ بی۔اے کا تو نہیں ایم۔اے کے آخری سال کا طالب علم لگتا..اور اُس کی اہلیہ بھی لاہور کے نیشنل کالج آف آرٹس کی کوئی پُرکشش طالبہ لگ رہی تھیں..اُسے صرف ایک ہی پرابلم تھی کہ مسکراہٹ نام کی جو شے ہوتی ہے وہ اُس کے قابو میں نہیں آتی تھی..

مناسب استقبالی اور روایتی خوش آمدیدی کلمات کی خوش گواریت کے بعد ہمیں اُس رہائشی علاقے میں پہنچا دیا گیا جو ہمارے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا..علاقہ اس لیے کہ وہ محض ایک کمرہ یا بیڈروم نہ تھا..دروازے شاید آبنوسی چھتوں تک پہنچتے ہوئے جیسے جنات کے آنے جانے کے لیے اتنے بلند درجات پر فائز ہوں..اور چھتیں اتنی اونچائی پر کہ اُن تک نظر جاتے جاتے راستے میں دم توڑ جائے....ملحقہ ایک سُورج کمرہ یعنی سَن روم..ایک فالتو بیڈروم..ایک واش رُوم اتنا وسیع کہ اُس میں نہاتے ہوئے انسان یہ محسوس کرے کہ شاید وہ کُھلے عام مرتکب ہو رہا ہے..اور بستر بھی اتنے رقبے میں کہ اگر ہم جوان ہوتے تو سخت دل گرفتہ ہوتے کہ قربت کے لیے اتنا فاصلہ طے کرنا ہوگا لیکن اس عُمر میں نہایت خوش آمدید کہ..راتوں میں خراٹوں کی ہم آہنگی کے سوا اور کوئی عائلی قربت نہ تھی..

تو یہاں بھی ہم اکثر گُم ہو جاتے..

گمشدگی کا یہ لطف پہلی بار ماسکو میں نصیب ہوا تھا جب ہمارے میزبانوں نے ہمیں ایک بے شمار ستاروں والے ہوٹل کی چوٹی پر واقع ایک پریذیڈنشل سویٹ میں ٹھہرا دیا تھا جہاں ہم نہ صرف اکثر گم ہو جاتے بلکہ چل چل کر تھک جاتے..تین میں سے کسی ایک غسل خانے میں پہنچتے پہنچتے یاد نہ رہتا

ہے..لونگ آئی لینڈ میں عینی کے فلیٹ کے باہر ایک بالکونی پر بیٹھ کر میں یہ دھواں اڑاتا تھا اور سبزہ زار میں اپنے محبوب کُتا جات کو سیر کرواتی ہوئی خواتین ذرا کترا کر نکل جاتی تھیں کہ کہیں اُن کے ڈارلنگ کُتے کے پھیپھڑوں کو میرے سگرٹ کے دھویں سے سرطان لاحق نہ ہو جائے..البتہ نیویارک میں سلجوق کے فلیٹ میں نہ تو کوئی بالکونی تھی اور نہ ہی کوئی اوپن ایئر سموکنگ ایریا..کھڑکیاں بھی سب کی سب مقفل اور جامد تھیں کہ اُنہیں کھول کر مُنہ باہر نکال کر ایک ہی کش لگا لیا جائے تو میں نکوٹین کے زہر کو اپنے اندر اتارنے کی خاطر فلیٹ سے نکل کر..لفٹ میں سوار ہو کر اَن گنت منزلیں نیچے آتا..دربان سے نظریں چُراتا باہر کُھلی فضا میں آ کر ایک پائیں باغ میں چلا جاتا..چونکہ میں لابی میں ہر ایک دو گھنٹوں کے بعد لفٹ سے برآمد ہوتا چلا جاتا تھا تو میں نے ایک روز متجسس وہاں پر تعینات گورے دربان سے معذرت کرتے ہوئے کہا ''دراصل میں جو اتنا آتا جاتا رہتا ہوں تو ایک سگریٹ پینے کے لیے اتنی بلندی سے اترتا ہوں'' تو اُس نانجار نے کہا ''میرا باپ بھی تمہاری طرح سگرٹ پیتا تھا..ناشتے سے پہلے ایک پیکٹ پھونک ڈالتا تھا اور وہ بہت بری اور اذیت ناک موت مرا..شاید تمہارا انجام بھی یہی ہو لیکن میں امید کرتا ہوں کہ..''

جب میں نے قدرے خفت آمیز لہجے میں یہ کہا کہ میں سگرٹ پینے کے جُرم کا ارتکاب کرتا ہوں تو ناجیہ نے کہا..''ہاں کیوں نہیں..میں آپ کی تحریروں کے ناتے سے آگاہ ہوں کہ آپ سگرٹ پیتے ہیں اسی لیے آپ کو اس گھر کے ایک ایسے حصے میں مہمان کیا گیا ہے جس کے پچھواڑے میں باغ ہے اور آپ اپنے بیڈروم میں بھی سگرٹ نوشی کر سکتے ہیں، ہمیں کچھ اعتراض نہیں۔''

ویسے میرے لیے اعزاز کی سفارتی مہربانیاں اپنی جگہ اور ناجیہ کی میری تحریروں سے لگاؤ میں بھی کچھ کلام نہیں لیکن ہماری توقیر میں کچھ حصّہ سلجوق کا بھی تھا..ایک جونیئر سفارت کار کی حیثیت سے اُس نے فارن آفس کے انڈین ڈیسک پر اعزاز کی ماتحتی میں اپنے فرائض سرانجام دیئے تھے اور وہ سلجوق کی شرافت اور قابلیت کا از حد مداح تھا..تب ہمارے قیام کو کچھ شب و روز گزر چکے تھے تو شام کے کھانے کے دوران جب ہم نے اس شاندار رہائش گاہ کے قدامت بھرے حُسن کو ایک مرتبہ پھر سراہا اور اس کی پُر وقار شانداری کی توصیف کی تو ناجیہ نے کہا ''انشاء اللہ سلجوق بھی کبھی نہ کبھی سفیر کے طور پر اس رہائش گاہ میں قیام پذیر ہوگا'' اور اُس نے صرف ہمیں خوش کرنے کے لیے یہ نہ کہا، صدقِ دل سے یہ خواہش کی تو ہم دونوں اگر اس خاتون پر مر نہ مٹتے تو اور کیا کرتے کہ عمر کی آخری منزلوں میں سب سے

جنہیں ہم نے ایک گلدان میں سجا کر اُن کی پرورش کرنے کی ناکام کوشش کی..وہ شاخیں پاکستان کے موسموں سے مفاہمت نہ کر سکیں، محض سات آٹھ روز اُن کی ہریاول قائم رہی اور پھر وہ ہمیشہ کے لیے مرجھا گئیں..

سورج کے اسی کمرے میں ڈائننگ ٹیبل تھی جس کے گرد مری کا باسی گورا چٹا دراز قد جمیل ہماری مدارات کی خاطر طواف کرتا رہتا..ناجیہ کا کہنا تھا کہ ہالینڈ میں آ کر وہ اتنا بدل چکا ہے کہ شاید اُس کی ماں جی کو بھی یقین نہ آئے کہ یہ میرا جمیل ہے..وہ مؤدب ہو کر ہمارے گرد جھکا جھکا پھیرے لگاتا رہتا..ناشتے یا ڈنر وغیرہ کے دوران ذہن میں کوئی بھی خواہش جنم لیتی تو وہ فوراً آگے ہو کر کہتا..آپ کو کارن فلیکس چاہیے..شاید آپ سلاد چاہتے ہیں..فرائی انڈہ شاید ٹھنڈا ہو گیا ہے، آپ اسے چھوڑ دیں۔ میں ابھی ایک اور انڈہ فرائی کر کے لاتا ہوں..یہ کریلے..ٹینڈے..بھنڈیاں اور چکن..میں نے بنائے ہیں، ایک لقمہ تو لیجیے..ہم اُس کی تیار کردہ ڈشوں کا ایک ایک لقمہ لیتے اپنا وزن اور بلڈ پریشر بڑھا بیٹھے..جمیل ایک سِنگ سانگ لہجے میں بات کرتا تھا جیسے اٹک اٹک کر کوئی گانا گا رہا ہو..اور جب تک آپ اُس کے سُر سے ہم آہنگ نہ ہوں، آپ اُس کی بات کو مکمل طور پر سمجھ نہیں سکتے تھے..کبھی مجھے شائبہ ہوتا کہ وہ راگ درباری میں کریلے کریلے الاپ رہا ہے اور کبھی گمان ہوتا کہ وہ مالکونس میں قیمہ مٹر..قیمہ مٹر کی تانیں لگا رہا ہے..

ناجیہ کے بارے میں بھی انکشاف ہوا کہ نہ صرف اُس کی مسکراہٹ اُس کے قابو میں نہیں آتی بلکہ اُس کی مصوّرانہ صلاحیتیں بھی اُس کی ہنرمندی کی گواہ تھیں..اُس کی پینٹ کردہ سٹل لائف، لینڈ سکیپس اور تجریدی چہروں کی تصویریں اس شاہانہ گھر کی دیواروں پر سجی اُن کی زینت بڑھاتی تھیں..ناجیہ البتہ ایک ذہنی فتور میں بھی مبتلا تھی..اُس کے سرہانے میری کتابیں دھری رہتی تھیں، اس فتور کے سوا اُس کی دانش پر کوئی اور داغ نہ تھا..

وہ جو اولین شب تھی اور ابھی راہ و رسم بڑھی نہ تھی تو میں نے قدرے خفت آمیز لہجے میں کہا کہ میں..سگریٹ کے جُرم کا ارتکاب کرتا ہوں..

کارنیل میں سُمیر نے اپنے گھر سے باہر میرے لیے ایک سموکنگ ایریا مخصوص کر دیا تھا جہاں اکثر گھنے جنگل میں سے کچھ ہرن جنہیں میرا پوتا یاشار ''بامی'' کے نام سے پکارتا تھا نمودار ہو جاتے تھے اور وہ آ ہو اپنی چشم کو حیرت سے وا کرتے تھے کہ اس بوڑھے شخص میں سے دھواں سا کہاں سے اٹھتا

''ملکہ جولیانا، ناجیہ اور اعزاز''

اُس شب..

ہالینڈ میں جو پہلی شب تھی..

تب میں نے ''ربیکا'' کے مینشن مینڈرلے کو خواب میں نہ دیکھا کہ میں ایک مینڈرلے کے شاہی کمرے میں ہی تو محوِ خواب تھا..

اگر اُس شب کوئی خواب دیکھتا تو وہ نیلاہٹ میں رنگا ہوا نیلونیل نظر آتا..

اور نیلا رنگ بہت خطرناک ہوتا ہے..

صادقین نے ''نکلے تری تلاش میں'' کا سرورق بناتے ہوئے جتنے بھی رنگین مارکر تھے وہ سب کینوس پر صرف کر دیئے لیکن نیلے رنگ کا جو مارکر تھا، وہ جُوں کا تُوں پڑا رہا..صادقین کی توجہ کا مستحق نہ ہوا تو میں نے اُن سے فرمائش کی کہ یہ بھی آپ کی توجہ کا طالب ہے، آپ اس سے کیوں اجتناب کر رہے ہیں تو اُس ٹیڑھی انگلیوں والے مصوّر نے کہا ''تارڑ صاحب..آپ کبھی غور فرمایئے کہ خالق کائنات بھی نیلے رنگ سے کسی قدر اجتناب کرتا ہے، کم کم برتتا ہے کہ اسے لگانا اور مہکانا کوئی آسان کام نہیں..'' اور جب میں نے صادقین کے بیان کی روشنی میں خالق کی دنیا جو میرے آس پاس تھی، اُسے ایک خاص نظر سے دیکھا تو واقعی وہاں نیلا رنگ کم کم تھا..فصلوں میں، پھولوں، پتّوں اور بُوٹوں میں، چٹانوں میں کم کم تھا، البتہ کُچھ آنکھوں میں تھا اور اُن میں میرے ابّا جی کی نیلی آنکھیں بھی تھیں..

اگر اُس شب کوئی خواب دیکھتا تو نیلاہٹ میں ڈوبا دیکھتا..

کھڑکیوں کو مکمل طور پر پوشیدہ کیے دبیز پردوں پر نیم سیاہی ابھی تک راج کرتی تھی..وہاں ہلکی روشنی کی کوئی دلیل نہ تھی جو خبر کرتی کہ باہر سویر ہو چکی ہے لیکن سائیڈ ٹیبل پر جو کلاک تھا اُس کا چھوٹا

بڑی اور پر اثر خوشی صرف آپ کی اولاد کے روشن مستقبل سے وابستہ ہوتی ہے.. یا پھر اُس اولاد کی اولاد یعنی پوتوں، پوتیوں اور نواسوں سے کشید ہوتی ہے..تو ناجیہ ہمیں اس بیان سے کیسے تصوراتی خوابوں میں لے گئی تو کبھی اسی شاہانہ رہائش گاہ میں مشال اور ابراہیم ادھم مچاتے پھرتے ہوں گے..رابعہ اسی ڈائننگ روم میں مہمانوں کا استقبال کر رہی ہوگی اور سلجوق اپنی عینک تلاش کرتا پھرتا ہوگا..اور ظاہر ہے..

ہم نہ ہوں گے..

اور اس کا بھی کچھ قلق نہیں کہ وہ یہاں کبھی ہوں گے اور ہم نہ ہوں گے..

لیکن..

اس رہائش گاہ کی کسی ایک دیوار پر آویزاں ایک تصویر کی صُورت تو ہوں گے..شاید ہمارے بعد سلجوق میمونہ کی وہ پورٹریٹ جو سعید اختر نے مصور کی ہے، اُسے یہاں لا کر آویزاں کر دے..

ہم بہر طور کسی نہ کسی صورت یہاں ہوں گے..

بے شک ہم نہ ہوں گے..

♦♦.....♦♦.....♦♦

مجھ پر مناظر اور موسموں کے کیسے کیسے من وسلویٰ اتار دیئے تھے..تو میرے لبوں نے ورد کیا کہ اے مالک..اس سویر کا..اس سویر میں لان کی گھاس پر جو زرد پتّے ہیں اور اُن پر جو کُہر کے ہیرے دمکتے ہیں..اور اس صحت کا..جو اس کے ابھی تک قائم رہنے کا..انگلیوں میں قلم پکڑنے کا اور جو تو نے آسودگی اور اولاد عطا کی اور بالآخر موت کا بھی شکریہ..یہاں تک کہ میمونہ کا بھی شکریہ..

سورج کے کمرے، سَن روم میں..شفاف شیشوں میں سے صبح کی ہلکی دھوپ دستک دیئے بغیر اندر چلی آتی تھی اور وہاں اتنے گھنے، تہہ در تہہ بُوٹے، گھنی بیلیں اور گملوں میں سے جھانکتی سرسبز جھاڑیاں تھیں کہ اُن پر کسی بارش کے جنگل میں پھوٹ نکلنے والی قدرتی روئیدگی کا گُمان ہوتا تھا اور ان میں وہ پودا بھی تھا جس کے ایک پتّے کو مسلنے سے ایک خواب آور مہک ایسی جنم لیتی تھی جیسی شاید جوزفین کے بدن کو ہاتھ لگانے سے نپولین کی انگلیوں کی پوروں میں سے پھوٹتی ہو..اور وہ مدھم دھوپ شیشوں میں سے سرایت کرتی ان پودوں اور بوٹوں کے جھاڑ جھنکار میں اُلجھتی اُس ڈائننگ ٹیبل تک آتی تھی جہاں ہر نوعیت اور ذائقے کا سامانِ ناشتہ سجا تھا..میں اور میمونہ تو تھے ہی پر ہمارے مقابل اعزاز اور ناجیہ بھی اپنی مسلسل اور مہربان مسکراہٹوں کے ساتھ سجے تھے..

اعزاز کی سجاوٹ اُس کا چھریرا بدن اور شائستگی..

اور ناجیہ کی مسکراہٹ اُس کے قابو میں نہ آتی تھی..

اعزاز کے چھریرے پن اور نوخیز دِکھنے کا راز سمجھ میں آ گیا..وہ ناشتے پر اخروٹ کی کُچھ گریاں، دو چار بُوند دودھ اور شاید کارن فلیکس کے کُچھ ذرّے نوش کر کے سیر ہو جاتا تھا..اور ناجیہ..وہ بھی ایک بیزار پرندے کی مانند اِدھر اُدھر ٹھونگیں مارتی نہ کچھ کھاتی تھی اور نہ کُچھ پیتی تھی..اگر ہم ان دونوں کی پیروی کرتے تو بھوک سے بے موت مارے جاتے اس لیے ہم نے تکلف برطرف کر دیا..تکلف کی اس برطرفی کے دوران ناجیہ نے پوچھا ''تارڑ صاحب..آپ گریپ فروٹ جُوس پئیں گے؟''

''ہیں؟'' میں یُوں متحیر ہوا جیسے کسی حافظ جی سے پوچھا گیا تھا کہ حافظ جی حلوہ کھاؤ گے..

ناجیہ نے میرے گلاس کو گریپ فروٹ جُوس کی زردی سے لبریز کر دیا اور ذرا خجالت آمیز لہجے میں کہنے لگی..''آپ نے اپنی کسی تحریر میں تذکرہ کیا تھا کہ آپ کو گریپ فروش جُوس اتنا پسند ہے کہ جب کبھی آپ فلوریڈا میں عینی کے پاس جاتے ہیں تو وہ اپنا فریج گریپ فروٹ جُوس کے ڈبوں سے بھر

ہاتھ سات کے ہندسے کے قریب ہوا جاتا تھا.. زندگی کی ہر صحت مند سویر کی مانند میں بستر سے جُدا ہوا، ایک روبوٹ کی مانند جوگرز چڑھا لیے، سنو جیکٹ پہنی، ساگوان کے بھاری دروازوں کے قدیم طرز کے کُنڈے کھینچ کر اُنہیں بمشکل وا کیا، لِونگ رُوم کی یخ بستگی میں آیا پھر اُس کا دروازہ دھکیلا اور پھر ہالینڈ میں اپنی پہلی سویر میں آ گیا.. اور وہ جو یورپ کے نومبر موسموں کی سرد ہوا تھی شاید میرے لیے اداس ہو چکی تھی مجھ سے لپٹ گئی اور میرے رخساروں پر اپنے سرد بوسے ثبت کرنے لگی.. میرے ماتھے پر پھیلی، میرے چھدرے بالوں میں سے گزر کر اگر وہاں کوئی دماغ تھا تو اُس کی جھلّیوں کو عجیب سرور آور ٹھنڈک سے بھرنے لگی.. میری ناک میں اُس سرد ہوا میں گُھلی ہوئی خزاں کے بجھتے بُھورے چراغوں کی مہک آئی.. رہائش گاہ کے عقب میں سبز گھاس پر خزاں کے تانبے رنگ سندیسے کھلی ہتھیلیوں کی مانند ہر سُو بکھرے ہوئے تھے اور اُن میں سے کوئی ایک ہتھیلی، کوئی زرد پتہ ہوا کے کسی خفیف جھونکے سے ذرا لرزش میں آتا، یوں سر اٹھاتا جیسے اُس سویر میں داخل ہونے والے اجنبی کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو اور پھر اگلے لمحے پھر سے گھاس پر بچھ جاتا.. نہ صرف گھاس پر بلکہ اُس پر بکھرے ہوئے زرد پتّوں پر کُہرے کی کرچ کرچ سفیدی ہیلجم کٹ ہیروں کی مانند دمکتی تھی..

پچھلی شب میرے استفسار پر اعزاز نے مجھے بتایا تھا کہ لان کے گرد ایک مختصر واکنگ ٹریک ہے جس پر آپ دو چار درجن چکر لگا کر اپنی سیر کی تشفی کر سکتے ہیں یا پھر صدر دروازے کی وہ میز جہاں ملاقاتیوں کی کتاب رکھی ہے اُس کے برابر میں ایک ریموٹ کنٹرول کے بٹن دبا کر آہنی گیٹ کو کُھل جا سم سم کا حُکم دے کر کھول سکتے ہیں اور باہر ہیگ کے فٹ پاتھوں، گلیوں اور نہروں کے کناروں پر مٹرگشت فرما سکتے ہیں.. ریموٹ کنٹرول ساتھ لے جایئے گا تاکہ واپسی پر آہنی گیٹ آپ کا تابع ہو جائے.. میں نے سوچا کہ اپنی ہیگ کی پہلی سویر میں گھر سے باہر نکلنے کا خدشہ مول نہ لیا جائے اور گھریلو سیر گاہ کے مختصر پن پر ہی گزارہ کر لیا جائے..

میں نے اپنا پیٹ اور پھیپھڑے سکیڑ کر ایک گہرا سانس لیا اور ہوا کے سرد بوسے اور خزاں رسیدہ پتوں پر منجمد کُہرے کی کُچھ کرچیاں میرے گلے میں اتر کر چھن چھن چھنکنے لگیں.. جیسے برف سے بنی ہوئی پازیبیں کھنکتی ہوں.. اور اُس لمحے میں ہالینڈ میں اپنی پہلی سویر کی سرد خوش آثاری سے، اپنی خوش بختی سے اور اُس سرد اور خزاں رنگ خوش نمائی سے اتنا متاثر ہوا کہ میرا پورا بدن تشکر کا ایک کشکول ہو گیا جس میں میرے جیسے بے وقعت فقیر کے لیے خالق نے کیسے کیسے انمول اور کھنکتے سکّے ڈال دیئے تھے..

ملک جولیانا نے یہ پیشکش بے وجہ نہیں کی تھی کہ یہ وہ زمانے تھے جب کُل دنیا پاکستان ایسی نئی اور انقلابی تصور کی حامل ریاست کو ستائش کی نظروں سے دیکھتی تھی کہ اس نئے ملک میں جو اقتصادی امکانات تھے اُن کا کچھ شمار نہ تھا..لوگ سمجھتے تھے کہ اس سلطنت کو اس کے خالق جناح کی جمہوریت پسند اور ہر مذہب کے لوگوں کے لیے عافیت اور یکساں مواقعوں کی جدید سوچ پر استوار کیا جائے گا.. ہندوستان تو اہمات میں جکڑا ہوا ہے جب کہ پاکستان ایک جدید مثالی سلطنت بننے کے تمام تر امکانات رکھتا ہے.... چنانچہ ابتدائی دور میں یہ ملک دنیا بھر کی توقعات پر پورا اترنے لگا..جب پی آئی اے ایک مثالی ایئر لائن کے طور پر ابھری جس کی ایئر ہوسٹسوں کی وردیاں پیرس کا پیئر کارڈن ڈیزائن کر رہا تھا اور یہ ایئر لائن خطّے کی دیگر ہوائی کمپنیوں کو ٹریننگ دے رہی تھی..کوریا والے پاکستان کے پانچ سالہ منصوبے کا ڈرافٹ ادھار مانگ کر اپنے ملک کو اس اقتصادی دستاویز کے مطابق تشکیل دے رہے تھے..صنعتی شعبے میں وہ ہندوستان کو مات دے رہا تھا اور زراعت میں اس کی زرخیز کارکردگی پورے خطّے میں ایک مثال تھی.. پاکستان کی قسمت میں جنوب مشرقی ایشیا کا راہنما ہونا لکھ دیا گیا تھا..اور یہ وہی زمانے تھے جب پی آئی اے امریکہ اور دیگر ملکوں میں نہایت مہنگی جائیدادیں خرید رہی تھی جن میں نیویارک کا روزویلٹ ہوٹل بھی شامل تھا..اور پھر اس تابندہ ریاست کو فوج اور کرپٹ اور نالائق سیاستدانوں کی نظر لگ گئی..نہ جمہوریت رہی اور نہ ہی وسیع النظری..اس بجھتی ہوئی موم بتی کا آخری شعلہ 6 ستمبر 65ء کی مختصر جنگ تھی، جیسی بھی تھی اس نے ہندوستان ایسے بڑے اپنے سے پانچ گنا بڑے ملک کو اپنے جذبے اور ایثار سے روک لیا، لاہور کے جم خانہ کلب میں ایک وہسکی پینے کے خواب کو پورا نہ ہونے دیا.. یہ آخری بھڑک تھی اور پھر اس کے مقدر میں صرف تاریکی، ذلت اور رسوائی لکھ دی گئی..اور ان میں مسلمانوں کی تاریخ میں سب سے بڑی رسوائی کی میز پر نہ صرف ایک کٹ چکا مشرقی پاکستان پڑا تھا بلکہ ہمارے شیر دل جنرل کی پیٹی، تمغے اور اُس کا پستول بھی پڑا تھا..اور وہ پستول بھی بزدل نکلا، اگر اُس میں ذرہ بھر حمیت ہوتی تو کم از کم اپنی ایک گولی تو اُس بے غیرت جنرل کے سینے میں اتار دیتا.. پاکستان کے عروج کے دن نہایت مختصر ثابت ہوئے اور اس کے زوال کی تاریک رات میں اب تک امید کے سورج کی کوئی ایک کرن بھی نہیں اتری..ان اندھیروں میں کرپشن، نالائقی اور مذہبی تعصّب راج کر رہا ہے اور ہم بھٹکتے پھرتے ہیں..

تب ہم خریدار تھے اور اب..دنیا بھر میں جو جائیدادیں ہم نے خرید رکھی تھیں اُنہیں فروخت

لیتی ہے تو میں نے بھی آپ کے لیے...''

ناشتے کے بعد اعزاز نے ایک ٹورسٹ گائیڈ کا رُوپ دھارا اور اپنی رہائش گاہ میں لیے لیے پھرا..اس کا تفصیلی تعارف کروایا اور ہم دونوں ٹورسٹ اس قدیم ذی شان حیرت کدے کو حیرت سے ہی دیکھتے رہے..ڈائننگ روم کے در و دیوار اور بلند منقش چھتیں سب کے سب جیسے درجنوں چھتناور درختوں کے تنوں سے تراشیدہ تھے..ڈائننگ ٹیبل کے گرد جو کُرسیاں ایک مدت سے آرام کرتی تھیں اُن کی چوبی ساخت ایک قدامت وگزر چکے زمانوں کی متانت کی گواہی دیتی تھیں کہ ان پر 1860ء کے بعد کیسے کیسے تاجر..رؤسا، سفارت کار اور شہزادے شہزادیاں بلکہ ملکائیں بھی اور اُن میں سے یقیناً کُچھ نابنجار لوگ بھی ہوں گے اور وہ سب ان کرسیوں پر براجمان ہوئے..اس ڈائننگ رُوم کا سب سے امتیازی شاہکار وہ آتش دان تھا جسے کسی ماہر چوب تراش نے تخلیق کیا تھا اور جن زمانوں میں ابھی بجلی ایسی بدعت ایجاد نہ ہوئی تھی تب کیسی کیسی شاہانہ پُشتوں نے اس سے مُنہ موڑ کر اس میں بھڑکتی ہوئی آگ سے اپنے آپ کو گرمایا ہوگا..کھڑکیوں کے شیشوں میں ہالینڈ کے ابتدائی ادوار کی شبیہیں نقش تھیں..ڈائننگ روم کے درمیان میں ایک شوکیس چاندی کے قدیم ظروف..گُل دانوں اور پیالوں سے آراستہ تھا..اور ان میں سے کُچھ قدامت کے چاندی کے بنے ہوئے ظروف کسی نہ کسی صاحبِ ذوق مہمان نے اپنے پیراہن میں پوشیدہ کر لیے..متعدد بلند چھتوں والے شاہانہ کمرے تھے جن پر بیش قیمت فانوس جُھکتے تھے..

ہم نے اُس محفوظ کر لی گئی میز کا بھی دیدار کیا جس پر برج کھیلتے ہوئے پاکستان کی غمزہ لیڈی..ایک ہندو لیڈی جو ہمارے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کے عشق میں مبتلا ہو کر کہتے ہیں کہ مسلمان ہوگئی اور پھر ہالینڈ میں ہماری سفیر تعینات ہوئی اور ڈچ لوگوں کی سب سے محبوب ملکہ جُولیانہ..اپنے پتّے پھینکا کرتی تھیں اور وہ دونوں اتنی سہیلیاں ہوگئی تھیں کہ ساری ساری رات برج کھیلتی رہتی تھیں اور اس دوران وہ پیاسی تو نہ رہتی ہوں گی..

برج کی انہی بازیوں، قلابازیوں کے دوران ملکہ جولیانہ نے رعنا لیاقت کو پیش کش کی تھی کہ اگر آپ کی حکومت دلچسپی رکھتی ہو تو ہم یہ رہائش گاہ نہایت واجبی ادائیگی پر پاکستان ایسے نوخیز لیکن اپنے بطون میں ایشیا بھر میں ممتاز ہو جانے کی صلاحیتیں رکھنے والے ملک کے ہاتھوں فروخت کر سکتے ہیں..

میں سے کچھ نہایت بدقسمت ثابت ہوئے..

1930ء کے آخر میں اس رہائش گاہ کی قسمت بدل گئی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران جب ہٹلر نے ہالینڈ پر قبضہ کرلیا یہاں ''ہٹلر یوتھ'' کا ہیڈ کوارٹر قائم کر دیا گیا۔ جنگ کے بعد یہ رہائش گاہ کچھ عرصہ ڈی ٹومب خاندان کا گھر ہوئی اور پھر 1955ء میں یہ ولا اور اس کے برابر میں جو گھوڑا گاڑیوں کا اصطبل تھا، ریاست پاکستان کی ملکیت ہوگئی..

جمیل ہمارے آس پاس گردش کرتا کھانا ترتیب دے رہا تھا اور اپنے گاتے ہوئے.. یعنی سِنگ سونگ لہجے میں غٹرغوں غٹرغوں کرتا پھرتا تھا.. اور مجھے اُس کے لہجے میں کہیں کہیں پُرانے فلمی گانوں کے بول سنائی دیتے تھے.. وہ ہمیں اپنے تیار کردہ کھانوں کی جانب یُوں متوجہ کر رہا تھا کہ..

کریلے ہیں.. کریلے ہیں.. جیا بے قرار ہے آئی بہار ہے..

چکن مصالحہ ہے.. مصالحہ ہے.. ساہنوں نہر والے پُل تے بُلا کے چکن مصالحہ کھلا کے..

میڈم آپ کے لیے اربی گوشت بنایا ہے.. جیبی ہیاّ ہیاّ.. اربی یعنی عربی گوشت..

بھنڈیاں تو چکھئے.. محبت کا جنازہ جا رہا ہے..

تارڑ صاحب.. ہالینڈ میں ٹینڈے.. جب تم ہی چلے پردیس..

نہ صرف جمیل بلکہ ناجیہ بھی ڈائننگ ٹیبل پر میمونہ کے کان میں غُٹرغوں غُٹرغوں کیے چلی جا رہی تھی کہ بھابھی.. آپ نے ہیگ میں آ کر کچھ شاپنگ نہیں کی، تارڑ صاحب تو لان میں نکل کر خزاں رسیدہ شجروں کے گرتے پتّوں کو مجذوبانہ محویت سے دیکھتے رہیں گے، آپ میرے ساتھ چلیے..

ناجیہ اپنے مصورانہ بھولپن میں نہیں جانتی تھی کہ یہ بیگم نہ صرف مجھ سے بلکہ شاپنگ وغیرہ سے ماورا اور پُرتغافل ہے..

میں ان دونوں خواتین کی غفلت کا شکار ڈائننگ ٹیبل سے اٹھتا ہوں اور ایک مرتبہ پھر کھڑکی کے ایک کونے میں سوتے جاگتے اُس پودے کے ایک پتّے کو اُنگلیوں میں مسل کر کے اُنہیں سونگھتا ہوں کہ یہ میرا گمان تھا کہ ان میں ایک سحر انگیز مہک آئے گی یا.. اور اس دوران اعجاز سیفی اپنی لیاقت علی خان کے زمانوں کی گھنی عینک سنبھالتا وارد ہو جاتا ہے..

''تارڑ صاحب.. آپ تیار ہیں..؟''

کرنے کی کوششیں جاری ہیں کہ قومی خزانہ ایک بیوہ کی مانگ کی مانند اجڑ چکا ہے..

تب ہم خریدار تھے اور اب اپنے آپ کو فروخت کرنے والے ہیں..

چلیے ہم ایک مرتبہ پھر اپنے تابندہ ماضی کی جانب پلٹ جاتے ہیں جب ہم اعزاز اور توقیر کے لائق ہوا کرتے تھے تو ان دنوں ملکہ جولیانا کی اس فراخ دلانہ پیشکش کو قبول کرتے ہوئے اس رہائش گاہ کو مناسب سے بھی کم قیمت پر حاصل کر لیا گیا..

میں یہاں اس رہائش گاہ کے بارے میں ہالینڈ کے ایک موقر اخبار میں شائع ہونے والی ایک تحقیقی اور تاریخی رپورٹ کا کچھ حوالہ دوں گا جو کسی ایولین ڈی ریگٹ نے تحریر کی..

HAAGSCHE COURANT, AUGUST 20, 1984

ہیگ کی تاریخی اور یادگار عمارتوں کے بارے میں ایولین ڈی ریگٹ کا ہفتہ وار کالم.. پلین 1813، نمبر 13، ایک کولونیل رہائش گاہ..

پاکستانی سفیر کی رہائش گاہ جو پلین 1813 پر واقع ہے، ایک کولونیل مزاج لیے ہوئے ہے.. بڑے چھت تک پہنچتے دروازوں کے عقب میں ڈرائنگ روم ہے جو وسیع اور روشن ہے.. ڈائننگ روم میں البتہ کچھ سادگی ہے، ایک منقش آتش دان اور گہرے نیلے رنگ کی چھت جو چوبی تختوں سے مزین ہے اسے قابل دید بناتی ہے... کھڑکیوں میں جڑے شیشے جیومیٹری کے پیٹرن میں خوش نظر ہیں..

ہمارے کولونیل ماضی میں یہاں ہندوستان میں رہائش رکھنے والے مختلف لوگوں نے رہائش اختیار کی.. 1955ء کے بعد یہ پاکستان کے سفیر کی رہائش گاہ کے طور پر مخصوص ہوگئی.. یہ سفید رنگت کی رہائش گاہ 1860ء میں وجود میں آئی جس کا تعمیراتی خاکہ جے۔ پی۔ سی۔ سوجسر نے تخلیق کیا، اس سے پیشتر یہاں بادشاہ ولیم دوئم کی مرغوب جھاڑیاں اس ویرانے میں بہار دیتی تھیں.. ولیم دوئم اکثر اس علاقے میں سیر کے لیے نکلتا تھا (اور اس ڈچ بادشاہ کے بعد اس علاقے میں ایک پاکستانی ادیب بھی سیر کے لیے نکلتا تھا).. اور پھر یہاں انتیس شاندار اور مرعوب کرنے والے گھر تعمیر کیے گئے.. اور یاد رہے کہ پاکستانی سفیر کی اس رہائش گاہ کا آرکی ٹیکٹ اگر جے۔ پی۔ سی سوجسر تھا تو اُس کا راج مزدور اسحاق جاگر تھا جو اینٹ پر اینٹ رکھنے کا ماہر تھا..

اس رہائش گاہ میں قیام کرنے والے بیشتر لوگوں کا تعلق ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی سے تھا جن

''وزیرستان کا شیر دھاڑتا ہوا ہمیں برسلز لے جا رہا ہے''

وزیرستان کا شیر دھاڑتا چلا جا رہا تھا.. ہالینڈ کے ابر آلود بے دید آسمان تلے، بیلجیئم کی جانب رواں شاہراہ کی بھیڑ بھاڑ میں دھاڑتا چلا جا رہا ہے.. میں اور میمونہ پچھلی نشست پر اپنی جان کی امان چاہتے سہمے بیٹھے تھے اور اگلی نشست پر شیر کے پہلو میں سیفی کی عینک کے دبیز شیشے کار کی تیز رفتاری کی تاب نہ لا کر دھندلاتے تھے اور چیخ جانے کو تھے کہ اس شیر نے ہمیں دوپہر کے کھانے کے بعد ہمارے شاہی ٹھکانے سے اٹھایا تھا اور اب اس کسی گرانڈ پری دوڑ میں شامل کسی سپورٹس کار میں سوار ہمیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ بس کسی لمحے ہم نے آسمانوں پر اٹھا لیا جانا ہے.. وہ ہمیں برسلز لیے جا رہا تھا جہاں عمران ثاقب نے ایک مشاعرے کے علاوہ میرے لیے ایک خصوصی محفل کا اہتمام کر رکھا تھا..

یہ میری زندگی کا تیسرا شیر تھا.. پہلا تو ایک نہیں بہت سے شیر تھا یعنی پی ٹی ڈی سی بشام اور پھر ناران موٹل کا مجھے ہر برس اپنے چوبی چہرے اور فراخ مسکراہٹ کے ساتھ خوش آمدید کہنے والا شیرستان.. اور اُس نے دریائے سندھ کے کنارے میرے لیے کیسی خمار آور شاموں کے بندوبست کیے اور جھیل سیف الملوک کی تاریک شب میں کیسے روشن ہوا.. دوسرا شیر ظاہر ہے لاہور شہر کے چڑیا گھر والا ببّر شیر تھا.. اور تیسرا یہ شیر خان تھا جو برسلز سے مجھے ہیگ سے اٹھانے کے لیے آ گیا تھا.. ویسے تو میرے برابر میں براجمان بھی ایک ببّر شیر براجمان تھا لیکن یہ میرا گھریلو شیر تھا اگرچہ پالتو نہ تھا اور ایسا تھا کہ اس کے سامنے بڑے بڑے ببّر شیر دم دبا کر میاؤں بلی ہو جاتے تھے.. بلکہ میاں بلّی ہو جاتے تھے.. اور میں وہی میاں تھا..

اگرچہ یہ والا شیر ایک سُرخ آندھی کی رفتار سے اڑا چلا جاتا تھا لیکن اُسے اُس آندھی سے اٹھنے والے ہر صبا رفتار مرغولے پر مکمل اختیار تھا یعنی وہ تیز رفتار ہونے کے باوجود ایک محفوظ ڈرائیور تھا..

میں ابھی کل ہی تو ہالینڈ میں وارد ہوا تھا اور آج بیلجیئم کی جانب شیر کے شکریئے کے ساتھ

''کاہے کے لیے..'' میں اپنی انگلیوں میں سرایت کر جانے والی اُس مُشک میں مسحور ہوں..

''جانے کے لیے..''

''کہاں؟''

وہ ایک کف افسوس ملتا ہے..اپنی عینک درست کرتا ہے اور میں خواہش کرتا ہوں کہ آخر یہ شخص لیاقت علی خان کی عینک ابھی تک کیوں پہنے ہوئے ہے اور پھر کہتا ہے ''بیلجیئم اور کہاں..''

''لیکن سیفی صاحب..ہمیں تو اس گوشے میں آرام بہت ہے تو یہاں سے کہیں اور کیوں جانا..اور کاہے کو جانا..اور وہ بھی کسی اور ملک میں..''

''تارڑ جی..میں نے آپ کو آپ کے ٹور کا تفصیلی پروگرام آپ ہی کی اجازت سے بھجوا دیا تھا..برسلز میں کچھ لوگ آپ کے منتظر ہیں اور آج کی شب آپ کے اعزاز میں ایک محفل ہے..یاد نہیں؟''

''نہیں..''

سیفی قدرے ناخوشگوار ہوا..''تارڑ صاحب..میں نے آج تک آپ جیسا بھلکڑ اور..'' کہنا تو وہ شاید بے وقوف چاہتا تھا لیکن آدابِ میزبانی کی شرم سے مارا ہوا کہنے لگا ''پُر تغافل ادیب نہیں دیکھا..باہر شیر خان کھڑا ہے۔''

''کیوں کھڑا ہے؟''

''آپ کو برسلز لے جانے کے لیے..''

♦♦.....♦♦.....♦♦

مختصراً بیان کرنے میں کُچھ حرج نہیں..

میری یادداشت دُھندلکوں میں ایک نابینا تتلی کی مانند بھٹکتی پھرتی ہے اور اُسے کُچھ دکھائی نہیں دیتا البتہ اُس کے پروں پر ثبت کیے گئے کُچھ بوسے ماضی کی تین تصویروں کو زندہ کرتے ہیں اور وہ تین تصویریں لڑکیاں اگر آج بھی چالیس برس بعد بھی اگر سانس لیتی ہیں تو شاید کسی اولڈ پیپل ہوم میں یا کسی آرام کُرسی پر اونگھتی دادی اماں کے رُوپ میں تو آج اُن کے بیان کر دینے میں کُچھ بھی مضائقہ نہیں..

''ایمسٹرڈیم کے سنٹرل سٹیشن سے ہیگ تک کا فاصلہ تیز رفتار ٹرین نے صرف پینتالیس منٹ میں طے کر لیا.. میں سٹیشن پر اپنا سامان رکھ کر شہر کی سیر کو نکل گیا، یورپ والوں کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ ہیگ یورپ کا سب سے بڑا قصبہ ہے اور اس کے باشندے کُچھ نہ کرنے کو بہت کچھ سمجھتے ہیں، ''قصرِ امن'' جہاں عالمی عدالت کا اجلاس ہوتا ہے، شہر کی واحد قابل ذکر عمارت ہے.. پورا دن ہیگ میں گزارنے کے بعد شام کی گاڑی سے بیلجیئم روانہ ہو گیا.... بیلجیئم کے صدر مقام برسلز میں پہنچے جسے یورپ کے بدصورت ترین شہر کا خطاب ملنا چاہیے..''

اور یہیں پر میں نے برسلز کے ساتھ زیادتی کی.. وہ بے شک ایک بدصورت اور بور شہر تھا پر یہاں جو خوبصورت اور مہربان تھے میں نے اُن کا تذکرہ بوجوہ حذف کر دیا تو اس جُرم کی تلافی کر دینے میں کُچھ حرج نہیں.. چلتے ہو تو چالیس برس پیشتر کے برسلز کو چلیے..

♦♦.....♦♦.....♦♦

اُڑا جاتا تھا..

جونہی میں نے چالیس برس بعد ایمسٹرڈیم کے ایئرپورٹ کے باہر آ کر ہالینڈ کی سرزمین پر قدم رکھا تھا تو میں بیک وقت دو زمانوں کا..ایک وہ جو گزر چکے تھے اور دوسرا وہ جو لمحۂ موجود میں سانس لیتا تھا۔ میں انہی دو زمانوں کا مسافر ہو گیا تھا..ماضی کی پرچھائیاں ہر قدم پر بیت چکے دنوں کی دھندلاتی تصویریں آنکھوں کے سامنے پُتلیوں کی مانند نچاتی تھیں..تب ہر درخت سرسبز دکھائی دیتا تھا اور اب.. ہر جانب خزاں کے آخری زرد سندیسے ہواؤں میں اڑتے پھرتے تھے...

وہ ''نکلے تری تلاش میں'' کے زمانے تھے جب ہر بلخ راج ہنس دکھائی دیا کرتی تھی اور میں نے ہالینڈ کے بعد برسلز کے قیام کی کچھ تفصیل بوجوہ درج نہ کی تھی اور یہ کہہ کر لنڈن چل دیا تھا کہ برسلز یورپ کا سب سے بورترین شہر ہے..

اور وہ کونسی وجوہات ہیں جن کی بنا پر میں نے برسلز کے قیام کی تفصیل درج کرنے سے گریز کیا تھا..میں نے اپنے پہلے سفرنامے کے مسوّدے کو جب دوبارہ پڑھا تو مجھے احساس ہوا کہ صنف نازک کے تذکرے مسلسل ہیں اگرچہ میں لاچار تھا کہ وہ مسلسل تھیں تو میں کیا کرتا..علاوہ ازیں سفرنامے کا حجم بڑھتا جاتا تھا اور میں پیرس کی پاسکل کے حوالے سے اس کے جلد از جلد اختتام کی تمنا کرتا تھا.. چنانچہ میں نے برسلز کے قیام کو حذف کر کے مختصر کر دیا اور آگے بڑھ گیا..اور صد شکر کہ میں نے یہ گریز کیا کیونکہ ''نکلے تری تلاش میں'' کی اشاعت پر جہاں اس کی پذیرائی نے مجھے مسرت اور حیرت سے ہمکنار کیا وہاں حاسدین کے اس اعتراض پر بھی دکھی ہوا کہ تارڑ کو ہر قدم پر ایک لڑکی سے سابقہ کیوں پڑ جاتا ہے اور یہ تو حقیقت سے ماورا اُس کی ذہنی اختراع کے کرشمے ہیں..دراصل وہ اپنے ٹی ہاؤسوں اور باہمی ستائش کی محفلوں سے دور گوالمنڈی کی ایک دکان میں بیٹھے ہوئے ایک سفرنامہ لکھ ڈالنے والے شخص کو جو اُن کی منڈلیوں کا ایک فرد نہ تھا، ایک ادیب کیسے مان لیتے..تو وہ اس سفرنامے کی مقبولیت اور پذیرائی کے لیے جواز تراشتے تھے اگرچہ اُن میں سے بیشتر نے بہت عرصہ بعد وسیع القلبی کا مجبوراً مظاہرہ کیا جب میرے پاکستانی شمال کے بارہ سفرناموں میں مجال ہے کوئی لڑکی دور دور تک نظر آتی ہو.. صرف پتھر اور برفیں نظر آتی تھیں اور پھر بھی وہ مقبول ہوئے..

چونکہ اُس ''نکلے تری تلاش میں'' حذف شدہ برسلز اپی سوڈ کو گزرے چالیس برس ہو چکے ہیں اور اب اُسے بیان کرنے میں فساد خلق کا کچھ اندیشہ نہیں تو اس قصۂ پارینہ کو جو حذف کر دیا گیا تھا،

''نیل..میں لڑکیوں میں کچھ دلچسپی نہیں رکھتا..''

اگلی سویر نیل تو بذریعہ بس برسلز کے لیے روانہ ہو گیا او چونکہ میں صرف ہچ ہائکنگ کے ''مُفتے'' سے لطف اندوز اور خجل خوار ہونے کی خصلت رکھنے والا تھا، بس یا ٹرین پر سفر کرنا گناہ سمجھتا تھا اس لیے ہم جُدا ہو گئے لیکن اس وعدے کے ساتھ کہ ہم دونوں برسلز کی کیمپنگ سائٹ میں پھر سے ملیں گے۔

نیل وداع ہوا تو میں نے اپنا رُک سیک کاندھے پر ڈالا اور آرنہم کے قصبے سے باہر آ کر دو تین کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے برسلز جانے والی شاہراہ کے کناروں پر آ کر..اپنا بوجھ زمین پر رکھا اور ایک خوشامدی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر لفٹ کے لیے اپنا انگوٹھا دراز کر دیا..درخواست گزار ہوا کہ بندہ بے سہارا ہے، براہ کرم مجھے اپنی کار، ٹریلر یا ویگن میں سہارا دیجیے اور برسلز تک لے جائیے، لیکن کسی بھی ڈرائیور کو مجھ پر کچھ ترس نہ آیا اور ٹریفک شپ شپ مجھ پر ترس کھائے بغیر گزتی رہی، میں بے مُراد رہا..اور تقریباً چار گھنٹوں کی منت سماجت کے باوجود جب کوئی بھی کار میرے لیے نہ رکی تو میں نے سوچا کہ اب کسی قریبی سٹیشن کا رُخ کر کے کوئی گاڑی برسلز کے لیے پکڑتے ہیں تو اُس لمحے ایک پرانی فوکس واگن رفتار کم کرتی مجھ سے کچھ فاصلے پر جا کر ہچکیاں بھرتی تھم جاتی ہے۔ میں اپنے رُک سیک کو کانوں سے پکڑ کر گھسیٹتا، ہانپتا، اُس تک جا پہنچتا ہوں..جُھک کر مُلتجی نگاہوں سے فوکس واگن کے اندرون میں نظر ڈالتا ہوں تو ڈرائیور کی نشست پر سٹیئرنگ تھامے ایک ایسی لڑکی ہے جس کے بال ایک جھالر کی صورت اُس کے فراخ ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے، رنگت میں گندم کی ایک گھلاوٹ تھی جو شاید دیر تک دھوپ میں غسل کرنے کی صورت میں بدن کو بے رنگ سفیدی سے ایک ہلکے سُنہرے پن میں لے جاتی ہے..اُس کی آنکھیں عام یورپی لڑکیوں کی نسبت بڑی بڑی تھیں اگرچہ پُرکشش نہ تھیں..اس ماہی مُنڈا ٹائپ کی اپنے بلاؤز کو بھر دینے والی لڑکی کے برابر میں آنکھوں پر سیاہ چشمہ چڑھائے ایک دھان پان سی ذرا معزز اور تازہ ترین فیشن سے آشنا ایک خاتون تھی جس کی رنگت دودھیا اور خدوخال نازک اور کانچ ایسے نازک تھے اور اگر وہ اپنے حُسن پر نازاں متکبر دکھائی دیتی تھی تو اُسے دوش نہیں دیا جا سکتا تھا لیکن وہ بھی اپنے ترچھے ہوئے ہونٹوں کو خفیف سا وا کر کے مسکرائی کہ ناز کی اُس کے لب کی کیا کہیے..

میری نگاہ جائزہ لے چکی تھی کہ کار کی پچھلی نشست سامان سے ٹُھسی پڑی ہے تو یہ اگر مجھے لفٹ دینے پر آمادہ ہیں تو کہاں بٹھائیں گی..

جونہی اُنہوں نے کھڑکی میں سے جھانکتا میرا چہرہ دیکھا وہ دونوں ماہی مُنڈا اور سیاہ چشمے میں

''ایک کیوبن، دو فرانسیسی لڑکیاں اور صرف ایک پاکستانی ایک ہی فلیٹ میں خوابیدہ، گئے زمانوں میں''

میں اپنے تقریباً بیس کلو وزنی رُک سیک کو کاندھوں پر اٹھائے جرمنی سے چلا آتا تھا اور بلجیئم کی سرحد پار کرنا چاہتا تھا اور عین سرحد پر واقع ایک قصبہ شاید آرنہم نام کا تھا..اُن دنوں یورپ یُوں متحد اور ایک ملک نہ تھا، بٹا ہوا تھا اور درمیان میں سرحدیں تھیں جنہیں عبور کرنا پڑتا تھا..اور کچھ سرحدیں اپنے پھاٹک سرِشام بند کر دیتی تھیں اور میں جرمنی سے جب آرنہم پہنچا تو سرِشام پہنچا..تو میں اُس سمے پار نہ پہنچ سکتا تھا..میں نے شب بسری کی خاطر آرنہم کے یُوتھ ہوسٹل کا رُخ کیا جہاں مجھے خوش آمدید کہا گیا کہ میں اُس یُوتھ ہوسٹل میں وارد ہونے والا پہلا پاکستانی تھا..کھانے کے بعد جیسا کہ دستور تھا ہوسٹل میں مقیم سب آوارہ گرد حضرات نے کچن میں کھڑے ہو کر گندے برتن خوب دھوئے اور پُونچھے..اس دوران برتن دھونے کے دوران ایک امریکی سیاّح جس کا نام مجھے آج تک کیسے یاد رہ سکتا ہے..شاید کوئی بل، جارج یا نیل وغیرہ تھا تو سہولت کے لیے اُسے نیل کہہ لیتے ہیں، میرا دوست ہو گیا..اس لیے کہ ہم دونوں کے سر پھرے ہوئے تھے اور بے مُہار تھے..اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر ہم آرنہم کے قصبے کو دریافت کرنے کی غرض سے نکل گئے..بلکہ سچ پوچھیے تو نیل، اقبال کی شاعری کا وہ شاعر تھا جس کے حواس پر عورت سوار تھی اور منٹو نے کہا تھا کہ حواس پر اگر عورت سوار نہ ہو تو کیا ہاتھی سوار ہو گا، نیل لڑکیوں کے معاملے میں کُچھ زیادہ ہی حواس باختہ تھا..اُس کی آنکھیں نہ تو قصبے کی قدامت پر ٹھہرتی تھیں اور نہ ہی اس کی تاریخ کا تجزیہ کرتی تھیں، صرف اور صرف لڑکیوں پر فوکس ہوتی تھیں، وہ فٹ پاتھ پر چلتی یا کسی کیفے میں براجمان شام کی شراب کے گھونٹ بھرتی لڑکیوں کو دیکھتا تو بے قابو ہو کر کہتا..''پاکستانی..آؤ ان سے مذاکرات کرتے ہیں'' اور میں بہت تھکا ہوا اور دن بھر کی ہچ ہائکنگ سے خجل خوار کہتا

ایک پاکستانی رُک سیک اٹھائے لفٹ کا طالب ہو..تو ہر کوئی مہربان ہو جاتا تھا.. مجھے یاد ہے کہ ایک سویر جب میں ہیمبرگ سے نکل کر آٹو بہان کے ایک سنگم پر آ کھڑا ہوا تا کہ ڈنمارک کی جانب کوئی لفٹ حاصل کر سکوں تو وہاں مجھ سے پیشتر کوئی درجن بھر گورے اور گوریاں بھی اسی آس میں منتظر کھڑے تھے جب ایک سیاہ مرسیڈس رُکی اور قانون کے مطابق ایک سویڈش جوڑا آگے بڑھا تا کہ کار میں براجمان ہو جائے تو ڈرائیور نے میری جانب اشارہ کر کے کہا کہ نہیں..ہم اس گندمی رنگت کے سیاح کے لیے رُکے ہیں اُسے بھیجو..اور اس مرسیڈس میں ایک ایسا موٹا جرمن سوار تھا جو فرائی برگ کا میئر تھا اور ایک زمانے میں ہٹلر کے بہت قریب نازی فلسفے پر دل و جان سے ایمان رکھنے والا شخص تھا..

چنانچہ ہر کوئی مہربان ہو جاتا تھا.. یہ دونوں میری محسن خواتین بھی مُجھ عجوبے میں دلچسپی لینے لگیں.. میں نے اُنہیں پاکستان سے یہاں تک کہ طویل زمینی سفر کی روئیداد کے کُچھ مبالغہ آمیز قصّے سنائے اور بتایا کہ میں کئی ماہ سے آوارگی کی گردش میں ہوں تو سیاہ چشمے میں روپوش میڈم کے ہونٹ کلیوں کی مانند کھلے اور اُس نے پوچھا ''تم کرتے کیا ہو؟''

''انتظار..''

موٹی آنکھوں والی بکری بالوں والی نے گردن کو بل دے کر شاہراہ سے نظریں ہٹائے بغیر کہا

''کس کا؟''

''آپ جیسے مہربان اور خوبصورت لوگوں کا..''

ان دونوں کی انگریزی سے شناسائی بس واجبی سی تھی اور ادھر میں فرانسیسی میں بالکل کورا تھا.. یعنی ''میاسی'' شکریہ ہے اور ''یتیم..'' شاید آئی لو یُو ہے..میں نے بھی گورنمنٹ کالج میں داخلہ لینے کے بعد اختیاری مضمون کے طور پر بصد شوق فرانسیسی زبان کو ترجیح دی تھی اس لیے بھی کہ ہماری ٹیچر ایک اسی مادام کی شکل کی نازک سی فرانسیسی خاتون ہوا کرتی تھیں..لیکن یہ چند روزہ معاشقہ تھا، ہم طالب علم مُنہ کھولے اُس ٹیچر کے لبوں سے ادا ہونے والے فرانسیسی سبق پر غور کرنے کی بجائے اُس کے لبوں پر غور کرتے رہتے کہ یہ کم از کم میری زندگی کی با قاعدہ پہلی میم تھی..اور جب سبق پر غور کیا تو کُچھ پلّے نہ پڑا.. بلکہ میں تو پہلے مرحلے میں ہی فرانسیسی سے سبکدوش ہو گیا کہ ٹیبل کو لا ٹیبلو وغیرہ کے فرانسیسی اخراج کے لیے میرا گلا ساتھ نہ دیتا تھا، آج مجھے اس کوتاہی پر نہ صرف افسوس بلکہ ندامت بھی ہوتی ہے کہ تب اگر میں کُچھ دھیان کرتا تو عظیم فرانسیسی ادب اور فلسفے کو انگریزی ترجمے میں پڑھنے کی بجائے فرانسیسی زبان

روپوش میڈم اپنی نشستوں سے اٹھ کر باہر آ گئیں.. مجھے فرانسیسی زبان میں کچھ کہا اور یقیناً یہ ہمدردی اور شفقت کے لہجے میں کہا گیا، ان دونوں نے پچھلی نشست پر ڈھیر سامان کی اتھل پتھل کی، اُسے آگے پیچھے کر کے نشست کا کُچھ حصہ خالی کر لیا.. جہاں میں اپنے آپ کو سکیڑ کر بیٹھ سکتا تھا..

''ہم برسلز تک جا رہی ہیں۔'' یہ فقرہ بھی فرانسیسی میں ادا ہوا..

''مِیا سی..'' میں نے اپنی کُل فرانسیسی اُن کی نذر کر دی..

سیاہ چشمے والی خاتون میں انگریزی کی کچھ رمق موجود تھی.. ''تم کہاں جانا چاہتے ہو؟''

''جہاں تک آپ جا رہی ہیں۔''

''ہم برسلز جا رہی ہیں۔'' اس بار ماہی مُنڈا لڑکی نے اپنی اٹکتی ہوئی انگریزی آزمائی.. میں پچھلی نشست پر اُن کے سامان میں پھنسا ایک ٹین میں بند سارڈین مچھلی کی مانند ساکت بیٹھا رہا..

وہ دونوں خواتین فرانسیسی نژاد تھیں..

وہ جو چوڑے ماتھے والی ڈرائیور تھی، جس کے بال بکریوں کی مانند اُس کے چوڑے ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے، کسی یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھی.. اور اُس کے برابر میں جو بُوٹے سے قد کی.. وہ کار سے جب باہر نکلی تھی تو میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ سرو کا بُوٹا اگر ہے تو ابھی اُس کا قد میرے کندھوں سے اوپر نہیں ہوا.. تو وہ ترشے نین نقش والی خاتون ایک شادی شدہ مادام تھیں.. اُن کے خاوند جو کُچھ بھی کرتے تھے اتنے مصروف تھے کہ گرمیوں کی چھٹیوں کے لیے ہسپانیہ جانے کے لیے وقت نہیں نکال سکتے تھے اور مادام ہسپانیہ کی عاشق زار تھیں۔ چنانچہ اپنے سے کم عمر اس سہیلی کے ساتھ گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھیں.. نوعمری میں عشق میں مبتلا ہو کر وہ شادی شدہ ہو چکی تھیں جس کے نتیجے میں کچھ زیادہ ہی نکھر گئی تھیں.. یاد رہے کہ تب میں بھی ستر برس کا نہیں تھا.. اُنہوں نے ہسپانیہ جانے کے لیے برسلز کا سفر اس لیے اختیار کیا تھا کہ وہاں اُن کی ایک کیوبن دوست رہائش پذیر تھی جو کیوبا کے سفارت خانے میں تعینات تھی.. اُنہوں نے اُسے ہم سفر کرنا تھا.. اس فوکس ویگن کو کوترک کر کے اپنا سامان ایک سفری کارواں جسے اِن دنوں آر وی یعنی ریکری ایشن وہیکل کہا جاتا ہے، میں منتقل کرنا تھا اور پھر عازم ہسپانیہ ہو جانا تھا.. یعنی برسلز میں دو تین روز اُس کیوبن سہیلی کے فلیٹ میں گزارنے کے ازاں بعد..

میں ایک بار پھر عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ ان زمانوں کے یورپ میں ابھی پاکستانیوں کی یلغار کا آغاز نہ ہوا تھا، پاکستانی تو کیا کوئی بھی غیر ملکی چاہے وہ کالا شاہ افریقی ہو ایک عجوبہ ہوتا تھا.. چہ جائیکہ وہ

کروایا.. کہ سہیلی یہ آوارہ گرد نوجوان جو کسی پاکستان نام کے ملک سے طویل زمینی راستے طے کرتا چلا آتا تھا اور بے یار و مددگار لاچار سڑک کے کنارے کھڑا تھا، ہم اسے اٹھا لائی ہیں تو کیا اسے یہاں رات بسر کرنے کے لیے دو گز فرش بھی نہ ملے گا۔

اس کیو بن سفارتکار خاتون کا فلیٹ شاہانہ اور پُر وقار تھا اور میں ایک ایسا گداگر تھا جو لفٹوں کی بھیک مانگتا اس پناہ گاہ میں داخل ہو گیا تھا.. اور مجھے بخوشی قبول کر لیا گیا..

برسلز میں یہ میری پہلی شام تھی..

ڈرائنگ رُوم میں وہ تینوں مجھ سے غافل ہو کر سفر ہسپانیہ کی تفصیلات طے کر رہی تھیں اور میں اُن کے مقابل ایک صوفے پر دبکا بیٹھا ایک خوشامد بھری مسکراہٹ کے ساتھ اُنہیں تکتا جاتا تھا..

اس خوشامدی تکنے کے دوران میں نے نوٹ کیا کہ کیو بن سفارت کار لڑکی کی جین کی پچھلی پاکٹ میں سے وہسکی کی ایک بوتل جھانکتی ہے۔

شام قدرے گہری ہوئی اور کھڑکیوں کے پردوں میں سے برسلز کی روشنیاں سرایت کرنے لگیں اور وہ تینوں مجھ سے بدستور غافل گپیں لگاتی چلی جاتی تھیں تب کیو بن بی بی نے ایک ڈبے کا ڈھکن کھول کر اُس میں سے ایک موٹا اور لامبا سگار نکالا.. اُس کے مقفّل مُنہ کو ایک ننھی قینچی سے تراشا اور پھر اُسے ایک لائٹر کی آگ سے سلگا کر طویل مدھ بھرے کش لگانے لگی.. وہ کبھی کبھار کش لگاتے مجھ پر ایک نظر ڈال لیتی اور پھر وہ تینوں مشترکہ طور پر مجھ سے غافل ہو کر آپس میں چُہلیں کرنے لگتیں.. اس دوران کیو بن بی بی میری محسن خواتین کے لیے اپنی کپ بورڈ میں سے وائن کی ایک بوتل نکال لائی جس کے مُنہ میں پیوست کارک کا ڈھکن بمشکل کُھلا..

ان ظالموں نے مجال ہے کہ مجھے جُھوٹے مُنہ کچھ صُلح ماری ہو کہ آپ ایک آدھ گھونٹ بھر لو.. حالانکہ کس کافر نے گھونٹ بھرنا تھا.. بس آپس میں ہی مئے لالہ فام سے لطف اندوز ہوتی رہیں..

اگرچہ اُس شب وہ تینوں ہی ایک مدھم خمار میں تھیں.. کہ جس کو دیکھا خمار میں دیکھا.. یہ معجزہ موسم بہار میں دیکھا لیکن ان تینوں میں سے دو دھیا رنگت کی شادی شدہ مادام تھیں جو اُس گونہ بے خودی میں اپنے ترچھے ہوئے نین نقش کے ساتھ مجھ پر اثر کرتی تھیں.. وہ تینوں تو شاید ایک ہی بیڈ روم میں سما گئیں اور مجھے خوابیدگی کے واسطے لونگ روم تفویض کر دیا گیا جہاں محفلِ مے نوشی سجی تھی.. میں نے اپنا سلیپنگ بیگ کھول کر دیوار قالین پر بچھایا.. اُس میں رینگ کر کچھ دیر تو میں ان تین حسین اتفاقات سے ایسی عجیب سی ملاقات

میں ہی پڑھتا تو کتنا ثروت مند اور بہتر لکھنے والا ہوتا..لیکن اب تو چڑیاں فرانسیسی زبان کا کھیت کب کی چُگ چکی تھیں، پچھتانے سے کیا ہوت..

برسلز شہر کے آثار شروع ہوئے تو ان آثار پر جو کُچھ ایسے خوش آثار نہ تھے شام کے سائے طویل ہو رہے تھے..

''تم کہاں اترنا چاہو گے؟''

''جہاں سے میں برسلز کی کیمپنگ سائٹ میں آسانی سے پہنچ سکوں..اگر یہ ممکن نہ ہو تو کہیں بھی اتار دیجیے، میں راستہ تلاش کرلوں گا..''

''لیکن تم تو برسلز میں اجنبی ہو..کیسے راستہ تلاش کرلو گے۔'' مادام کے لہجے میں تشویش تھی..

''اگر نہ تلاش کر سکا تو کسی فٹ پاتھ پر.. یا کسی پارک میں اپنے سلیپنگ بیگ میں یہ رات گزار لوں گا..میں کابل، تہران اور کوپن ہیگن وغیرہ میں ایسا کر چکا ہوں..آپ فکر نہ کریں، کہیں بھی اتار دیں..''

ان دونوں نے فرانسیسی زبان میں کچھ مشورے کیے، کبھی بکری بالوں والی سر جھٹک دیتی اور کبھی مادام کے شیریں لب کچھ کہتے کہتے بند ہو جاتے..اُنہوں نے مڑ کر میری بے چارگی اور حالتِ زار کا بھی کچھ مشاہدہ کیا اور پھر موٹی اگرچہ کشش سے عاری آنکھوں والی نے کہا ''ہماری کیوبن سہیلی کا سفارتی فلیٹ خاصا کشادہ ہے اگر تم پسند کرو تو وہاں رات گزار سکتے ہو، کل صبح کیمپنگ میں چلے جانا..اگر تم پسند کرو تو..''

وہ کیوبن سہیلی اپنے سراپے میں مختصر لیکن ایک برانگیختگی کی آتش میں سلگتی نظر آتی تھی..اُس کے نقش و نگار اگرچہ مشرقی حلاوت میں گھلے ہوئے تھے، گندمی رنگت میں گوندھے گئے تھے پر اُس کی بے حجابی مغربی تھی..

میں جب اپنے میلے کچیلے سفری پیراہن میں کاندھے پر اپنا رُک سیک اٹھائے ایک یتیم سے پلّے کی مانند اُس کے فلیٹ میں داخل ہوا تو اُس نے اپنی چُست جین اور سیاہ بلاؤز میں مجھے عجیب شک بھری نگاہوں سے دیکھا۔ مجھے شائبہ ہوا کہ شاید وہ مخمور ہے یا اُس کی سیاہ آنکھوں میں کوئی فتور ہے... ماہی منڈا اور مادام نے اپنی سہیلی کو میرے بارے میں ظاہر ہے فرانسیسی میں کچھ بتایا، میرا تعارف

''پیشاب کرتا بچّہ اور گرم اور گیلے بوسے''

اگلی سویر آنکھ کھلی..اور یاد رہے کہ میں لونگ رُوم کے قالین پر بچھے سلیپنگ بیگ میں لیٹا فرش کی سطح پر بچھا تھا تو آنکھ کھلی..اور مجھے محسوس ہوا جیسے میں ایک گُلیور ہوں ایک بالشت بھر کا بونا ہوں جس کے آس پاس جنّات کی لامی لامی ٹانگیں حرکت کر رہی ہیں..چہل پہل جاری تھی، وہ تینوں اپنے شب خوابی کے مختصر لباسوں میں اپنے بدنوں سے لاپرواہ ان ڈھکی سی میری موجودگی سے لاپرواہ شاید کچن میں آ جا رہی تھیں جہاں سے سلگتے ٹوسٹوں اور تلے جانے والے انڈوں کی مہک آ رہی تھی..میں مچل مارے آنکھیں یُوں بند کیے جیسے ابھی تک گہری نیند میں ہوں مزے سے پڑا رہا..جب کبھی آنکھیں کھولتا تو مجھے اپنے اوپر متحرک رہوڈز کے مجسمے کی مانند مجھ پر سایہ فگن ہوتیں ٹانگیں اٹدتی نظر آتیں اور میں ان کی ساخت اور بناوٹ سے اندازے لگاتا کہ یہ کس کی ملکیت ہیں..اگر تو وہ قدرے فربہ ہیں تو یقیناً بکری تھی جو بیڈ روم سے نکل کر کچن کی جانب چلی جاتی تھی..اگر وہ دودھ کے نازک کٹورے ہیں، کانچ کی بنی لگتی ہیں تو مادام کے سوا اور کون ہو سکتا ہے اور اگر ان کی رنگت میں کیوبا کی گنّے کی شراب رَم گھلی ہوئی لگتی ہے تو..ان چھ ٹانگوں کو فرش کی سطح سے دیکھنے سے ان کے آخر میں جو جھالریں سی نظر آتی تھیں تو وہ بہت واجبی سی تھیں..ایک مرتبہ پھر جب میں نے آنکھیں کھولیں تو اُن کے روبہ رو مادام کا چہرہ پایا اور وہ یوں مسکراتی تھی جیسے ایک بچے کو نیند سے جگا رہی ہو''ناشتہ..''

مجھے ایک خفیف سا افسوس بھی ہوا کہ وہ میرے ایک لڑکا ہونے کی حقیقت سے یکسر غافل تھیں..اُسی طور اپنے شبینہ لباسوں میں ڈھکی اَن ڈھکی گھومتی پھریں..میں اُن کے لیے ایک اجنبی کھلونا تھا اور ایک کھلونے سے اپنے آپ کو کیا چھپانا..ناشتے کے بعد میں نے اپنا سلیپنگ بیگ لپیٹا اُسے رُک سیک میں پیک کیا اور اُن کی نوازش کا بھرپور شکریہ ادا کرتے ہوئے اُن سے درخواست کی کہ وہ مجھے برسلز کی کیمپنگ سائٹ تک جانے والی ٹرام تک راہنمائی کر دیں..ان تینوں نے فرانسیسی زبان میں ہی

کی خوشگواری پر مسکراتا ہوا غور کرتا رہا کہ آج صُبح میں کیسے اُس شاہراہ کے کنارے بے یارو مددگار کھڑا تھا اور آج شب کم از کم تین یاریاں اور مددگاریاں ہیں جو کہیں قریب ہی جانے کیسے ہیجان خیز انداز میں سوتی ہوں گی اور جانے کس بدنی حالت میں ہوں گی.. اُن زمانوں میں ناول نگاری میں شعور کی رو کے بہت چرچے تھے اور ورجینیا وولف کی بڑی دھوم تھی یعنی آپ بیانیے میں شعور کی رو کے ساتھ بہتے چلے جاتے ہیں، بظاہر تحریر میں کلاسیکی انداز کا ربط نہیں ہے لیکن اُس کا مجموعی تاثر آپ کو مصنف کے اندر جو پوشیدگی ہے، اُسے مدھم مدھم ظاہر کرتا چلا جاتا ہے.. لیکن اُنہی زمانوں میں.. جب ہر درخت سرسبز لگتا ہے اور ہر بطخ ایک راج ہنس دکھائی دیتی ہے اور میں اُنہی زمانوں میں تھا تو اُس بخارزدہ نوخیزی میں ایک لاشعور کی رو بھی ہوا کرتی تھی اور وہ صرف صنف نازک کو دیکھ کر ہی رواں ہوتی تھی اور آپ اُس کی روانی میں بہتے بہتے عجیب گیلے تصوّرات میں چلے جاتے تھے.. اُس شب لاشعور کی یہ رو اُن تینوں خواتین کی تصوّراتی خوابیدگی کے زیرو بم میں سانس لیتی کبھی اُن کے نشیب میں اترتی تھی اور کبھی فراز کے دودھیا پن کی کوہ پیمائی کرنے لگتی تھی.. تو میں آسانی سے تو نہ سویا..

رات بھر نازک آہٹیں سنائی دیتی رہیں..

کون چلتا تھا.. میرے آس پاس کون چلتا تھا..

میرے سلیپنگ بیگ میں میرے سوا اور کون تھا جو محسوس ہوتا تھا.. کیوبن لڑکی کی جین جو واضح طور پر کولہوں سے ڈھلکتی لگتی تھی اُس کی جیب میں ٹھنسی ہوئی وہسکی کی بوتل محسوس ہوتی تھی، فراخ ماتھے پر کٹے ہوئے بال تھے باتراشیدہ ہونٹ تھے، کیا تھا اور کون تھا.. شب بھر رہا چرچا تیرا.. لاشعور کی رو کے راستے میں کیسی کیسی وادیاں اور ابھار تھے..

تو میں آسانی سے نہ سویا اور سویا تو برسلز میں جتنے بھی گھوڑے تھے اُن سب کو بیچ کر سویا اور عارضی موت کی غفلت میں گم ہو گیا..

۵۵ .....۵۵ . ....۵۵

خبرداریاں درج ہوتی ہیں یعنی ''اس دیوار کے ساتھ پیشاب کرنے والے کا مُنہ کالا کر دیا جائے گا''، ''دیکھو یہ کُتا ہے جو یہاں پیشاب کر رہا ہے'' اور اس کے باوجود اُن دیواروں سے مُنہ لگائے نہایت معزز حضرات اپنے آپ کو فارغ کرتے نظر آتے ہیں..

تو میں برسلز کے اس دھاریں مارتے بچے کے مجسّمے کے لیے اپنے دل میں کوئی نرم گوشہ پیدا نہ کر سکا..

اور جب ہم برسلز کی اس مشہور زمانہ شناخت کے سامنے کھڑے تھے تو وہ مادام مجھے کچھ حیا آور سی لگتی کہنے لگی ''یُو لائک اِٹ؟''

''نو..''

''آئی آلسو دونت لائک اِت..'' وہ اٹکتی ہوئی انگریزی میں بولی ''تمہیں کبھی پیرس آنا چاہیے..''

''جب میں انگلستان میں ہوا کرتا تھا تو میں پیرس آتا جاتا رہتا تھا.. لنڈن سے میری واپسی وطن کے لیے ہوگی اور میں پیرس کے راستے لوٹوں گا..''

''کونسی تاریخوں کو..''

جب میں نے اُسے اپنے آئندہ سفر کی تاریخوں کے بارے میں بتایا تو مادام کی دودھیا رنگت میں تأسف کی ایک سوگواری گھلی.. ''اُن دنوں تو ہم ہسپانیہ میں ہوں گی، تم قدرے تاخیر کر لو تو میں وہاں ہوں گی..''

''اور آپ کے خاوند بھی..''

''میں اب بھی اُس کی محبت میں مبتلا ہوں اور وہ حسد کرنے والوں میں سے نہیں ہے۔''

دوپہر کا کھانا ہم نے ایک ایسے ریستوران میں کھایا جہاں نصیب والوں کو ہی ایک میز عطا کی جاتی ہے اور وہاں جتنے بھی لوگ تھے، وہ کن اکھیوں سے ہم تینوں کی جانب متوجہ ہوتے تھے.. کہ ان دو خواتین نے کس غیر ملکی لڑکے کو گھیرا ہوا ہے... ازاں بعد ہم نے باقی ماندہ برسلز میں جو کچھ بھی قابل دید بتایا جاتا ہے، وہ دید کیا اگرچہ قابل بھی نہ تھا، وہ دن تمام ہوا اور شب کا آغاز ہوا تو ہم فلیٹ کو لوٹے جہاں کیوبن بی بی سفارت خانے سے واپس آ کر نہا دھو کر ہماری منتظر تھی.. اُس نے جین اور بلاؤز بدل لیے تھے لیکن وہسکی کی بوتل وہی تھی.. یہ یقیناً تیسری یا چوتھی بوتل تھی لیکن برانڈ وہی تھا اور جین کی جیب میں جکڑے جانے کا انداز وہی تھا.. وہ مسلسل اک حالت خمار میں رہتی تھی لیکن اُس پر بے خودی کا غلبہ وغیرہ نہ ہوتا

آپس میں کچھ مذاکرات کیے اور پھر مادام کہنے لگیں ''ہم پرسوں ہسپانیہ کے لیے روانہ ہوں گی..تم ہمارے لیے کچھ بوجھ نہیں ہو..اگر تم پسند کرو تو تب تک یہیں ٹھہر سکتے ہو..اگر تمہارا پہلے سے کوئی طے شدہ شیڈیول نہیں ہے تو..''

میں نے اس فلیٹ کی مالکہ کیوبن بی بی کی جانب دیکھا..وہ نیک پروین ناشتے سے فارغ ہو کر وہسکی کی زرد سرسوں رنگت میں کسی حد تک ڈوب چکی تھی، اُس نے کندھے اچکائے یعنی مجھے کچھ اعتراض نہیں..''نہیں میرا کوئی شیڈیول نہیں..خانہ بدوشوں کا کوئی بھی طے شدہ سفری منصوبہ نہیں ہوتا..لیکن..''

''تم ہمارے لیے کچھ بوجھ نہیں ہو..''

فراخ ماتھے والی نے اپنے بکری بال اپنے ماتھے سے سمیٹے..وہ سمٹے اور پھر بکھر گئے..''ہاں..کیوں نہیں..''

کیوبن خاتون نے پھر کندھے اچکائے اور کہا''اگر تم لونگ روم میں سو سکتے ہو تو..ٹھہرے رہو..تم بے شک ایک کم سن لڑکے ہو لیکن تمہاری موجودگی ہم تینوں کو خوشی دیتی ہے..''

میں نے اپنا بندھا ہوا سلیپنگ بیگ کھول دیا..

کیوبن خاتون تو سفارت کاری کے فرائض ادا کرنے کے لیے ناشتے کے بعد رخصت ہوگئی اور وہ دونوں مجھے اپنی فوکس واگن میں برسلز میں لیے لیے پھریں..اس شہر کی عمارتیں اور کوچۂ و بازار یہ طے نہ کر سکے تھے کہ وہ پیرس کے اطوار اپنائیں یا لنڈن کے انداز اختیار کریں..کہیں کہیں کچھ خوشنمائی تھی ورنہ اُن دونوں کی رفاقت کے باوجود برسلز ایک بور شہر تھا..

جیسے ہر یورپی بڑے شہر کا کوئی نہ کوئی امتیازی نشان کوئی شناخت ہوتی ہے..پیرس کا آئفل ٹاور..لنڈن کا بگ بین، روم کا کلوسیم، فلارنس کا ڈومو، کوپن ہیگن کی لٹل مرمیڈ وغیرہ تو آپ جانتے ہیں کہ برسلز کا فخریہ امتیازی نشان کیا ہے؟..ایک پیشاب کرتا ہوا بچہ جو اپنے نازک مقام کو تھامے ہوئے دھار ہی مار رہا ہے..اور یہ دھاریں ایک فوارے کی صورت میں پانی خارج کرتی ہیں، اب آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جس شہر کی شناخت ایسی ہو وہ شہر کیسا ہوگا..یعنی ایک بچہ کھلے عام پیشاب کر رہا ہے..

ہمارے ہاں چونکہ ہر چار دیواری، ہر باڑھ اور ہر دیوار صرف اس لیے بنائی جاتی ہے کہ خلق خدا کھلے عام اُس کے ساتھ سر جوڑ کر اپنے آپ کو فارغ کر سکے تو اکثر اوقات ان دیواروں پر کچھ انتباہ، کچھ

یورپ کے ملکوں کی خاک چھانتا، ایک ایسا آوارہ گرد تھا جس کے اندر گھر کی اداسی گھر کر چکی تھی تو ان تینوں کی رفاقت اور محبت نے اُس اداسی کو زائل کر دیا.. ہچ ہائکنگ کے ذریعے شاہراہوں پر کھڑے ہو کر لفٹ حاصل کر کے سفر کرنے میں جہاں اَن گنت صعوبتیں اور اذیتیں تھیں وہاں کچھ غیر متوقع راحتیں بھی تھیں.. یہ ابھی کل کی بات تھی جب میں آرنہم کے قصبے کے باہر ایک گمشدہ بچے کی مانند بے آسرا کھڑا تھا اور آج کی شب.. ایک مرصّع، منقّش بام و در والے شاندار فلیٹ میں فراخ ماتھے اور بھرے بدن کی لڑکی ہے.. کیوبا کی ایک سفارتکار ہے جس کی آنکھوں کی سیاہی میں سرخی گھلتی ہے اور ایک مادام ہے جس کے تراشے ہوئے نازک لب جب کھلتے ہیں تو گویا دل کی سلطنت پر ڈاکہ ڈالتے ہیں اور وہ تینوں اگرچہ آپس میں فرانسیسی بولتی ہیں لیکن اُن کے ہر بول میں میرے لیے ایک بے وجہ اُلفت ہے.. تو یہ سب کرشمے صرف اس لیے ظہور میں آئے کہ میں نے ہچ ہائکنگ کا طریقہ سفر اختیار کیا تھا...

مادام نے ہمیں خبر کی کہ وہ آج شب ایک خصوصی فرانسیسی ڈش ہمارے لیے تیار کریں گی اور جب ہم نے اُس خصوصی ڈش کو چکھا تو معلوم ہو گیا کہ مادام نے اپنی زندگی میں پہلی بار کسی کچن میں قدم رکھا ہے۔ پنیر، نُوڈلز اور چکن کے قتلوں کا کوئی ملغوبہ سا تھا اور سب لوگوں نے پہلے اس خوراک کی اپنی مسکراہٹوں پر ضبط کرتے توصیف کی اور پھر مادام کی کھانا تیار کرنے کی خفیہ صلاحیتوں کا خوب مذاق اڑایا اور مادام اپنے دودھیا چہرے کو سُرخ کرتی مان گئیں کہ ہاں.. مجھے کچن میں جانے کا کچھ تجربہ نہیں کہ ایک الجیرین خادمہ اُن کے لیے خوراک تیار کرتی ہے..

اس دوران کیوبن بی بی نے ایک کپ بورڈ کھول کر اُس میں آراستہ کانچ کے سامان کی نمائش کی اور کہا کہ آپ سب سے کیا پردہ وہسکی کے سوا مجھے تو اور کوئی مشروب نہیں لبھاتا، یہ بھانت بھانت کی شرابیں اُن سفارتکاروں کے لیے ہیں جو میرے فلیٹ میں قدم رنجہ فرماتے رہتے ہیں۔ گداز اگرچہ موٹی رانوں والی نے اپنے لیے سرخ وائن پسند کی اور مادام نے بھی اُسی کی پسند اختیار کی..

شاید میرے پڑھنے والوں کے ذہن اس صورتِ حال سے بھٹکتے بدگمان ہوتے ہوں تو میں اُن کی تشویش کا ازالہ کرنے کی خاطر یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ان تینوں خواتین کی نیّت میں کچھ کھوٹ نہ تھا.. اور میری نیّت بھی ناتجربہ کاری کے باعث ابھی تک کھری تھی.. اگر میں انہیں پانچ دس برس بعد ملتا تو شاید یہ کھوٹی ہوتی.. اور اُس شب بھی جب میں اپنے سلیپنگ بیگ میں دراز ہوا تو دیر تک کروٹیں بدلتا رہا.. لاشعور کی رو اگرچہ میں کھرا تھا، مجھے بھٹکاتی رہی.. مادام تو کب کی منظر سے اوجھل ہو کر کہیں نیند میں

تھا..البتہ میرے حوالے سے وہ ان دونوں سے چُہلیں کرتی رہتی کہ اچھا تو آج تم اس بچے کو کہاں کہاں لیے پھریں اور کیا یہ تمہاری دست درازی سے محفوظ رہا وغیرہ..یہ محض میرا قیاس ہے کہ وہ اسی نوعیت کی چھیڑ چھاڑ کرتی تھی کیونکہ اُن کا آپس میں مکالمہ فرانسیسی میں ہی ہوتا تھا..بلکہ اُس کے فقرے اتنے معصوم نہ ہوتے تھے کہ بعض اوقات وہ میری جانب اپنی سیاہ مخمور آنکھوں سے تکتی مادام کو کچھ کہتی تو اُس کے دودھیا چہرے پر ایک سرخی کی شفق اترنے لگتی..

جب اُسے بتایا گیا کہ ہم نے آج پیشاب کرتا ننھا بچہ بھی دیکھا ہے تو اُس نے وہسکی کی بوتل جین کی جیب میں سے کھینچ کر پہلے تو یہ تعین کیا کہ اس میں زرد مشروب کتنا باقی ہے اور پھر ایک گھونٹ بھر کر کہنے لگی ''پورے بیلجیئم میں سیکس کی یہ واحد علامت ہے..ایسے سرد مزاج یورپی ملک میں کم از کم کچھ تو خارج ہو رہا ہے..جب کبھی میں بہت ہی فرسٹریٹ ہو جاتی ہوں تو اُس پر ایک نظر ڈال آتی ہوں چاہے وہ ایک بچہ ہے..''

میری سٹڈی کے کسی کپ بورڈ کے اندر مسّودوں اور پرانے خطوط کے انبار میں شاید وہ دو چار بلیک اینڈ وہائٹ تصویریں اب بھی موجود ہوں جن میں سے ایک میں اُس فلیٹ کے لِونگ روم کے ایک صوفے پر ایک چیک شرٹ اور نیلی بہت سفروں سے میلی ہو چکی جین میں مسکرانے کی کوشش کرتا میں ہوں..برابر میں وہ دریدہ بدن چوڑے ماتھے والی لڑکی مسکرا رہی ہے اور اُس کے مختصر سکرٹ میں اُس کی رانیں پھنسی ہوئی لگتی ہیں، ساتھ والے صوفے پر کیوبن براجمان ہے اور اس کے ہاتھ میں ایک سگرٹ سلگتا ہے اور اُس کی جین کی جیب میں سے ایک ڈھکن جھانکتا ہے..یہ تصویر مادام نے اتاری تھی..ایک اور وقت کے ہاتھوں بھوری اور خستہ ہوتی تصویر ہے، میں ایک سپورٹس ٹی شرٹ میں اپنے دانتوں کی نمائش کر رہا ہوں اور میرے گھنے گھنگھریالے بال اُلجھے ہوئے ہیں، برابر میں مادام اپنے مختصر سراپے میں ایک ایسے سفید کنول کی مانند دل کش نظر آ رہی ہیں جس نے سیاہ چشمہ پہن رکھا ہو لیکن..یہ تصویر دو روز بعد برسلز کی کیمپنگ سائٹ میں اتری تھی اور دراصل ایک جدائی کی تصویر ہے جس کا بیان بعد میں آئے گا..

وہ شب گہری ہو رہی تھی اور آپ یوں جانئے کہ تب تک میں اُن کے لیے ایک لے پالک بچّہ ہو چکا تھا جسے ہر کوئی گود میں لینا چاہ رہا تھا..جیسے مدتوں سے ہمارا یارانہ ہو..نہ تو وہ نوجوان لڑکیاں تھیں اور نہ ہی میں کوئی لڑکا وغیرہ تھا..ہم سب دوست دوست ہو گئے..اور میں..افغانستان، ایران، تُرکی اور پھر

دیا جاتا ہے تو کسی بین الاقوامی نمائش میں پاکستان کے سٹال پر کیا کیا نمائش پر ہوگا..آپ خود ہی تصور کیجیے ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی..

اُس شب ایک اور پارٹی ہوئی اگرچہ یہ ایک معمول تھا مگر مجھ ایسے معصوم کے لیے وہ ایک پارٹی ہی تھی..حسب معمول مادام نے بلاؤز کی بانہیں چڑھا کر اُن کے دودھیا پن کو کچن میں جلتے چولہے کی آگ کی قربت میں لے جا کر اس دودھ میں کچھ حدت پیدا کر دی اور ہمارے لیے فرانسیسی کوسین کی ایک اور شاہکار خوراک تخلیق کر ڈالی..سب سے زیادہ داد میں نے دی کہ اُس میں دھواں لگے کچھ بینگن تھے، سلاد کے کچھ پتے تھے جن میں جانے کونسا مصالحہ تھا اور اُس میں سے جو مہک اٹھتی تھی تو معدے کو ایک سومو پہلوان کی مانند خوب جھنجھوڑ کر اُسے حلق سے باہر آنے پر مجبور کر دیتی تھی..

''یُو لائک اِت؟'' مادام نے پراشتیاق ہو کر پوچھا..

''آئی لَو اِٹ..''

اس نے اپنی ہانڈی میں ڈوئی چلا کر اُسے لبریز کیا اور کہنے لگی ''پھر تم کُچھ اور کھاؤ..میں نے زندگی میں پہلی بار یہ ڈش تیار کی ہے۔''

اور حسب معمول فراخ ماتھے والی نے اپنے لیے سرخ وائن پسند کی، مادام نے بھی اسی کو ترجیح دی..کیوبن اپنی سہیلی وہسکی سے وفادار رہی..یہ نہ صرف میری اس فلیٹ میں بلکہ ان تینوں کی بھی برسلز میں آخری شب تھی، اگلی سویر مجھے اپنا رُک سیک اٹھا کر کیمپنگ کا رُخ کرنا تھا اور اُنہوں نے ہسپانیہ کی جانب اپنے چہرے کر لینے تھے..تب اُنہوں نے مجھے وہ پیشکش کی جس کے بارے میں وہ یقیناً دن بھر ایک دوسرے کے ساتھ مشورہ کرتی اس نتیجے پر پہنچی تھیں..

یہ مادام تھیں جنہوں نے کچھ انگریزی، بیشتر فرانسیسی اور اکثر کندھے سکیڑ کر، ہاتھوں سے مفہوم سجاتے ہوئے کہا..''تم جانتے ہو کہ ہم تینوں ایک سفری گھریا کاروان میں سوار ہو کر ہسپانیہ کے ایک ساحلی قصبے میں گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے جا رہی ہیں اور ہمارے کاروان میں ایک چوتھے شخص کی گنجائش ہے..تم ہمارے ساتھ چلے آؤ..یہ ضروری نہیں کہ وہاں پہنچ کر تم ہمہ وقت ہماری رفاقت میں رہو..تم اپنے من کی موج میں جو چاہو وہ کرتے پھرو اور ہم وہ کریں گی جس کے بارے میں ہم نے سارا سال سوچا ہے..کیا خیال ہے؟''

''اور آپ نے سارا سال کیا سوچا ہے؟''

روپوش ہو چکی تھیں لیکن کیوبن اور فراخ ماتھے والی بہت دیر تک میرے آس پاس کہیں آتی جاتی رہیں..

شب بھر انہی کا چرچا رہا..

کُچھ آہٹیں تھیں جو میرے آس پاس تھیں..

سرخ وائن اور سگار کے دھویں کی مہک تھی..

اگلے روز ہم برسلز میں منعقد ہونے والی جس کی دنیا بھر میں دھوم تھی، بین الاقوامی نمائش میں گئے جہاں اٹومیئم کا شاندار وجود ابھرتا تھا.. نئے سائنسی زمانوں کی ایک شناخت.. ایٹم کے ذروں کی شکل میں ایستادہ سنہری رنگ کے گولے.. اور اس اٹومیئم کے اندر ایک لفٹ تھی جو ہمیں اس کی چوٹی پر لے گئی.. وہاں ایک ریستوران تھا جو گھومتا چلا جاتا تھا جہاں ہم نے دوپہر کا بہت ہی مہنگا کھانا کھایا اگرچہ اس کی مہنگائی مجھ پر اثر انداز نہ ہوئی.. مادام نے ایک مختصر سے بٹوے میں سے کُچھ نوٹ برآمد کر کے ادائیگی کی..

وہاں دنیا بھر کے ملکوں کی پیولینز میں سب سے شاندار اور تعمیراتی ذوق جمال کی حامل امریکی پیولین تھی جس کے اندر ایک بڑے تالاب کے کناروں پر.. اور اُس تالاب میں کنول کے پُھول کِھلے ہوئے تھے.. اُس کے کناروں پر امریکی مصنوعات کی تشہیر کرتی ہوئی دراز قامت اور سڈول بدن ماڈل لڑکیاں تھیں جو ایک شاہانہ انداز میں کیٹ واک کرتی تھیں۔

پاکستانی پیولین بھی بہت نمایاں اور ممتاز تھی.. وہاں نہ صرف سندھ، پنجاب اور سرحد کی ثقافت اور دستکاریوں کی نمائش تھی، گندھارا کے سحر انگیز مجسمے تھے بلکہ مشرقی پاکستان کے ملاح بھی ٹیگور کے گیت گاتے تھے.. اور وہ تینوں اس پیولین کو دیکھ کر اتنی متاثر ہوئیں کہ مادام نے کہا.. ''مجھے نہیں علم تھا کہ تمہارا ثقافتی اور تاریخی ورثہ اتنا قدیم اور شاندار ہے..''

اور اس اعتراف سے میں نے ایک اصیل مُرغ کی مانند سینہ پھیلا دیا کہ یہ میں ہوں اور یہ میرا پاکستان ہے..

یہ تقریباً چالیس برس پیشتر کے دھندلکوں میں اتر کر جو قصے بیان کر رہا ہوں تو انہیں سپردِ کاغذ کرتے ہوئے اس لمحۂ موجود میں مجھے خیال آتا ہے کہ ان دنوں پاکستان جس مذہبی تنگ نظری کے تاریک کنویں میں گرتا چلا جاتا تھا تو اگر ان کا ایجاد کردہ ایک نظام، اگر پاکستان موجود رہا تو، رائج کر

ہمارے ساتھ نہیں آ رہے تو یہ تمہارے لیے اچھا ہوا. تمہارے بارے میں مادام کے ارادے کچھ اچھے نہ تھے.. تم اسے سہار نہ سکتے..''

مادام بھی مئے ارغوانی کی گونہ بے خودی میں تھیں، اُنہوں نے فرانسیسی میں ''بکواس نہ کرو'' کی نوعیت کا کوئی فقرہ کہا اور پھر اپنے ترشے ہوئے لب سکیڑ کر بولیں ''تم تو کہہ رہی تھیں کہ تم اس بچے کو کچا کھا سکتی ہو..''

''وہ تو شاید میں کھا چکی..''

مجھے کچھ تشویش سی ہوئی کہ اگر میں کچا کھایا جا چکا ہوں تو مجھے خبر کیوں نہیں ہوئی.. شاید بے خبری میں ہی مجھے کھا لیا گیا ہے..

فراخ ماتھے اور بکری بالوں والی نے اپنے بکھرے بال سمیٹے اور سگرٹ کا ایک طویل دھواں دار کش کھینچتے ہوئے بولی ''دراصل ارادے میرے تھے، تم دونوں بوڑھی عورتیں کیوں حائل ہو گئیں..''

اُس لمحے مجھے احساس ہوا کہ آخر میں نے اب تک اس موٹی آنکھوں اور رانوں والی لڑکی کو جس کی آنکھیں اگرچہ بے کشش تھیں لیکن بڑی بڑی تھیں کیوں اپنی توجہ کے قابل نہ سمجھا، اُس سے غافل رہا..

اب اس بیانیے سے شاید یہ تاثر ابھرتا ہے کہ وہ تینوں خواتین میری کچی عصمت کے درپے اپنی شہوانی خواہشوں کے سیراب ہونے کی تمنا میں مری جاتی تھیں.. ایسا ہرگز نہیں تھا.. جو کچھ مغرب میں گزرتی ہے اُسے اگر اردو میں بیان کیا جائے تو سب لوگ شک شبے میں مبتلا ہو جاتے ہیں جب کہ انگریزی یا فرانسیسی میں یہ کسی ایک شب کی غیر سنجیدہ چھیڑ چھاڑ ہوتی ہے جو ہوتی ہی رہتی ہے..

اگلی صبح وہ تینوں مجھے برسلز کی تقریباً ویران کیمپنگ میں چھوڑنے کے لیے آئیں اور ہم مشرق کے باسی سمجھتے تھے کہ جذبات کے دھارے صرف ہمارے بدنوں سے پھوٹتے ہیں اور یہ مغرب بلکہ کیوبا والے بھی کیا جانیں کہ جدائی کا غم کیا ہوتا ہے.. وہ تینوں مجھ سے رخصت ہوتے.. الوداع کہتے، یُوں پھوٹ پھوٹ کر روئیں کہ میں بھی آبدیدہ ہو گیا..

اُنہوں نے صرف رونے دھونے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ مجھ سے لپٹ کر میرے رخساروں پر متعدد بوسے ثبت کیے.. ان میں مادام نے اپنا سیاہ چشمہ اُتار کر جن بوسوں کا اہتمام کیا وہ سب سے گرم اور گیلے تھے..

اس سوال کا جواب کیوبن نے اپنا سگار پھونکتے ہوئے دیا ''ہم تینوں شاید تم سے برس دو برس سینئر ہیں۔''

اس بیان پر فراخ ماتھے والی نے فوری طور پر احتجاج کیا کہ نہیں میں تو نہیں ہوں.. میں تو ابھی یونیورسٹی میں پڑھتی ہوں..

''چلو میں اپنا بیان واپس لے کر اُس میں ترمیم کرتی ہوں.. کم از کم میں اور مادام تو اس سے تھوڑی بہت سینئر ہیں.. اور پاکستانی ہم نے سارا سال کیا سوچا ہے.. ہسپانوی لڑکے.. گرم اور پُر جوش۔''

اس بار مادام نے احتجاج کیا کہ کچھ تو حیا کرو کہ میں شادی شدہ ہوں اور ایک وفادار بیوی ہوں.. میں تو سارا عرصہ سورج کے ساحلوں کی ریت پر اپنے سوئمنگ سُوٹ میں اوندھی پڑی دھوپ کو اپنے بدن میں جذب کرتی رہوں گی، تم دونوں بے شک شکار کرتی رہنا..

فراخ ماتھے والی ایک خاص انداز میں مسکرائی ''ہاں پچھلے برس جب ہم تینوں اٹلی گئی تھیں تو تم کیپری کے جزیرے میں یہی کچھ کرتی تھیں..''

''شٹ اپ'' مادام نے لجاتے ہوئے میری جانب دیکھا.. ''یہ جھوٹ بولتی ہے... میں واقعی وہاں دھوپ سینکتی رہی تھی، یہ دونوں لفنگیاں ہیں ان کی باتوں پر یقین نہ کرو۔'' ازاں بعد وہ تینوں فرانسیسی میں چلی گئیں اور پچھلے برس کی گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران اٹلی میں جو سانحے ہوئے تھے اُن کے بارے میں چُہلیں کرنے لگیں.. اگرچہ میرے جیسے خانہ بدوش کا کوئی طے شدہ منشور نہیں ہوتا کہ جس جہان کی جانب کوئی لفٹ مل گئی اُدھر کو چل دیئے لیکن.. مجھے بہر طور لنڈن پہنچنا تھا اور میں نے کرسٹین سے وعدہ کر رکھا تھا کہ میں وہاں فلاں تاریخ کو موجود ہوں گا اور پھر مجھے پیرس کے لیے رختِ سفر باندھنا تھا اور وہاں سے مجھے خواہشوں اور سرابوں کی اُس منزل تک پہنچنا تھا جسے اُندلس کہتے ہیں، مسجد قرطبہ کے ہجوم نخیل ستونوں نے اور قصر الحمرا کے سُرخ ایوانوں نے مجھے ایک ڈور میں باندھ رکھا تھا اور میں ایک ایسی پُتلی تھا جس کی ڈور.. جس کے دھاگے مسجد قرطبہ اور الحمرا کے ستون اور ایوان ہلاتے تھے.. مجھے بہر طور اُن کے اشاروں پر رقص کرنا تھا.. میں بے اختیار، بے بس تھا.. مجھے مناسب بہانے بنا کر اُن کی محبتوں کے سامنے سر جھکاتے شرمندہ ہوتے انکار کرنا پڑا.. میرے اس انکار پر نہ تو وہ رنجیدہ ہوئیں اور نہ ہی اصرار کیا، صرف اتنا کہا.. ''ہم تمہیں وہاں یاد کریں گی..''

یہ معاملہ طے ہو گیا تو یہ کیوبن تھی جس کی خمار آلود مسکراہٹ اُس کے قابو میں نہ آتی تھی.. ''تم

''بلجیئم گٹ ہیرے..اور ہم برسلز میں تھے''

یورپ میں جہاں کہیں جتنے بھی پاکستانی پائے جاتے ہیں اُن میں سے بیشتر کچھ پراسرار سے ہوتے ہیں اور وہ آسانی سے کھلتے نہیں، کہ اُن کے اندر جانے کیسے کیسے غیر قانونی اور غیر اخلاقی بھید پنہاں ہوتے ہیں جنہیں عبور کر کے وہ اپنے اس خوابوں کے جزیرے پر پہنچتے ہیں..کسی نے سیاسی پناہ حاصل کی، کوئی شیعہ اور کوئی احمدی ہوگیا..کاغذی شادیاں تو نہایت دل پسند تقریباً قانونی ذریعہ ہیں کسی بھی ملک کی شہریت حاصل کرنے کا..ان میں سے بیشتر خواتین اس معاملے میں پروفیشنل ہوتی ہیں کہ ہاں شادی ہوگی لیکن ہم تم ایک کمرے میں بند نہ ہوں گے، اُتنا عرصہ کاغذی زنجیر میں بندھے رہیں گے جتنے عرصے میں تمہیں شہریت مل جائے گی تو اس معاہدے کی اتنے ہزار ڈالر فیس ہوگی، پچاس فیصد ایڈوانس اور بقیہ رقم شہریت مل جانے پر..قابل فہم طور پر ایسی بیشتر خواتین ادھیڑ عمر اور بھدی ہوتی ہیں، زندگی میں اتنے پاپڑ بیل چکی ہوتی ہیں کہ پاپڑ منڈی ہو چکی ہوتی ہیں..''پاپڑ'' کی بجائے آپ اس بیانیے میں ''پاپ'' کا متبادل بھی اختیار کر سکتے ہیں اور یُوں اس کے وسعت بیان میں قابل قدر اضافہ ہوسکتا ہے..میرے علم میں چند ایسے کیسز بھی آئے ہیں کہ کاغذی خاتون زبانی کلامی معاہدے سے ہی مُکر گئی کہ میں تو تمہیں طلاق نہیں دوں گی، تمہارے ساتھ جیوں گی اور تمہیں لے کر مروں گی..اس لیے کہ شہریت کا طالب ایک رعنا جوان ہے اور خاتون پچاس ساٹھ کے پیٹے میں ہے اور اُس کے بقیہ بدن کے علاوہ پیٹ بھی پُھولے نہیں سماتا..ایسی حسینہ کو کوئی مقامی شادی تو درکنار آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے تو اُن کی تو لاٹری نکل آئی..ٹیلی ویژن پر اداکاری کے زمانوں میں ایک اچھی بھلی شکل کی خاتون ڈراموں میں برے بھلے چھوٹے موٹے کردار ادا کیا کرتی تھیں اور ہر دوسرے شخص سے شادی کر بیٹھتی تھیں جس کے نتیجے میں متعدد بچے بھی ایک تسلسل میں چلے آئے..یکدم خبر ملی کہ وہ شاید کینیڈا اسدھار چکی ہیں اور وہاں انہوں نے اپنے آپ کو احمدی ڈکلیئر کر کے سیاسی پناہ طلب کر لی ہے..اُن کے پورے خاندان

اس الوداعی بوس وکنار سے فارغ ہو کر..افسردہ اور آبدیدہ ہو کر..جب کہ اُن کی فوکس واگن کیمپنگ سائٹ کی ویرانی میں دھول اڑاتی رخصت ہو رہی تھی..جب میں اپنا خیمہ نصب کر رہا تھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ کچھ فاصلے پر آرنہم کے قصبے والا امریکی نیل ششدر اور بُت بنا کھڑا ہے، مجھے تکتا جاتا ہے اور پھر کہتا ہے ''چنانچہ تم لڑکیوں کو پسند نہیں کرتے..''

شیر خان ایک ایسا شیر تھا جو مجھے اُس شہر کی جانب لیے جاتا تھا جہاں چالیس برس پیشتر تین مہربان لڑکیوں نے مجھے اپنی گود میں لے لیا تھا..

کیا جانئے وہ اب..جب کہ میں ایک کچا بچہ نہ تھا، پک چکا ایسا ثمر تھا جو شاخ سے جُدا ہونے کو تھا تو کیا جانیے وہ تینوں اب کہاں ہوں گی..اگر اب تک ہوں گی تو پھر یقیناً نانیاں اور دادیاں ہو چکی ہوں گی..مجھے گمان نہیں، یقین ہے کہ وہ فراموش کر چکی ہوں گی کہ کبھی گزر چکے زمانوں میں اُن میں سے دو نے سڑک کے کنارے بے آسرا کھڑے ایک پاکستانی نوجوان کو اپنی فوکس واگن میں لفٹ دی تھی اور پھر اُسے اپنے ہمراہ ہسپانیہ کے سفر پر جانے کی پیشکش کی تھی..اور وہ ایسا سر پھرا تھا کہ انکاری ہو گیا تھا..

ہم اُسی برسلز کی جانب دھاڑتے ہوئے جاتے تھے..

شیر خان کی شیریت پورے عروج پر تھی..

♦♦.....♦♦.....♦♦

اور پاکستانی زیادہ..

ضیاء الحق کے عہد میں تو یورپ پر ایسے لوگوں کی یلغار شروع ہوگئی جو سب کے سب پیپلز پارٹی کے پرچم اٹھائے ہوئے تھے کہ ہمارے لیڈر کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا.. ہر چوک میں درّے مارے جا رہے ہیں اور ہر ایک کے پاس پیپلز پارٹی کی رکنیت کا کارڈ اُس کے جیالے ہونے کی گواہی دیتا تھا اور ان میں مذہبی جماعتوں کے باریش کارکن بھی شامل تھے..لیکن سیاسی پناہ کے یہ بہانے ضیاء الحق کے سیاہ دور سے پیشتر بھٹو کے عہد میں بھی عروج پر تھے..بھٹو کا عتاب عبدالولی خان کی عوامی نیشنل پارٹی پر حیدرآباد ٹریبونل کی صورت میں نازل ہوا تو یورپ میں داخل ہونے والا، قانونی یا غیر قانونی طور پر کسی نہ کسی طرح داخل ہو جانے والا ہر پاکستانی خان عبدالغفار خان کا خدائی خدمتگار ہو گیا..کہ جناب ہم پر بہت ظلم ہو رہا ہے..ہم وہاں اپنے باچے خان کی مانند سُرخ ٹوپی بھی نہیں پہن سکتے.. پناہ دیجیے.. چنانچہ ہزاروں پاکستانی جرمنی کی پناہ حاصل کر کے آسودہ ہو گئے..یہ عرض کرنے کی کچھ حاجت نہیں کہ ان میں سے بیشتر قطعی طور پر لاعلم تھے کہ یہ باچا خان کون ہے اور نیشنل عوامی پارٹی کیا ہے..اُنہی دنوں ذوالفقار علی بھٹو یورپ کے مختلف ممالک کے سرکاری دورے پر نکلے..اُن کے ہمراہ میرا سب سے قدیم، وفا کرنے والا اور مجھے دنیا بھر سے پیارا، میرے بچپن کا یار، خاور زمان بھی تھا..وہ آئی جی سندھ اور ڈی جی ایف آئی اے کے علاوہ آسٹریلیا میں ہمارا ایک معتبر سفیر بھی رہا..تو اُس نے اگرچہ وہ بھٹو کا زیادہ مداح نہ تھا مجھے ہیمبرگ کی ایک پریس کانفرنس کا قصہ سنایا جہاں جرمن پریس کے نمائندے جو پاکستانیوں کی یوں جوق در جوق جرمنی میں آمد اور سیاسی پناہ طلب کرنے سے عاجز آ چکے تھے، موجود تھے اور انہوں نے سیاسی سوالوں کے درمیان میں سے یکدم بھٹو سے پوچھا کہ..جناب وزیراعظم آپ دعویٰ کرتے ہیں کہ پاکستان میں مکمل جمہوریت ہے، ہر شخص کو اپنے سیاسی عقائد کے مطابق زندگی بسر کرنے کی اجازت ہے لیکن..جرمنی میں ایسے ہزاروں پاکستانی آ رہے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ پاکستان میں اُن کی نیشنل عوامی پارٹی پر بہت ظلم ہو رہا ہے تو ہم آپ کے بیان پر یقین کریں یا ان پاکستانیوں کے بیان پر..

خاور زمان کا کہنا تھا کہ یہ ایک نہایت پیچیدہ اور پُرخطر سوال تھا..اگر بھٹو مشتعل ہو کر یہ کہہ دیتا کہ ان لوگوں پر قطعی طور پر کوئی ظلم نہیں ہوا، یہ محض جرمنی کی شہریت حاصل کرنے کی خاطر میری حکومت کو بدنام کرنے کے لیے جھوٹ بول رہے ہیں تو پاکستان کے وزیراعظم کے اس بیان کو بنیاد بنا کر جرمن حکومت ان پاکستانیوں کو ملک بدر کر دیتی..اور وہ یہ اعتراف بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ہاں..میں نے نیشنل

نے پاکستان میں غدر مچا دیا کہ صاحبو ہم تو نارمل قسم کے مسلمان ہیں اور ہمارے ہاں تو دور دور تک کوئی احمدی یا مرزائی نہیں پایا جاتا.. اس پر اُس خاتون نے وہاں بیان دیا کہ دراصل میرا خاندان اپنی جان بچانے کی خاطر ایسے بیان دے رہا ہے، اُن کی نہ سُنو.. اسی طور ایک نہایت کٹر سُنّی حضرت نے کینیڈا میں کسی نہ کسی طرح داخل ہو کر دوہائی مچا دی کہ جناب میں تو بمشکل پاکستان سے جان بچا کر فرار ہوا ہوں کہ وہاں روزانہ نہ صرف امام بارگاہوں پر بلکہ میرے گھر پر بھی حملے ہوتے تھے.. چونکہ کینیڈا کی سرکار اپنے تئیں سیانی ہو چکی تھی اور جان چکی تھی کہ یہ پاکستانی حضرات دروغ گوئی کے بادشاہ ہیں۔ چنانچہ اُن کے کیس کی سماعت کے لیے ایک ایسی کمیٹی تشکیل دی گئی جس میں حکومت کے ایک اہلکار کے علاوہ ایک جیّد شیعہ عالم بھی شامل تھے.. سماعت کے بعد شیعہ عالم نے آبدیدہ ہو کر کہا کہ ایسا جانثار اور اہل بیت کا شیدائی شیعہ شخص میں نے آج تک نہیں دیکھا، اسے فوری طور پر کینیڈا میں پناہ دی جائے.. اُن حضرت نے مجھے ذاتی طور پر بتایا کہ بھائی جان دراصل میں نے پورے تین ماہ شیعہ عقائد کا مطالعہ کیا، اُن کی مذہبی کتابوں کو حفظ کیا اور انٹرویو میں جا بیٹھا.. بس اتنی سی بات ہے ورنہ میں تو سپاہ صحابہ کے لیے اب بھی چندہ روانہ کرتا ہوں..

سیاسی پناہ کے بھی بہت سے قصّے ہیں..

جن دنوں جرمنی دو حصّوں میں تقسیم شدہ تھا تو مغربی جرمنی میں ایک ایسا قانون رائج تھا جس کے تحت مشرقی جرمنی سے سرحد پار کر کے مغربی جرمنی میں داخل ہونے والے کسی بھی شخص کو فوری طور پر ایک فلیٹ مہیا کیا جاتا تھا اور اُس مناسب وظیفہ دیا جا سکتا تھا تا کہ وہ اس دوران اپنے آپ کو مغربی جرمنی میں مستحکم کر سکے.. یہ بنیادی طور پر ایک پروپیگنڈا ہتھیار تھا تا کہ ثابت کیا جا سکے کہ مشرقی جرمنی کے کمیونسٹ نظام سے عاجز آئے ہوئے لوگ دھڑا دھڑ مغربی جرمنی کی سرمایہ دارانہ معیشت کی پناہ میں چلے آ رہے ہیں.. یہ کیسے ممکن تھا کہ پاکستانیوں کو اس لُوپ ہول، اس امکان کی خبر نہ ہوتی.. وہ کسی نہ کسی طرح پولینڈ کے راستے یا بائی ایئر مشرقی جرمنی میں لینڈ کر جاتے، سرحد پار کر کے مغربی جرمنی میں داخل ہو کر اس خصوصی قانون کے تحت پناہ کے طالب ہو جاتے.. اب اس قانون میں تو صرف یہ درج تھا کہ مشرقی جرمنی سے مغربی جرمنی میں داخل ہونے والے ہر شخص کو یہ سہولت مہیا کر دی جائے گی.. ایک فلیٹ اور ماہانہ وظیفہ اور ظاہر ہے شہریت لیکن یہ تو کہیں درج نہ تھا کہ وہ شخص جرمن ہو... مغربی جرمنی والے بہت پچھتائے کہ اس قانونی سہولت سے استفادہ کرنے والے اُن کے ہم وطن جرمن کم تھے

''جی تارڑ صاحب..''

''آپ اپنی کار کی رفتار اس حد تک بڑھا دو کہ میری بیگم کے دماغ سے یہ بیلجئم کٹ ہیرے وغیرہ فوری طور پر خارج ہو جائیں..''

برسلز کا آغاز ہو گیا اور یہ شہر ابھی تک طے نہ کر سکا تھا کہ اُس کی شناخت سوائے ایک دھاریں مارتے بچے کے اور کیا ہے.. کبھی اُس کے در و دیوار پر پیرس کے فن تعمیر کے عکس جھلکتے، کبھی وہ انگریز ہو جاتا، کہیں ہالینڈ کا شائبہ ہوتا اور کہیں شائبہ ہی شائبہ ہوتا.. شاید اُس شب ہم اس کے نسبتاً خاموش اور نیم تاریک حصّوں میں سے گزرے اور شاید یہ میرا برسلز کے بارے میں تعصّب تھا کہ یہ یورپ کا بورترین صدر مقام ہے.. اور میں ایک بنیاد پرست کی مانند اپنے اس عقیدے سے ٹس سے مس نہ ہوتا تھا..

اور یہ بورترین ہرگز اس لیے نہ تھا کہ گئے زمانوں میں جب ادھر سے گزر ہوا تو میرے ہمراہ تین لڑکیاں تھیں اور ان زمانوں میں.. صرف ایک.. اور وہ بھی بیگم تھی..

وہ برسلز کی کوئی اداس سی گلی تھی جو اُس شب میں جلتی کم تھی اور بجھتی زیادہ تھی، کوئی ایسا کُوچہ تھا جو غالب کے کوچہ بلّی ماراں کی مانند کچھ نیم تاریک سا تھا اور وہاں بالآخر شیر خان کی مار دھاڑ یکدم تھم گئی.. ہمارا خیال تھا کہ پاکستان سے براستہ ہالینڈ آنے والے ہم مہمانوں کے لیے وہاں کچھ پھریرے لہرا رہے ہوں گے، خوش آمدیدی بینر آویزاں ہوں گے اور کچھ شادیانے وغیرہ بجائے جا رہے ہوں گے لیکن ہم کار سے باہر آئے تو وہاں کچھ بھی لہرا نہیں رہا تھا سوائے ہمارے میزبان عمران ثاقب کے جو موبائل کان سے لگائے مختلف زبانوں میں ظاہر ہے مختلف لوگوں سے مسلسل رابطے میں تھا.. وہ ہمیں پوری توجہ دینے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اُس کی توجہ بار بار بھٹکتی تھی کہ وہ اُس شب منعقد ہونے والے مشاعرے کے انتظامات میں مشغول تھا.. اس دوران دو چار لوگوں نے قدرے لاتعلقی سے ہمیں واجبی سا خوش آمدید کہا اور ان میں ایک راؤ صاحب تھے جن کی گھنی مونچھیں اکڑ کر اپنے راجپوت ہونے کا اعلان کرتی تھیں.. عمران ثاقب کافی حد تک خوش شکل گٹھے بدن کا ایک شخص تھا اور برسلز کی پریس کلب کا کرتا دھرتا تھا.. وہ کرتا بہت کچھ تھا لیکن سب سے زیادہ موبائل کو کان پر دھرتا تھا.. ہمیں پریس کلب کے ایک نیم روشن کمرے میں صوفوں پر بٹھا دیا گیا اور ہم اُن میں دھنس گئے کہ امتداد

عوامی پارٹی کے لیڈروں اور کارکنوں کو غداری کے الزام میں ایک کٹہرے میں کھڑا کر رکھا ہے..تو اُس نے لمحہ بھر کے لیے توقف کیا اور پھر اپنے سگار کا ایک کش لگا کر مسکراتے ہوئے بولا ''وَیل جنٹلمین..وین پاکستانیز آر اِن پاکستان، دے آر مائی پرابلم..اینڈ وین پاکستانیز آر اِن جرمنی دے آر یُور پرابلم..نیکسٹ کوسچین....''یعنی ''حضرات، جب پاکستانی پاکستان میں ہوتے ہیں تو وہ میرا مسئلہ ہوتے ہیں اور جب پاکستانی جرمنی میں ہوتے ہیں تو یہ آپ کا مسئلہ ہیں..اگلا سوال پوچھیے..''

یہ پاکستانی ایران اور طوران کے برف زاروں میں بھٹکتے، بے موت مرتے، کبھی سمندروں میں ڈوبتے..یہاں تک پہنچے تھے..حوصلے، عزم کی گویا داستانیں تھے..تو وہ..ان ملکوں کی شہریت حاصل کرنے کے باوجود، ایک عمر یہاں بسر کرنے کے باوجود اپنے ماضی کے بھید نہ کھولتے تھے کہ وہ کیسے یہاں آئے اور کب آئے..

شیر خان بھی ایک ایسا ہی لب بستہ بھید تھا..جو کُھلتا نہ تھا..وزیرستان سے یورپ تک آ جانے کا اسرار کُھلتا نہ تھا..

''تارڑ صاحب..ہم ہالینڈ سے جدا ہو کر بیلجئم میں داخل ہو چکے ہیں۔''سیفی صاحب، شیر خان کی مار دھاڑ ڈرائیونگ کے صدمے سے سنبھل کر اپنی عینک سنبھال چکے تھے..

نہ کوئی سرحد، نہ کوئی تفتیش، نہ پاسپورٹوں کی چیکنگ، پورا یورپ ایک اکائی ہو چکا تھا..

''بیگم..''میں نے میمونہ کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اُس نے حیرت انگیز طور پر مجھے رکھنے دیا، اُسے جھٹکا نہیں..''ہم بیلجئم میں ہیں۔''

وہ جو اس سفر کے دوران نیم غنودگی میں اونگھتی ہوئی یکدم ہوشیار ہو گئی ''ہیں؟ ہم واقعی بیلجئم میں ہیں..تو یہاں ہوتے ہیں بیلجئم کَٹ ہیرے..''

''بیگم..کیا تم نے بیلجئم میں داخل ہو کر کچھ زمینی، معاشرتی یا تعمیراتی ردو بدل محسوس کیا۔''میں نے فوراً موضوع بدلنے کی خاطر کہا..

''ہاں..یہ ہالینڈ کی نسبت کچھ غریب اور بے ترتیب لگ رہا ہے..لیکن یہاں بیلجئم کَٹ ہیرے تو ہوں گے..''

''شیر خان..''

خوابوں کی تعبیر ہے..معلوم ہوا کہ وہ بلتی بیگم اُسے فون پر فارسی زبان میں ڈانٹ رہی ہے..یعنی ثابت یہ ہوا کہ بیگم چاہے بلتستان کی ہو یا انگلستان کی..خاوند غریب کی قسمت میں صرف ڈانٹ ہوتی ہے..یقین نہ آئے تو فیض صاحب کے حال احوال ملاحظہ کر لیں..انگلستان کی ایلس بھی اُنہیں اکثر ڈانٹا کرتی تھیں..اور میری بیگم بلتستانی یا انگلستانی نہ ہونے کے باوجود..تھوڑا لکھے کو بُہتا سمجھیں..

♦♦.....♦♦.....♦♦

زمانہ اُن کے سر تھوں کی بلک پر تڑ اور ہو گئی ہے یہاں لوگوں سے مخصوص طور پر آئے ہوئے ایک رضا نامے کے مطابق تھے اور اُن کی ہوشگوار خصلت بیگم تھیں اور اس کے علاوہ کچھ اور تھا

ہم زوروں کی بوندا باندی میں تھرکنے لگی اور ہم ہالینڈ کے بس سے نکل کر جانے کہاں آ نکلے تھے جہاں کوئی ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتا تھا اور نہ ہی ہم جانتے تھے کہ یہاں سے کدھر جائیں گے۔ کیوں جائیں گے اور مرنے کی بھی نہ پڑا تو کدھر جائیں گے اور یہ سب کہاں پر ہو گا

اس دوران ایک درمیانہ قامت قدرے بھرکا ہوا شخص جس نے اپنے آپ کو پالے سے محفوظ رکھنے کی خاطر خوب ڈھکا ہوا تھا، سر پر ایک اونی ٹوپی اوڑھے داخل ہوا اور میں اُسے پہچان نہ سکا اگر وہ نہایت پر جوش انداز میں مجھ سے مخاطب ہو کر اپنی ٹوپی اتاری تو پھر وہ خود سا ہونے لگا یہ اعزاز حسن تھا جو اس محفل میں شرکت کی خاطر مخصوص طور پر لوزن سے آیا تھا ایک انقلابی دانشور، صحافی اور شاعر اور وہ بھی بالآخر سرمایہ دارانہ نظام کی عافیت میں پناہ لینے پر مجبور ہوا۔ ان دنوں وہ خاصہ خوش نکل ہوا کرتا تھا اُس کے بال اُس کی شخصیت کو نکھارتے تھے اور اُس کی مسکراہٹ دلآویز تھی اور اب وہ ایک لاچار لگتا بوڑھا تھا بیتے دنوں کی ایک پرچھائیں تھا۔ چونکہ میں اپنے آپ کو نہیں اُسے دیکھتا تھا اس لیے اس مغالطے میں مبتلا تھا کہ میں وہی ہوں جب کہ وہ وہ نہیں ہے اگر میں اپنے آپ کو دیکھتا تو میں بھی ایک پرچھائیں دکھائی دیتا۔

عمران کبھی باہر فٹ پاتھ پر ٹہلتا اور کبھی اندر آ کر خفیف سی معذرت کر کے موبائل فون سے لگائے باہر چلا جاتا۔ ایک اور بار اندر آیا تو کہنے لگا ''پہلے ذکر کریں گے تارڑ صاحب''

''صرف تارڑ صاحب ہی نہیں اُن کی بیگم بھی ذکر کریں گی، وہی ہوا ایک کونے میں بیرا بیٹھی ہیں''

''مہاراجہ رنجیت سنگھ'' کی مہاراجے کا نہ تھا وہ تو میں پاکستانیوں کی کمر توڑ مشقت اور محنت کا ثمر تھا۔ یہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ یہ مہاراجے کس نوعیت کی خوراک کھاتے ہیں۔ البتہ پنجابی تندور میں سے برآمد ہونے والے گرم نان تھے وہ ایک اور پراسرار پاکستانی تھا، عمران نے تب مجھے خبر دار کیا تھا۔ تب اُس نے مجھے بتایا کہ اُس کی بیگم سکردو کی رہنے والی ایک ایسی خاتون ہے کہ ویسے تو ہوا میں میرا محبوب ہے لیکن بلتستان کے لیے میرے دل میں ایک ایسا گوشہ آباد ہے جو میری چاہت کے

میں قدرت رکھتا تھا.... اُس نے اس محفل میں شرکت کرنے والے شاعروں اور شاعرات کا مختصر تعارف کروانے کے بعد میرے بارے میں کچھ مبالغہ آرائی کی اور کیوں نہ کرتا کہ اُس نے مجھے خصوصی طور پر شیر خان کے ذریعے ہالینڈ سے امپورٹ کیا تھا تو کیسے میری توصیف نہ کرتا..

مشاعرے کا آغاز غافل صاحب سے ہوا..اور وہ کیا ہی لاجواب غافل تھے..میں نے اپنی زندگی میں بہت سے غافل دیکھے ہیں لیکن تیرے خیال سے غافل نہیں رہا، دیکھے ہیں لیکن یہ غافل تو بہت ہی غافل تھے..یہاں تک کہ شاعر تھے پر شاعری سے غافل تھے..بہر طور اُن میں ایک ایسا پر جوش جذبہ موجزن تھا..قافیے ردیف کی قید سے آزاد جس کی ہر موج میں شاعری کے خس و خاشاک فنا کے سمندروں میں اترتے جاتے تھے..ویسے میں ایسے غافل لوگوں کی شاعری سے لگن کو سلام کرتا ہوں کہ وہ دیارِ غیر میں رزقِ روزگار کے لیے جانے کیسے کیسے پاپڑ بیلتے ہیں اور اس کے باوجود جیسی تیسی بھی شاعری تو کرتے ہیں..شجر سے پیوستہ اُمید بہار تو رکھتے ہیں..

اس دوران مجاہد اور عدیل شاکر نام کے دو نوجوان بھی سٹیج پر آئے اور وہ غافل کی بے ہوش کردہ شاعری کو فکر انگیز اور غنایت سے بھرپور کلام کے لخلخے سونگھا کر پھر سے ہوش میں لے آئے..وہ دونوں کیسے منفرد اور خیال انگیز شاعر تھے..بہر طور یہ ہوش میں لانا عارضی ثابت ہوا کہ اب جگر تھام کے بیٹھو کہ میری باری آئی..شاعرات کی جلوہ افروزی کی باری آئی..اور مجھے شاعری کی ایک سرگوشی سنائی دی کہ بے ہوش ہی اچھی تھی، ناحق مجھے ہوش آیا..

عمران نے مائیک کے قریب اپنا چہرہ لا کر اعلان کیا کہ اب..آپا نثار فاطمہ تشریف لاتی ہیں تو یکدم میرا دل رُک گیا کہ ہائیں ضیاء الحق کی اسلامی مجاہدہ نثار فاطمہ یہاں برسلز میں پھر سے زندہ ہو گئی ہیں..شنید ہے کہ اُنہوں نے وصیت کی تھی کہ قبر میں میرے ساتھ میرا برقع بھی دفن کیا جائے تاکہ وہاں بھی بے پردگی نہ ہو..لیکن جب یہ مائیک اُن آپا کے سامنے آیا تو یہ کسی اور نوعیت کی معنک آپا تھیں جن کے لہجے میں ثمین قاف خوب کھنکتے تھے..ازاں بعد اعلان ہوا کہ اب ہم براہ راست پیرس سے تشریف لانے والی شاعرہ ثمن بی بی کو زحمت کلام دیتے ہیں اور اُن کا کلام زحمت پر پورا اترتا تھا لیکن ہال میں موجود شائقین کے لیے ایک رحمت ثابت ہوا کہ وہ قدرے پُر جوش سے ہو گئے..اگلی نشستوں پر براجمان ایک صاحب کی حالت غیر ہو گئی، وہ ہر شعر پر بے قابو ہو جاتے اور نشست سے اٹھ کر ''ہائے ہائے..مار ڈالا..کیا شعر دے مارا ہے'' قسم کی داد دینے لگتے.. بعد میں کُھلا کہ موصوف بھی شاعر ہوا

''میرے اعزاز میں ایک یادگار غافل محفل''

ڈنر کے بعد ہمیں ایک کار میں لاد کر اُس شبِ دیجور میں کہیں گھما پھرا کے بالآخر ایک ویران اور مخدوش سی گلی میں اتار دیا گیا..کوئی کمیونٹی کلب تھا اور وہاں کُچھ لوگ کسی تاریک گوشے میں سے ظاہر ہو کر نہایت پردہ پوشی سے ایک دروازے میں داخل ہو رہے تھے..جیسے اندر یا تو کوئی نیلی فلم چلنے والی ہے اور یا پھر کوئی ''جھاتی مار'' یعنی ''پیپ شو'' چل رہا ہے..

مشاعرے اور میرے اعزاز میں منعقد کی جانے والی محفل میں ابھی کچھ تاخیر تھی اس لیے ہمیں اُس کمیونٹی کلب کی دوسری منزل پر واقع ایک ''انتظار گاہ'' میں براجمان کر دیا گیا..اور یہ محض ایک انتظار گاہ نہ تھی اس کے دائیں بائیں کچھ غسل خانے بھی تھے جن کی ہلکی مست کر دینے والی بُو اُس بادِ نو بہار کو بھی متاثر کر سکتی تھی جو گُلوں میں رنگ بھرتی تھی..

''آپ کو انتظار کی زحمت تو ہوئی..تشریف لے آیئے..''

ہم نیچے تشریف لائے اور مہکتے چلے آئے..کمیونٹی ہال دھیرے دھیرے بھر رہا تھا..اور اس کو بھرنے والے سب میرے وطن کے لوگ تھے..ان میں وہ بھی تھے جو متمول اور آسودہ تھے اور وہ بھی تھے..ہیں سخت بہت بندۂ مزدور کے اوقات..اور حیرت ہوتی تھی کہ وہ یہاں اپنی مشقت بھری حیات سے فرار ہو کر صرف کُچھ شعروں اور کچھ میری باتوں کو سننے کے لیے آئے ہیں...

جب مجھے نہایت سجی ہوئی سٹیج پر مدعو کیا گیا تو میری آنکھیں چندھیا گئیں..وہاں برسلز کے شہر کے اندھیارے پن کا ازالہ کرنے کی خاطر اتنی تیز سپاٹ لائٹس روشن تھیں کہ..اگر وہ کسی تھیٹر کی سٹیج پر روشن ہوتیں تو پرنس آف ڈنمارک ہیملٹ کی آنکھیں بھی چندھیا جاتیں اور وہ ''ٹوبی آر ناٹ ٹُوبی'' کے مکالمے بھول کر ''ٹُوبی ٹُوبی'' کی گردان کرنے لگتا، اس سجی ہوئی سٹیج پر مجھے صدرِ محفل کے طور پر سجا دیا گیا....عمران ثاقب نے مائیک کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے ایک اور رُوپ کو آشکار کیا..وہ اپنے کلام

بھی ایک انکشاف تھا..اب اُن کے بچے سب کے سب بکھر چکے ہیں اور وہ تن تنہا ہیمبرگ میں زندگی کے بقیہ دن گزار رہی ہیں.. یورپ بھر میں جہاں کہیں مشاعرہ برپا ہو، وہاں رباب بھی برپا ہو جاتی ہیں..ویسے میں نے اُن کے لیے ایک عجیب سی ہمدردی محسوس کی، جیون ساتھی کے بچھڑ جانے کے المیے کو اگر کسی بھی نوعیت کی شاعری قابل برداشت بناتی ہے، اُس غم کو سہارنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے تو اس کا سہارا لینا جائز ٹھہرتا ہے..وہ ہمہ تن انکشافات تھیں اور اُن میں سے ایک اُن کی نثر نگاری کے معجزے تھے..اُن کا کہنا تھا کہ ہیمبرگ میں ایک ایسی جھیل ہے جس کے ایک کنارے کی توصیف میں اُنہوں نے چند صفحے سیاہ کر ڈالے ہیں..یہ تو قادر الکلامی کی انتہا تھی اور میں بے حد متاثر ہوا اور اُن کے لیے دعا گو ہوا کہ اللہ تعالیٰ اُنہیں عُمرِ خضر عطا کرے اور وہ ہیمبرگ کی اس پوری جھیل سے نپٹ لیں..

جب کبھی میرے فہم ناقص میں اُن کا کوئی مصرع معنی خیز ہوتا تو میں مہمان خصوصی کے بہروپ میں اپنا فرضِ منصبی ادا کرتے ہوئے ایک ڈری ڈری سی ''واہ'' کر دیتا اور رباب بی بی سامعین سے نظریں ہٹا کر اپنا رُخِ خزاں میری جانب کر کے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو لپیٹ کر ایک سموسا سا بنا کر گردن میں بل دے کر ''آداب عرض'' کرتیں اور میں بے حد سرفراز محسوس کرتا..بلکہ اس دوران رباب کے حوالے سے مجھ پر بھی ایک شعر نازل ہو گیا جو میں کسی مناسب موقع پر آپ کی خدمت میں پیش کروں گا..

مشاعرے کا اختتام ہوا اور اب گُھٹنے تھام کر بیٹھو کہ میری باری آئی کہ اتنی زبردست شاعری کی شدت سے حاضرین میں سے اکثر لوگوں کے گُھٹنے آپس میں بھڑنے لگے تھے..صرف شاعری ہی نہیں ہال میں جو ایک سرد انگیزی تھی وہ بھی اس کا باعث تھی..عمران ثاقب نے ظاہر ہے میری ادبی عظمت کے جھنڈے گاڑ دیئے، اور اُن میں سے بیشتر سرنگوں رہے، میری عظمت کے گُن گائے اگرچہ کسی نے کُچھ اعتبار نہ کیا، صرف اس لیے کہ اُس نے مجھے خصوصی طور پر ہالینڈ سے امپورٹ کیا تھا اور اپنے درآمد شدہ مال کی کوئی بدتعریفی تو نہیں کرتا..مجھے بھی زحمت کلام دی گئی..اب اسی سٹیج پر براجمان اتنی نابغۂ روزگار اور قادر الکلام ہستیوں کے بعد میں نے کیا کلام کرنا تھا..اور میں نے جو بھی کلام کیا نا تمام کیا لیکن کام بن گیا، بات بھی بن گئی..

محفل کے اختتام پر وہ کیسے کیسے مہربان اور پیارے لوگ تھے جن کی اُلفت اور لگاؤ نے مجھے آبدیدہ کر دیا..وہ دور دور سے آئے تھے..اپنے کام کاج ترک کر کے صرف مجھ سے ملاقات کرنے اور

کرتے ہیں لیکن اُن کے اصرار اور سفارشوں کے باوجود انہیں اس مشاعرے میں شامل نہ کیا گیا۔ چنانچہ وہ پُر جوش ہو کر ثابت کر رہے تھے کہ اے نادان لوگو، دیکھو کہ میں کیسا سخن فہم ہوں اور تم نے اس مشاعرے میں مجھے شامل کر کے گویا اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی ماری ہے ورنہ تم دیکھتے کہ میرا سخن کیسا ہوتا۔ اُن کے دائیں بائیں براجمان اُن کے ساتھی اُنہیں سنبھالنے کی بہت کوشش کرتے لیکن وہ اُن کے قابو میں نہ آتے اور داد کے ڈونگرے برساتے گئے۔ پھر وہ یکدم چپ ہو گئے، شاید ڈونگروں کا سٹاک ختم ہو گیا تھا۔ یہ سُمن بی بی کم از کم غافل صاحب کی نسبت شاعری سے کم غافل تھیں بلکہ میں تو اُن کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے سیفی صاحب کے ذریعے مجھے اپنے ہاں پیرس میں مدعو کیا تھا اور میں بوجوہ یہ دعوت قبول کرنے سے قاصر رہا۔

میرے برابر میں ایک خزاں رسیدہ اجڑی ہوئی نہایت ٹھسّے دار خاتون تشریف رکھتی تھیں۔ خاصی خوش اخلاق اور شاید خوش اطوار بھی اور اُنہوں نے خزاں اور اجاڑ پن کو قبول نہیں کیا تھا اور اپنے تئیں ابھی تک بہار میں تھیں اور آباد تھیں۔ چونکہ میں ان سے واقفیت نہیں رکھتا تھا اس لیے میں نے عمران ثاقب کے کان میں سرگوشی کی کہ یہ کون ہیں تو اُس نے جواب بھی مدھم سرگوشی میں دیا۔ تو میں جو کہ عُمر کے اس حصے میں قدرتی طور پر قدرے بہرا ہوا جاتا تھا اور غالب کے بقول۔ کہ میں تو سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر۔ چنانچہ اگر بہرا ہوا جاتا ہوں تو چاہیے کہ دُونا ہوا التفات۔ تو اس عالمِ بہرا گیری میں مجھے کچھ۔ کباب یا شباب وغیرہ سنائی دیا تو میں نے پھر ثاقب سے کہا۔ ہیں، کباب۔ وہ کہنے لگا، نہیں نہیں تارڑ صاحب۔ اور پھر مدھم سی سرگوشی کی اور اُس لمحے سُمن پیرس والی اپنے پورے جوبن پر تھیں تو مجھے شائبہ ہوا کہ شاید شباب کہا ہے جو کہ وہ ہو نہیں سکتی تھیں، خراب بھی قرین از قیاس نہ تھا تو بالآخر کُھلا کہ وہ رباب ہیں۔ یعنی طاؤس و رباب والی رباب اور وہ بھی آخر میں۔ مائیک اُن کے سامنے رکھا گیا تو حاضرین میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ اُنہوں نے ایک آدھ شعر تو شرافت سے سنایا اور اس دوران حاضرین کی جانب عجیب سی سوالیہ نظروں سے دیکھتی رہیں اور تب کسی ایک شخص نے نعرہ لگایا۔ ترنم سے۔ اور اسی نعرے کا اُنہیں انتظار تھا اور وہ بخوشی اپنے ترنم کا شکار ہو گئیں۔ یہ حقیقت ہے کہ سُر تال سے اُن کی آشنائی خاندانی لگتی تھی اور اُن میں یہ وصف بہر طور جھلکتا تھا جس کی داد نہ دینا زیادتی ہو گی۔ وہ خاصی مترنم تھیں۔ ثاقب نے بتایا کہ چند برس پیشتر تک اُنہیں شاعری وغیرہ سے کچھ سروکار نہ تھا اور پھر ناگہاں اُن کے شریک حیات کا انتقال ہو گیا اور پھر یکدم شاعری اُن پر اترنے لگی اور یہ اُن کے لیے

ہوتا تھا..اور میں جب کبھی اپنے ٹوٹے بدن کے بکھیڑوں میں تھکاوٹ اور بیزاری سے اُلجھا اُس سے عمران ثاقب سے سوال کرتا کہ..کتنی دُور..تو وہ موبائل کان سے ہٹا کر کہتا..بس تھوڑی دُور..وہاں میرے ایک دوست زیدی صاحب کا شاندار وِلا ہے جہاں آپ آج کی شب بسر کریں گے اور زیدی ان دنوں بال بچوں سمیت پاکستان گیا ہوا ہے تو آپ وہاں یہ شب بسر کریں گے..

''کیا وہاں کے بستروں کی چادریں صاف ستھری ہوں گی، تکیوں کے غلاف دُھلے ہوئے ہوں گے، واش روم کے تولیے استعمال شدہ تو نہ ہوں گے۔'' میمونہ ہولے ہولے پرتشویش انداز میں مجھ سے پوچھتی تھی..''یہ ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں؟''

♦♦.....♦♦.....♦♦

میری باتیں سننے کی خواہش میں آئے ہوئے لوگ.. مجھ سے برسلز میں چند روز ٹھہر جانے کی درخواست کرتے، اپنے گھروں میں مدعو کرنے کی آرزو اظہار کرتے.. وہ شب بھر مجھ سے باتیں کرنا چاہتے تھے اور مجھ پر زوال عمر کے سائے بڑھتے جاتے تھے اور میں.. اب کہیں سو جانا چاہتا تھا..

لوگ رخصت ہونے لگے.. کُرسیاں سمیٹی جانے لگیں اور میں نے دیکھا کہ عمران ثاقب ہال میں بکھرے ہوئے شاپرز، کاغذوں اور دیگر کاٹھ کباڑ کو اپنے ایک دو ساتھیوں کے تعاون سے ایک جھاڑو نما شے سے سمیٹ رہا ہے.. ہال کے فرش کو پُونچھ رہا ہے تاکہ اسے اُسی حالت میں سُپرد کیا جائے جس صاف ستھری حالت میں اُسے وصول کیا تھا..

یہ بھی جنوں خیزی کی ایک جنوں انگیز وحشت تھی کہ برسلز ایسے بے جان اور سرد خصلت کے شہر میں شاعری اور ادب کی حدّت سے بیشتر بے بہرہ اور لاتعلق ہم وطنوں کو سلگائے ہوئے رکھنا اور پھر اپنے ہاتھوں سے ان محفلوں کے اختتام پر ہال کے فرش کو پُونچھنا اور صاف کرنا.. ایک خاکروب ہو جانا ادب اور ثقافت کے لیے..

یہ کیسی جنوں خیزی تھی.. یہ کیسے گھاٹے کے سودے تھے..

جانے ہم کہاں چلے جا رہے تھے..

اُس اجنبی شب میں، اجنبی لوگوں کے ہمراہ ایک کار میں جانے کدھر کے مسافر تھے.. میں اور میمونہ اُس کار میں اونگھ رہے تھے جو گئی رات برسلز کے کوچہ و بازار میں چلی جاتی تھی، کسی قیامِ شب کی منزل کی جانب رواں تھی..

نہ صرف میں اور میمونہ بلکہ سیفی صاحب ہمارے گارڈین اینجل.. ایک ایسا فرشتہ اگرچہ معنک جو ہمارے اردگرد ایک پہرے دار تھا، یہ فرشتہ بھی اونگھ رہا تھا.. ثاقب کے کان کے ساتھ موبائل فون جُڑا ہوا تھا اور وہ کسی زاہد حسین کے بارے میں پُرتشویش تھا جن کی کتاب ''سکارپن ٹیل'' یا بچھو کی دُم کی تقریب اگلے روز برسلز میں منعقد ہونی تھی.. اس دوران اُس کی بلتی بیگم بھی اس موبائل میں اُسے بہ زبانِ فارسی کچھ ڈانٹ ڈپٹ کرتی رہی..

ہم برسلز کے گھنیرے پن میں سے نکل کر کہیں کُھلی فضا میں آ گئے.. یعنی اُس شب میں ملفوف جو آبادیاں اور روشنیاں تھیں اُنہیں تیاگ کر برسلز کی گرفت سے باہر آ گئے.. اس سفر کا انت نہ

کمرے میں چلی گئیں..سیفی صاحب بھی اپنی عینک سنبھالتے کہیں روپوش ہو گئے..ہمارے کمرے کی دیواروں سے نہ صرف زیدی صاحب کی اماں جان جھانکتی تھیں، کبھی پوپلی سی مسکراہٹ کے ساتھ اور کبھی خشمگیں عینک کے ساتھ بلکہ وہاں خانہ کعبہ کے متعدد پوسٹر، کُچھ طُغرے اور قرآنی آیات بھی آویزاں تھیں..اور ایسی مقدس موجودگی میں ایک گنہگار کو کیسے گہری نیند آ جاتی..صد شکر کہ ہم اس کمرے میں اپنا ہنی مون منانے کے لیے نہیں آئے تھے..وہ ایک بے آرام شب تھی..

ہم دونوں کو صبح کی سیر کی جو علّت لاحق ہے اُس کی مجبوری سے ہر صبح سویرے سویرے اکثر مُنہ اندھیرے ہماری آنکھ کُھل جاتی تھی اور وہ برسلز کے نواح میں واقع اُس گھر یا وِلا میں بھی کُھل گئی..

ویسے بھی رات بھر اُن مذہبی مظاہر اور اماں جی کی تصویروں کی برکت سے ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر سوتے رہے:..ہاتھ بڑھا کر یہ بھی چیک نہ کیا کہ ہمدم وہاں موجود بھی ہے یا نہیں..

وسیع کچن میں ناشتے کے تمام تر لوازمات کثرت میں تھے اور ایسی مشینیں تھیں جنہیں چالو کرنے سے ہر نوعیت کا ناشتہ پل بھر میں تیار کیا جا سکتا تھا..اگرچہ ہم نے معمول کے مطابق ایک ایک ٹوسٹ، اُس پر کچھ مکھن مارملیڈ یا شہد کی آمیزش کے ساتھ چائے کی ایک پیالی کے ساتھ نوش کیا..اور ایک مطمئن کیفیت میں آ گئے..

اس وسیع کچن کی شیشہ کھڑکی کے پار نومبر کے آخر کی ایک گھنی دُھند کی سفیدی ایسی تھی جو اُس کے شیشوں پر سانس لیتی اُنہیں سرد کرتی تھی..اور اس گھنی دُھند میں ایک وسیع لینڈ سکیپ جس میں کھیت کھلیان اور شجر تھے اور تنہائی تھی اپنی ہریاول کی چھب دِکھلاتی تھی..

ناشتے کے بعد مجھ ایسے نکوٹین کے رسیا کے لیے پہلا سگرٹ ہی زندگی کا حاصل ہوتا ہے..سب سے دھواں دار اور پُر کیف لمحہ ہوتا ہے..بقیہ دن تو کیسا فضول ہوتا ہے تو میں وہ پہلا سگرٹ پینے کے لیے باہر چلا گیا اور قطعی طور پر احساس نہ کیا کہ یہ نومبر کے آخری دن ہیں اور ان دنوں یورپ ٹھٹھرنے لگتا ہے اور میں ایک ناکافی لباس یعنی قمیض شلوار اور فلیس کی ایک نمائشی جیکٹ میں ہوں..باہر درجہ حرارت اتنا گر چکا تھا کہ سانس لینے سے وہ ہوا جو گلے میں اترتی تھی، برف کی کرچیاں ہوئی جاتی تھی اور میرے کان سردی سے ایسے سیب ہوئے جاتے تھے جو سکڑ کر پچک چکے تھے..واپسی کی راہ اختیار کرنے کے بارے میں سوچا اور پھر یہ سوچا کہ اگر نمونیہ وغیرہ ہونا ہے تو وہ تو ہو چکا تو کاہے کو اس

''شبِ برسلز میں..آئے کُچھ ابر کُچھ رباب آئے''

یہ قدرے کشادہ گھر مقامی محاورے کے مطابق ایک وِلا جہاں ہم ہیگ سے برسلز تک کی مسافت کے اضمحلال میں پژمردہ اور اس شب کی افراطِ شاعری کا شکار بالآخر پہنچے، کسی ایسے زیدی صاحب کی ملکیت تھا جن کے بیلجیم میں کچھ پٹرول پمپ وغیرہ تھے اور اُنہیں اپنی والدہ صاحبہ سے اس قدر دیوانگی کی حد تک محبت تھی کہ غسل خانوں کے سوا گھر کے کُل در و دیوار پر اُن کی موٹے شیشوں والی عینک سے آراستہ ماں جی کی تصویریں، شبیہیں اور پورٹریٹ آویزاں نظر آتی تھیں..مجھے کچھ ملال سا ہوا کہ میرے گھر کی دیواروں پر دنیا جہان کی پینٹنگز اور تصاویر تو سجی ہیں لیکن امّی کی کوئی ایک تصویر بھی نہیں تو کیا مجھے اُن سے محبت نہیں ہے..ویسے میں نے اس خیال سے امّی جی اور ابّا جی کی تصویریں جن میں وہ زندہ اور مسکراتے تھے، ایک مرتبہ یک جا کیں اس خیال سے کہ میں انہیں انلارج کر کے اپنے گھر میں آویزاں کروں یا سعید اختر سے گزارش کروں کہ وہ ان کی پورٹریٹس مصور کر دے لیکن مجھ سے یہ نہ ہو سکا..میں اُن کی صورتیں ہمہ وقت برداشت نہ کر سکتا تھا کہ وہ مجھے جس قدر یاد آتے رہتے تھے، میں انہیں اُس سے زیادہ یاد کرنے کی تاب نہ لا سکتا تھا..زیدی صاحب کی والدہ یقیناً حیات تھیں اور میری ماں مر چکی تھی..وہ اُن کی تصویروں کو دیکھتے ہوئے جانتے تھے کہ وہ جب جی چاہے انہیں دیکھ سکتے ہیں جب کہ میرا جتنا بھی جی چاہے میں انہیں نہیں دیکھ سکتا تھا تو اُن کی تصویر دیکھنے سے کیا حاصل..

ہماری بزرگی کے احترام میں ہمیں ماسٹر بیڈ روم اور وہ بھی گراؤنڈ فلور پر تفویض کیا گیا..میمونہ نے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کیا، پہلے بستر کی چادر کو سُونگھا، تکیے کے غلافوں پر ناک رکھی اور پھر واش روم میں جا کر جس میں ایک جکوزی کا اہتمام تھا تو لیے سونگھے اور اُس نے کہا ''دُھلے ہوئے لگتے ہیں..پر جانے دُھلنے سے پہلے یہ کس کس کے زیر استعمال رہے ہیں..''

رباب بی بی بھی ہمارے ہمراہ تھیں وہ گنگناتی ہوئی سیڑھیاں طے کرتی کھٹ کھٹ کرتی اپنے

بدن میں بھی تو کچھ قریب المرگ مقامات تھے، شاید اُن کا ہاتھ معجزہ گر ہو جاتا.. دمِ عیسیٰ کے کرشمے دکھا دیتا.. تب میں نے اُن کی خدمت میں وہ شعر پیش کیا جس کا حوالہ میں نے اس بیانیے کے آغاز میں دیا تھا اور یہ شعر بھی میری بے دھیانی میں نازل ہو گیا تھا کہ

آئے کُچھ ابر کُچھ شراب آئے
ازاں بعد بے شک رباب آئے

رباب بی بی نے اپنی ہتھیلی کو سمیٹ کر اُس کا ایک سموسہ سا بنا کر آداب کیا اور پھر اس دُھند آلود سویر میں اپنی سیاہ مرسیڈس میں سوار ہو کر گنگناتی ہوئی ہیمبرگ کے لیے رخصت ہو گئیں..

''اب کہاں؟'' میں نے ثاقب سے دریافت کیا۔

''واٹرلو.. اور کہاں..''

♦♦.....♦♦.....♦♦

سویر کی سحر انگیز دُھند اور کُھلی فضا سے کنارہ کشی اختیار کی جائے..

نظر کے سامنے دور دور تک نہ کوئی ذی روح تھا اور نہ کسی روح کی رہائش گاہ..گھر کے لان کی باڑ کے پار سُوکھے ہوئے شاید جوار یا مکّی کے ٹانڈوں کا ایک کھیت تھا جن کی خزاں صورتوں پر اوس کی بوندیں منجمد ہوتی تھیں..وہ جو پچھلی شب کی تمام تر بیزاریاں اور کُلفتیں تھیں وہ اُس سویر کے منظر میں گھل کر زائل ہو گئیں..

میری قدموں تلے کُہر سے سفید ہوتی گھاس کے پتّے اکڑتے اور پھر بچھ جاتے تھے۔ گویا والٹ وہٹ مین کے شعری مجموعے ''لیوز آف گراس'' کی مانند تھے..وہ گھاس کے منجمد پتّے میرے جوگرز کے تلووں میں سرایت کرتے میرے پورے بدن کو ایک رُوحانی تازگی اور ٹھنڈک سے انجیکٹ کرتے تھے..

وہ..برسلز کے نواح میں ایک سویر جہاں میں کسی اجنبی گھر کے لان میں صبح کا پہلا سگرٹ پی رہا تھا کیا ہی جادو بھری بلکہ دُھند بھری سویر تھی..اور وہ اس گھر کے لان کے پار جو سُوکھے ہوئے ٹانڈے تھے وہ مجھے بابا فرید کی یاد دلاتے تھے کہ..کُوک فریدا کُوک توں..اور جب تک ٹانڈا نہ گرے..

واپس کچن کی گرم آغوش میں آیا ہوں تو وہاں میلہ لگا ہوا تھا..

سیفی صاحب اپنی بے ڈھنگی ٹانگوں پر ایک اونی پاجامہ چڑھائے عینک سنبھالتے پھرتے ہیں..اور وہ عمران ثاقب جو ہمیں اس گھر میں مقیم کر کے واپس برسلز چلا گیا تھا جانے کیسے پھر سے صبح سویرے یہاں پہنچ چکا تھا اور ناشتے کی تیاریوں میں ایک مستعد باورچی ہو چکا تھا، بی بی رباب درجن بھر انڈوں کو فرائنگ پین میں گنگناتی ہوئی یُوں پھینٹ رہی تھی جیسے وہ شاعری کو پھینٹی لگاتی تھیں..

ہالینڈ واپسی پر میمونہ نے مجھے بتایا کہ رباب نے اُسے بتایا ہے کہ وہ دراصل ایک پہنچی ہوئی رُوح ہیں اور وہاں ہیں جہاں ہم کو ہماری خبر بھی نہیں آتی اور اُن پر کُچھ نزول ہوتا ہے اور یہ جو شاعری ہے یہ بھی اُن پر اوپر سے نازل ہوتی ہے..تب میں نے یونہی ایک تشویش کا اظہار کیا کہ اگر اُن پر شاعری اوپر سے اترتی ہے تو اوپر جا کر چیک کرنا چاہیے کہ وہ کون ہے جو اُن پر ایسی شاعری اُتارتا ہے..اور اُنہوں نے نہایت سنجیدگی سے یہ بیان بھی دیا تھا کہ ایک بار انہوں نے کینسر کے ایک مریض کے بدن پر ہاتھ رکھا تو وہ شفایاب ہو گیا..تب مجھے بہت قلق ہوا کہ آخر میں کیوں نہ فیض یاب ہوا کہ میرے

''ڈیکلائن اینڈ فال آف رومن ایمپائر'' اُس کی متعدد بھاری جلدیں بھی ہماری دستبرد سے نہ بچ سکیں..اور یاد رہے کہ ٹالسٹائی کی ''وار اینڈ پیس'' کارلائل کی ''دے فرنچ ریولوشن'' یا کارل مارکس کی ''دے کیپٹیل'' یا نطشے کی ''دس سپوک زرتشترا'' وغیرہ تو کسی شمار قطار میں نہ تھیں..سارتر، رَسل اور رُوسو کو بھی ہم چاٹ گئے..کیا ہم نے مطالعہ کی کثرت سے کُچھ حاصل کیا، سوائے بوریت اور مشقت کے اور کچھ حاصل نہ کیا لیکن ہماری دھاک بیٹھ گئی..البتہ بعد کی تخلیقی زندگی میں مجھے احساس ہوا کہ یہ کتابیں میری تحریر پر اثر انداز ہوئی ہیں..پھر ہم سب کو نپولین ہو گیا..ہم سب ہاتھ دھو کر اس کوتاہ قامت فرانسیسی عجوبے کے پیچھے پڑ گئے..نپولین کے بارے میں جتنا بھی تاریخی، تحقیقی اور ادبی مواد میسر تھا ہم نے کھنگال ڈالا..وہ ہمارا پسندیدہ ترین تاریخی کردار ہو گیا، اب ہماری کتابی عداوت کی محفلوں میں صرف نپولین کے قصّے، کہانیاں اور اقوال زیر بحث آتے..خاص طور پر اُس کا کہنا کہ تم مجھے اچھی مائیں دو تو میں تمہیں ایک اچھی قوم دوں گا..اور ہم نپولین کی نیت پر تھوڑا سا شک کرتے کہ بونا پارٹ صاحب یہ کیوں کہہ رہے ہیں کہ تم مجھے ہی اچھی مائیں دے دو اور میں تمہیں ایک اچھی قوم دوں گا..کیونکہ ایسی مائیں جو نپولین کو دی جائیں گی اُن کے بطن سے جو قوم پیدا ہو گی اُس کے ہر فرد کی شکل ظاہر ہے نپولین پر چلی جائے گی.... نپولین پاگل پن کے دوران لڈ وِگ کی تحریر کردہ تاریخی کتاب ''نپولین'' سب سے افضل قرار دی گئی اور جہاں تک ادب کا تعلق تھا تو ناول ''ڈیزری'' کے بیانیے نے ہمیں اپنا گرویدہ کر لیا..اس ناول پر مبنی فلم میں کوتاہ قامت اور ایک واضح توند والے نپولین کا کردار دراز قد مارلن برانڈو نے ادا کیا جو اپنی ناک کے راستے مکالمے ادا کرتا بڑبڑاتا تھا اور ہم ایسوں کے پلّے ایک تنکا بھی نہ پڑتا تھا کہ یہ کہہ کیا رہا ہے اور اس کے باوجود اُس جیسا اداکار پھر کبھی نہ دیکھا..اُس نے تو فلم ''جولیئس سیزر'' کا کردار بھی اپنے روایتی امریکی لہجے کی بڑبڑاہٹ میں کیا، وہ اداکاری کے فن میں ایک فان خوخ تھا..جیسے وہ حقیقت سے ماورا ہو کر اپنے خبط کو بروئے کار لا کر اپنے چاند ستارے، سورج مکھی کے پھول اور کھیت پینٹ کرتا تھا ایسے برانڈو بھی ہر کردار کو اپنی ذات کے دھندلکوں میں اتار کر اُسے ایک نیا رُوپ دیتا تھا..وہ کہا کرتا تھا کہ ''جولیئس سیزر'' میں جو سیزر تھا، وہ برانڈو تھا اور اسی طور نپولین بھی اپنے زمانے کا ایک برانڈو تھا..

تو ہم سب اس نپولین پاگل پن میں خود بھی قدرے نپولین ہو گئے..طیب حسن کو ہم ان دنوں رشک کی نگاہوں سے دیکھتے کہ وہ بھی نپولین کی مانند چھوٹے قد کا تھا اور اُس پر مستزاد یہ کہ وہ

''واٹرلُو کے میدان میں، نپولین بہت ہو گیا''

یہ بھی اُنہی دنوں کا قصّہ ہے جب ہر درخت سرسبز لگتا ہے اور ہر بطخ راج ہنس دکھائی دیتی ہے جب دن رات فلمیں دیکھنے اور ہمہ وقت کتابوں میں غرقابی کا جنون بیماری کی حدوں کو چُھو رہا تھا.. جیسے کسی مصور کی تصویروں کے بارے میں طے کیا جاتا ہے کہ یہ اُس کے فلاں پیریڈ کی تصویر ہے.. نیلا پیریڈ جب وہ نیلے رنگ پر فریفتہ تھا یا مراکو پیریڈ جب وہ مراکو کی لینڈ سکیپ سے متاثر ہو کر اُس کے رنگ اپنی تصویروں میں بھرتا تھا تو اسی طور میری حیات میں بھی مختلف پیریڈ آئے.. ویسے تو پہلا الجبرا پیریڈ تھا جس میں ہمیشہ بمشکل پاس ہوتا تھا.. پھر دھاری دار پاجامہ پیریڈ تھا.. ازاں بعد جین پیریڈ اور امریکی لہجے میں مُنہ بگاڑ بگاڑ کر انگریزی بولنے کے پیریڈ آئے.. درمیانی عمر میں آئے تو گندھارا پیریڈ کے علاوہ کوہ نوردی پیریڈ بھی نازل ہو گئے.. تو اُن دنوں مجھ پر کتاب پیریڈ طاری ہو چکا تھا.. خاور زمان.. طیب حسن.. اشفاق سرور اور اظہر جیسے دوستوں کے درمیان ایک کتابی عداوت چلتی رہتی اور ہم ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی خاطر دقیق اور ضخیم اور اکثر غیر معروف کتابیں چاٹ چاٹ کر شیخیاں بگھارتے.. اس شیخی خورے پیریڈ میں ہم نے انتہائی بور اور اُکتا دینے والی کتابیں خون تھوک کر پڑھ ڈالیں.. اگلی ملاقات پر اشفاق سرور اپنی گہری اور گمبھیر آواز میں ہم سب پر ایک نظرِ حقارت ڈالتے ہوئے کہتا کہ بھئی میں تو ان دنوں بارہ جلدوں پر مشتمل فریزر کا شاہکار ''دے گولڈن باؤ'' جسے اردو میں ''شاخِ زریں'' بھی کہا جا سکتا ہے، دن رات پڑھ رہا ہوں اور ہم ہکا بکا رہ جاتے کہ یہ کونسی کتاب ہے اور اگلی صبح پنجاب پبلک لائبریری سے ''گولڈن باؤ'' کا اختصار شدہ صرف چھ جلدوں پر مشتمل ایڈیشن حاصل کر کے اُس میں غرق ہو جاتے.. مذہبی رسوم کا آغاز کہاں سے ہوا تھا.. دنیا بھر میں جو توہمات اور رسوم ہیں اُن کا منبہ کیا تھا.. یہ سب کُچھ اگرچہ ہمارے سر سے گزر جاتا لیکن اگلی محفل میں ہم بھی ڈینگیں مارتے سرخرو ہو جاتے.. جسے انسانی تاریخ کی سب سے اہم دستاویز گردانا جاتا ہے.. ایڈورڈ گبن کی

اور وہ بصد ادب کہتا ہے کہ.. فرانز یاد رکھو کہ نپولین بھی رُوس کو فتح نہ کر سکا تھا.. اور فرانز لِزایک متکبر اور طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہتا ہے.. اور تم بھی یاد رکھو کہ نپولین پیانو نہ بجا سکتا تھا..

ہالینڈ میں اتنے برسوں کے وقفے کے بعد قدم رکھتے ہوئے جہاں مجھے اُس کے گُلِ لالہ اور پن چکیاں یاد آئے وہاں نپولین بھی یاد آ گیا..

پورے یورپ کو سرنگوں کرنے کے بعد نپولین ایک کنبہ پرور شخص ہو گیا.. اُس نے اپنے کچھ دوستوں اور بھائیوں کو تسخیر شدہ ملک تفویض کر کے اُنہیں تاجدار بنا دیا.. اُس کی کسی بچی کھچی بہن نے فریاد کی کہ بھائی جان مجھ پر بھی کچھ عنایت کر دیں، پلیز کوئی ملک مجھے الاٹ کر کے مجھے بھی ملکہ بنا دیں.. اس پر نپولین نے یورپ کا نقشہ میز پر پھیلا کر تعین کیا کہ آخر میں اس جھگڑالو ہمشیرہ کو کہاں فِٹ کروں تو اُس کی نظر ہالینڈ کے مختصر پن پر پڑی.. چنانچہ اُس نے ان ہمشیرہ صاحبہ کو وہاں کی ملکہ تعینات کر دیا.. ہمشیرہ جب ہالینڈ میں وارد ہوئیں تو ڈچ شاہی خاندان کے افراد مجبوراً اُس کے قدموں تلے بچھ گئے لیکن دل ہی دل میں ہمشیرہ کے عوامی خون کو کوستے رہے کہ آج ہمیں یہ دن بھی دیکھنا تھا کہ ایک معمولی فرانسیسی عورت جو زیادہ پڑھی لکھی بھی نہیں ہے ہالینڈ کی ملکہ کا تاج پہن کر تخت پر براجمان ہو جائے جس کی رگوں میں نیلے شاہی خون کا ایک قطرہ بھی نہیں ہے، ایک لٹیرے کی بہن ہم پر حکمرانی کرے.. اگرچہ یورپ کے بیشتر شاہی خاندانوں کے آباؤ اجداد بھی لٹیرے تھے، ایسے ڈاکو تھے جو پُرتشدد طاقت سے لوگوں کو زیر کر کے بادشاہ بن بیٹھے تھے.. ہمشیرہ صاحبہ رواج کے مطابق اپنے دربار کے ساتھ آپرا کا کھیل دیکھنے کے لیے گئیں جہاں اُنہوں نے ملکہ کی حیثیت میں ایک شاہانہ بوکس میں تشریف فرما ہونے سے پیشتر آپرا ہاؤس میں اپنے استقبال کے لیے کھڑے ہو کر تالیاں بجاتے شاہی افراد کے لیے ایک مسکراہٹ عطا کی، ہاتھ ہلایا اور پھر اپنی نشست پر بیٹھ گئیں.. آپرا کی پرفارمنس کے بعد ہالینڈ کی متروک شدہ ایک سابقہ شہزادی نے ناک چڑھا کر کہا ''یہ نپولین کی ہمشیرہ تو ہو گی لیکن کوئی بھی یہ جان سکتا ہے کہ وہ ایک معمولی شاہانہ آداب سے ناواقف عورت ہے.. کیونکہ جب وہ ہاتھ ہلا کر اپنی نشست پر براجمان ہونے کو تھی تو اُس نے پہلے ہاتھ سے ٹٹول کر اطمینان کیا کہ بیٹھتے ہوئے اُس کے نیچے ایک کُرسی موجود ہے یا نہیں.. ایک نیلے خون والی ملکہ کبھی ایسے تذبذب کا شکار نہیں ہوتی، وہ اطمینان کیے بغیر اپنی کُرسی پر بیٹھ جاتی ہے اس یقین کے ساتھ کہ کُرسی تو وہاں ہو گی..''

اپنے بال ماتھے پر بکھیر کر سینہ پھُلا کر گردن اکڑا کر اعلان کرتا کہ میں اس زمانے کا نپولین ہوں.. بلکہ ٹالسٹائی کی ''وار اینڈ پیس'' پر بھی ہم اس لیے فریفتہ تھے کہ اُس میں نپولین کے رُوس کے حملے اور وہاں روسیوں کے خلاف اُس نے جو جنگیں لڑی تھیں اُن کی تفصیل درج تھی.. اس ناول کو متعدد بار فلم کے روپ میں ڈھالا گیا لیکن سب سے یادگار وہ فلم تھی جس میں ہربوٹ لوم نے نپولین کا کردار ادا کیا تھا اور بے مثال کیا تھا.. اس فلم میں دھان پان سی سُوکھی سڑی آڈرے ہیپ برن ہیروئن تھی جس پر ہم سب اُس کی اولین فلم ''رومن ہالیڈے'' میں ہی مرمٹ چکے تھے.. مجھے خلجان سا ہوتا کہ ایک روسی لڑکی چاہے وہ ایک شہزادی ہو اتنی دبلی پتلی کیسے ہوسکتی ہے کہ سوویٹ یونین میں منعقد کردہ یُوتھ فیسٹیول کے دوران میں نے تو جتنی بھی لڑکیاں دیکھیں وہ قدرے پلی ہوئی تھیں.. اور جب میں نے ماسکو میں اپنی شب و روز کی دوست لینا سے تذکرہ کیا تو وہ کہنے لگی ''شاہی خاندان کے افراد ہم سب عام روسیوں سے جدا ایک الگ مخلوق تھے اور وہ روسی زبان میں بات کرنا بھی گنوار پنا سمجھتے تھے.. وہ صرف فرانسیسی زبان اور ثقافت میں پلتے بڑھتے تھے اور اُن کی شہزادیاں ہم ایسی موٹی تازی نہ ہوتی تھیں.. آڈرے ہیپ برن جیسی ہی ہوتی تھیں..''

نپولین کے ساتھ شغف بامِ عروج پر آن پہنچا کہ ہمیں اُس کی مختلف جنگوں کی حکمت عملی بھی ازبر ہوگئی، یورپ، روس اور مصر کی جنگوں کی پوری تفصیل ہم فرفر بیان کر سکتے تھے یُوں جیسے ہم اُس کی فوج میں ایک وفادار شاندار گھڑسوار رہے ہوں..

اور ہم اکثر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہتے.. ''ناٹ ٹُو نائٹ جوزفین''

جوزفین اس کی محبوبہ تھی..

اس تاریخی فقرے کے جواز میں کہا جاتا ہے کہ جب نپولین کسی جنگ سے لوٹتا تھا تو اُس کی محبوبہ جوزفین اشتعال انگیز ہو کر اُس سے کوئی مطالبہ کرتی تھی تو وہ غریب اتنا نڈھال ہو چکا ہوتا تھا کہ مُنہ موڑ کر معذرت کرتا تھا کہ.. آج کی شب نہیں جوزفین۔

ہنگری کا بے مثال پیانو نواز فرانز لِز، زارِ روس کی ذاتی دعوت پر ایک بگھی میں سوار جب کہ کوچوان اُس کے آگے بندھے گھوڑوں کو مسلسل چابک سے پیٹتا اُنہیں بگٹٹ بھاگنے پر مجبور کر رہا تھا اور وہ بگھی ایک ویران اور برف آلود کائنات میں رُوسی وسعتوں میں چلی جاتی ہے تو فرانز لِز.. ایک سیاہ سُوٹ اور ہیٹ میں ملبوس اپنے منیجر سے کہتا ہے.. میں رُوس کو فتح کرنے کے لیے جا رہا ہوں..

جنگ جیت چکا تھا تو اُس کے چند جرنیلوں نے اُس کی حکم عدولی کی..لیکن اُس شب اتنی شدید بارش ہوئی کہ پورا میدان ایک دلدل میں بدل گیا اور اُس کے بہترین شاہسوار ہزاروں کی تعداد میں اپنے گھوڑوں سمیت ایک کھائی کو پار کرتے ہوئے زمین بوس ہو گئے..ہم اس شکست سے اتنے سوگوار اور آزردہ ہوئے جیسے ہم پر ایک کربلا وارد ہوگئی ہو..واٹرلو کی شکست کی سوگواری اس لیے بھی تھی کہ اس جنگ میں شامل دو جرنیل ایسے بھی تھے جنہوں نے برصغیر کے اکلوتے..اس کی مٹی میں سے جنم لینے والے بادشاہ یا مہاراجہ کی افواج کی تربیت کی جس کے نتیجے میں جب کہ پورے ہندوستان پر انگریزوں کا غلبہ تھا، وہ اُس مہاراجہ کی زندگی میں دریائے ستلج پار کرنے کی جرأت نہ کر سکے کہ اس کے پار نپولین کے دو جرنیلوں کی نگرانی میں تربیت یافتہ ایک منظم اور نڈر فوج تھی..اور اس فوج میں صرف سِکھ ہی نہیں مسلمان بھی پنجاب سے وفاداری کا عہد کیے ہوئے تھے..

نپولین کا دست راست جنرل ونتورہ اطالیہ میں پیدا ہوا..روس پر حملے کے دوران وہ اُس کا جاں نثار تھا لیکن واٹرلو کی شکست کے بعد وہ دل برداشتہ ہو گیا اور اُس نے کہا..ہر کوئی موت تک نہیں لڑ سکتا..تب وہ مشرق کی جانب چل پڑا..اور اُس نے واٹرلو کی شکست کا بدلہ لینے کی خاطر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں سرنگوں کر دیا..اور مہاراجہ نے اُس کا بھرپور استقبال کیا..اُس نے نہ صرف سکھ فوج کو منظم کیا اور اُنہیں یورپی جنگی حکمت عملی کے مطابق ترتیب دیا بلکہ اُس کے بہت سے دشمنوں کو بھی زیر کیا..اُس نے نوشہرہ کے قریب پٹھانوں سے جنگ کر کے اُنہیں فرار ہونے پر مجبور کر دیا اور اس فتح کا مہاراجہ پر گہرا اثر ہوا اور وہ اُس کی توصیف میں کہا کرتا تھا ''گرم خُون..پُختہ دماغ..بندہ مردانے'' یعنی اس کا خون گرم ہے اور دماغ بھی اُلٹا ہے۔ چنانچہ اسی کو تو مرد کہتے ہیں..مہاراجہ نے اُسے ''وفادار'' کے خطاب سے نوازا..ایک بار مہاراجہ نے اُس سے کہا کہ تم ایک پنجابی تب ہو سکتے ہو جب ایک پنجابی لڑکی سے شادی کر لو..ژاں بپٹی ونتورہ نے لدھیانہ کی ایک مسلمان لڑکی سے شادی کی لیکن چُونا منڈی لاہور کی ایک حویلی میں اُس کا ایک حرم بھی تھا جس میں پچاس کے قریب دوشیزائیں فروکش تھیں..وہ نہ صرف لاہور کا قاضی مقرر ہوا بلکہ اُس نے وزیر آباد کی گورنری کے دوران چیمہ اور چٹھہ جاٹوں کی سرکشی پر بھی قابو پایا۔

جنرل ونتورہ نے مہاراجہ کی خواہش پر ایک ایسی جنگ لڑی جو صرف ایک گھوڑے کے حصول

وہ جنگوں کے دوران کی کئی روز اپنے گھوڑے کی پشت پر گزار دیتا، افواج کی کمان کرنے کے دوران گھوڑے کی ایال تھام کر چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کر کے نیند میں چلا جاتا اور پھر تازہ دم ہو کر اپنے جرنیلوں کو احکام دینے لگتا.. وہ اپنی فوج کے ہزاروں افسروں کا حال چال دریافت کرتے ہوئے اُنہیں اُن کے مکمل ناموں سے مخاطب کرتا.. کسی نے اُس کی حیرت انگیز یادداشت کا راز پوچھا تو اس نے لاپروائی سے کہا.. میری یادداشت صرف ترتیب شدہ ہے.. اپنے افسروں کے نام.. ماضی میں لڑی جانے والی جنگوں کی حکمتِ عملی، یورپی حکمرانوں کی خصلتیں، گھوڑوں اور توپوں کی تعداد یہ سب میری یادداشت کے مختلف درازوں میں محفوظ ہیں.. مجھے جب کبھی ضرورت پیش آتی ہے تو میں متعلقہ دراز کھولتا ہوں اور وہ تفصیل میرے سامنے آ جاتی ہے۔

اُس سے جب پوچھا گیا کہ آپ فرانسیسی فوج میں ایک معمولی عہدیدار سے ترقی کرتے آخر فرانس کے شہنشاہ کیسے بن گئے تو اُس نے نہ تو اپنی لیاقت کی ڈینگیں ماریں اور نہ ہی اسے نصیب کا کھیل قرار دیا، اُس نے کہا، فرانس کا شاہی تاج ایک گٹر میں، گندگی کے ایک ڈھیر میں پڑا تھا تو میں نے اُسے اٹھا کر جھاڑ پونچھ کر کے اپنے سر پر رکھ لیا.. دریائے سین کے کنارے تاریخی کلیسا نوٹرڈیم میں جب رواج کے مطابق اُس کی تاجپوشی کی رسم ادا ہونے کو تھی اور فرانس کا سب سے بڑا لاٹ پادری یا آرچ بشپ شاہی تاج ایک طشتری پر سجائے اُس کی جانب بڑھ رہا تھا تا کہ وہ اپنے مقدس ہاتھوں سے اُسے نپولین کے سر پر سجا کر اُس کے لیے ہزاروں برس کی حکمرانی کی دعا دے تو نپولین نے ہاتھ بڑھا کر طشتری میں سے فرانسیسی تاج اٹھایا اور اُسے خود اپنے سر پر سجا لیا، یہ ثابت کرنے کے لیے کہ گزشتہ بادشاہوں کی مانند یہ تاج خود بخود اُسے وراثت میں نہیں ملا، اسے اُس نے اپنی عوامی قوت اور بے مثال فتوحات کے صلے میں خود حاصل کیا تھا..

نپولین اُن زمانوں میں ہمارے حواس پر سوار تھا اور وہ ان پر سوار چند لمحوں کے لیے اونگھ کر اپنی نیند پوری کر لیا کرتا تھا..

اور تب واٹرلو کی جنگ نے ہمارے خواب ریزہ ریزہ کر دیئے.. ہم نپولین کے بارے میں کوئی نئی کتاب پڑھتے، کسی نئی تحقیق کا مطالعہ کرتے تو ہم خواہش کرتے کہ اس کے آخر میں واٹرلو کی شکست نہ ہو..

ہمیں اُس کی دیگر مہمات کی مانند واٹرلو کی جنگ کا ایک ایک لمحہ ازبر تھا.. کیسے جب وہ یہ

سراپا خزاں کے رنگوں میں ڈھل جاتا ہے جیسے اُس نے زرد پتوں کا ایک پیراہن اوڑھ لیا ہو..

آس پاس دور دور تک کھیتوں کی ہریاول ابھی تک سرداوس میں ڈوبی ہوئی تھی اور اُن پر ایک ہلکی دُھند معلق تھی..

اور بالآخر واٹرلُو..

سیاحوں کے لیے مخصوص پارکنگ ایریا میں جب عمران ثاقب کی کاریخ بستہ سنگریزوں کو اپنے ٹائروں سے دباتی رُکی اور ہم باہر آئے تو ایک سرد جھرجھری سی ہمارے بدن میں کپکپانے لگی..صرف ہم ہی نہیں بلکہ پارکنگ ایریا میں ایک بنیاد پر ایستادہ نپولین کا مجسمہ بھی ٹھٹھر رہا تھا اسی لیے تو اُس نے اپنا بایاں ہاتھ واسکٹ کی اندرونی جیب میں روپوش کر رکھا تھا..

سامنے ایک ہریاول بھرے میدان میں سے واٹرلُو کی جنگ کی یادگار ایک اہرام کی صورت بلند ہوتی ہی چلی جاتی ہے جس کی چوٹی پر شائبہ ہوتا تھا کہ ایک شیر کا مجسمہ نصب ہے..یہ وہ مقام تھا جہاں ان علاقوں کا دل پسند شہزادہ مالٹا..یعنی پرنس اورنج نپولین کے سامنے صف آرا ہوا اور بمشکل اپنے زخموں سے جانبر ہوا..چوٹی پر نصب ببر شیر کے مجسّمے تک پوری سواد و سو سیڑھیاں بلند ہوتی تھیں اور ہم دیکھ سکتے تھے کہ بیشتر سیّاح یادگار کے دامن میں پہنچ کر ایک نظر اُن سیڑھیوں پر ڈالتے، آپس میں کچھ مشورے کرتے اور پھر کان لپیٹ کر اوپر جانے کا ارادہ ترک کر دیتے..

اس یادگار سے ذرا ادھر ایک وسیع سووینئر سٹور تھا جس میں داخل ہو کر عمران نے اپنے کریڈٹ کارڈ کی ایک جھلک دکھلا کر ہمارے لیے داخلے کے ٹکٹ حاصل کیے اور پھر ہم سب پر نپولین نے حملہ کر دیا، اُس کی افواج نے ہم پر یلغار کر دی..ایک سینما ہال کی وسیع سکرین پر ''واٹرلو'' فلم کے جنگی مناظر دکھائے جا رہے تھے اور پورے ہال میں جنگ و جدل کا ایسا سماں تھا کہ توپوں کے گولے عین ہمارے سروں پر پھٹ رہے تھے..اتنی تلواریں چل رہی تھیں کہ ہم اُن کی تیز دھاروں سے اپنی گردنیں بچانے کی فکر میں مبتلا ہو گئے..بگٹٹ بھاگتے، ہنہناتے ہزاروں گھوڑے کیچڑ کی کھائی میں اوندھے ہو کر ملیامیٹ ہو رہے ہیں اور اُن کے سوار جو ابھی..ویوا فرانس اور ویوا نپولین کے پرجوش نعرے لگاتے ناقابل تسخیر خدا لگ رہے تھے تو اگلے لمحے وہ زمین بوس ہو کر کیچڑ میں آلودہ ہو کر آخری سانس لے رہے تھے..اُدھر ڈیوک آف ولنگٹن یورپ کی تمام ریاستوں کی افواج کی کمان کرتے ہوئے اپنے گھوڑے پر سوار سپاہ کی ہمت بڑھا رہے تھے..نپولین یہ جنگ تقریباً جیت چکا ہے جب ایک گھنے جنگل

کی خاطر تھی..مہاراجہ رنجیت سنگھ اکثر یہ کہا کرتا تھا کہ مجھے صرف دو سرکش چیزیں پسند ہیں..سرکش عورتیں اور سرکش گھوڑے..اُسے علم ہوا کہ پشاور میں ''اسپ لیلےٰ'' نام کا ایک گھوڑا ہے جس کی خوبصورتی کی خبر روم کے سلطان اور ایران کے شاہ تک پہنچ چکی ہے..تو اُس نے ونتورہ کو حکم دیا کہ جنگ کرو اور وہ گھوڑا میرے لیے لے آؤ..اور وہ لے آیا..جنرل ونتورہ نے ''اسپ لیلےٰ'' کے لیے ایک خاص چھکڑا بنوایا جس کی حفاظت کے لیے پانچ سو فوجی ساتھ چلے آئے تھے..یہ گھوڑا بادامی باغ پہنچا تو مہاراجہ کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے اُسے یوں سجایا گیا کہ اُس کے گلے میں کوہ نور ہیرا دمکتا تھا..لاہور کے قلعے کے اندر دیوان خاص تک کے راستے کے دونوں جانب کنیزیں اُس ''اسپ لیلےٰ'' پر گلاب کی پتیاں برساتی تھیں اور وہاں مہاراجہ اپنے تخت سے اٹھ کر اُس گھوڑے کا استقبال کرتا ہے..اُس پر سوار ہوتا ہے اور وہ گھوڑا بدکتا نہیں..کہ مہاراجہ عورتوں اور گھوڑوں کو مطیع کرنے کا فن جانتا ہے..

لاہور کے شاہی قلعے میں ''اسپ لیلےٰ'' کا بھس بھرا بدن آج بھی محفوظ ہے..

نپولین کا دوسرا جنرل جس نے رنجیت سنگھ کی فوج کو منظم کیا فرانسس ایلرڈ تھا..وہ ایک پٹھان کا رُوپ دھار کر ایران اور افغانستان کے راستے لاہور پہنچا تھا..جنرل ایلرڈ اور اُس کی بیٹی شارلٹ کی رہائش کے لیے مہاراجہ نے انارکلی کا مقبرہ مخصوص کیا..دونوں باپ بیٹی پرانی انارکلی میں منشی چیمبر کے عقب میں دفن ہیں..

لاہور ایک اور فرانسیسی روایت کا امین بھی ہے..شادی بیاہ کے موقعوں پر دولہا کے آگے موسیقی کی دُھنیں بجانے والے بینڈ کے موسیقار فرانسیسی سپاہیوں کی وردیوں میں ملبوس ہوتے ہیں..

کہا جاتا ہے کہ ہر شخص کبھی نہ کبھی اپنے واٹرلُو سے دوچار ہوتا ہے..

یعنی فتح یقینی ہوتی ہے لیکن نصیب اُسے شکست سے دوچار کر دیتے ہیں..

اپنے زمانے میں میں نے پورا یورپ پیدل چھان مارا تھا لیکن واٹرلُو کا میدان اَن دیکھا رہ گیا تھا..

واٹرلُو کی جانب سفر کا آغاز کرتے ہوئے ایک ایسا منظر تھا جو میری آنکھوں میں نقش ہو گیا..برسلز کا کم از کم یہ مضافاتی علاقہ خوش آثار اور پرکشش تھا..ایک شخص جوگنگ کرتا چلا جا رہا ہے اور جس لمحے ہم اُس کے قریب سے گزر رہے ہیں، وہ ایک خزاں رسیدہ جنگل میں یوں داخل ہو رہا ہے کہ اُس کا

واٹرلو کے میدان میں سر بکف فرانسیسی اور یورپی افواج آپس میں بھڑ رہی ہیں..وہاں صرف تصاویر اور فوجیوں اور گھوڑوں کے مجسّمے ہیں جنہیں موسیقی کی بلند آہنگی سے زندہ کیا جا رہا ہے..ہمارے کان دھماکوں اور افواج کے شور وغُل سے بہرے ہونے لگے تھے جب ہمیں اطلاع دی گئی کہ اب..ہم ایک ایسے ہال میں داخل ہوں گے جہاں واٹرلُو کی جنگ کی وہ تصاویر آویزاں ہیں جو ممتاز مصوروں نے پینٹ کی ہیں اور یہاں میمونہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اُس نے کہا..''نپولین بہت ہو گیا..مجھے مزید نپولین نہیں دیکھنا..''

موسیقی کی ایک محفل میں فریدہ خانم اپنی آواز کے طلسم سے حاضرین کو تسخیر کر رہی تھیں، چونکہ اُن کے سامنے اگلی نشستوں پر علامہ اقبال کی بیٹی تشریف فرما تھیں تو قابل فہم طور پر فریدہ اُن کے اعزاز میں حضرت علامہ کا کلام گائے چلی جا رہی تھیں..اور جب اس کلام نے بہت ہی طُول پکڑا تو علامہ کی دختر نیک اختر کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا اور اُنہوں نے ایک خالص لاہوری انداز میں کہا''فریدہ جی..ابّا جی بہت ہو گئے..اب وہ سنا دیں..جُتّی قصوری..ہائے وے ربّا مینوں چلنا پیا''تو کُچھ اسی طور میمونہ بھی نپولین سے باغی ہو گئی..کہ مجھے مزید نپولین نہیں دیکھنا، مجھے یقین ہے کہ اُس لمحے نپولین اپنی قبر میں بہت بے آرام ہوا ہو گا کہ مجھ پر یہ دن بھی آنا تھا کہ ایک معمولی پاکستانی ادیب کی اہلیہ یہ کہہ رہی ہے کہ..نپولین بہت ہو گیا..

نپولین کو کیا معلوم کہ اُس معمولی پاکستانی ادیب کی اہلیہ نے شادی کے اگلے روز ہی یہ بھی کہہ دیا تھا..بس اب تم بہت ہو گئے ہو..

♦♦.....♦♦.....♦♦

میں پوشیدہ ایک بوڑھا شیر..ایک آسٹرین جنرل تلوار سونت کر حملے کا حکم دیتے ہوئے چیختا ہے..آج ہم قیدی نہیں لیں گے..نو پرزنرز..اور فرانسیسی فوج پر ٹوٹ پڑتا ہے..یہ وہ لمحہ ہے جب نپولین کی جیت میں کچھ شبہ نہ رہا تھا..

رات کی بارش نے واٹرلُو کے میدان کو ایک وسیع دلدل میں بدل دیا تھا اور جب دس ہزار سے زائد شاہانہ جری فرانسیسی گھڑسوار اور اُن کے گھوڑوں کے نتھنے پھولتے تھے اور سواروں کے چہرے غضب اور جرأت سے دمکتے تھے جب ناگہاں ایک گھاٹی راستے میں آجاتی ہے جو بارش کے باعث دلدل ہو چکی ہے تو وہ شاہسوار ابھی خدا تھے اور ابھی ملیامیٹ ہو رہے تھے، اُس کیچڑ میں دفن ہو رہے تھے، اور یہ کوئی عام سے گھڑسوار نہ تھے..ان میں فرانس کے شہزادے ڈیوک اور اشرافیہ کے جوان تھے..وہ پل بھر میں اپنی شاہانہ وردیوں، ٹوپیوں پر لہراتے رنگین پروں اور چمکتی تلواروں سمیت اپنے خوبصورت بدنوں کے ساتھ فنا کی گھاٹی میں اتر گئے..جنگ کا پانسا پلٹ گیا..

نپولین کے چہرے پر بے یقینی کے ہمراہ حیرت کے سائے ہیں کہ پل بھر میں یہ کیا ماجرا ہو گیا..میں ابھی تو یہ جنگ پورے یورپ کے خلاف یہ جنگ جیت چکا تھا اور ابھی میرے ساتھی اور میرے جنرل مجھ سے درخواست کر رہے ہیں کہ اے شہنشاہ ہم ہار گئے ہیں، یہ میدان چھوڑ دیجیے کہ ابھی فرانس کو آپ کی ضرورت ہے..اور اُسے پسپائی کی عادت نہیں ہے اور وہ انکار کر دیتا ہے اور پھر اس کے جنرل اُسے باقاعدہ دھکیلتے ہوئے زبردستی میدان واٹرلُو سے نکال کر لے جاتے ہیں..پیرس پہنچ کر وہ تخت سے دست بردار ہو جاتا ہے اور اس مرتبہ اُس کے انگریز حریف اُسے پھر سے ایلبا کے جزیرے میں قید نہیں کرتے جہاں سے وہ بھاگ نکلا تھا اور دوبارہ فرانس کا شہنشاہ بن بیٹھا تھا بلکہ اُسے سینٹ ہلینا کے جزیرے میں پابند سلاسل کر دیا جاتا ہے..وہ آخری دم تک واٹرلو کی شکست کے لیے اپنے جرنیلوں کو مورد الزام ٹھہراتا رہا کہ انہوں نے اُس کی جنگ حکمت عملی پر عمل نہیں کیا تھا، احکام سے روگردانی کی تھی اور یہ حقیقت ہے کہ اگر وہ نپولین کی حکم عدولی نہ کرتے تو یہ جنگ ایک شکست میں تبدیل نہ ہوتی..

جب میں پہلی بار پیرس گیا تو میں نے نپولین کی قبر ''انولیڈ'' پر ایک مُرید کی مانند حاضری دی..ممکن نہ تھا ورنہ میں اُس کی سنگ مرمر کی قبر پر ایک سبز رنگ کی چادر چڑھا دیتا..قبر کے اردگرد بالکونیوں سے درجنوں یورپی ملکوں کے پرچم سرنگوں تھے جو نپولین نے سرنگوں کیے..

اُس سینما ہال سے فارغ ہوئے تو سیڑھیاں طے کرتے ایک اور مقام پر آ گئے جہاں چہار سُو

اور ہم دونوں پہلی دس پندرہ سیڑھیاں تو نہایت متانت اور بظاہر آسانی سے چڑھ گئے اور پھر ہر دوسری سیڑھی کے بعد اس بہانے کے ہم تھکے تو نہیں محض اس بلندی سے آس پاس پھیلے ہریاول میدان کے نظارے کرنے کے لیے رُکے ہیں.. تھکے تو نہیں... عزت نفس کی خاطر ہونکتے ہانپتے ایک ایک سیڑھی ایک ایک کوہ گراں تھی اُسے پار کرتے چڑھتے گئے کہ اگر واپس ہو گئے تو ہماری خودی کو ناقابلِ رفو ٹھیس پہنچے گی اور دوسروں کی نظروں میں رسوا ہو جائیں گے..

1952ء کے سیلاب کے دوران جب پورا پنجاب پانیوں میں ڈوب چکا تھا.. سڑکیں اور ریل کی پٹڑیاں سیلاب بہالے گیا تھا اور تاحد نظر ایک سمندر تھا تو میرے ماموں جان لاہور سے نکلے اس مصمم عزم کے ساتھ کہ وہ بہر طور تیرتے ہوئے اپنے آبائی قصبے گکھڑ تک پہنچ جائیں گے تو شاہدرہ کے قریب چند لوگوں نے انہیں اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی کہ چوہدری صاحب.. آگے مت جائیے سیلابی دھارے اتنے ہولناک اور تیز و تند ہیں کہ انسان تو کیا درخت اور گھر بھی اُن کی زد میں آ کر اپنی جڑوں اور بنیادوں سے اکھڑتے جا رہے ہیں تو ماموں مرحوم نے جو کہ دراز قامت اور سجیلے جوان تھے نہایت متکبر ہو کر کہا تھا کہ.. تم جانتے ہو کہ میرا نام نذیر حسین چیمہ ہے اور جب میں ایک قدم اٹھا لیتا ہوں تو وہ قدم کبھی واپس نہیں ہوتا.. ماموں جب اُن لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو کر سیلابی دھارے کے کنارے تک پہنچے، اُس میں قدم رکھا تو پانیوں کی تیزی نے اُنہیں ایک آبی پہلوان کی مانند دھوبی پٹڑا دیا.. شلوار پانیوں سے پھول کر غبارہ ہو گئی اور وہ غوطے کھاتے بمشکل باہر آئے.. اب وہ کس مُنہ سے واپس جاتے.. رات ہونے تک وہیں بیٹھے رہے اور جب یقین ہو گیا کہ وہ لوگ جن کے سامنے اُنہوں نے اعلان کیا تھا کہ میں اگر ایک قدم اٹھالوں تو پھر واپس نہیں جاتا.. جا چکے ہوں گے تو تاریکی کا فائدہ اٹھا کر ٹھنڈے ٹھنڈے اور گیلے گیلے واپس آ گئے.. ہمارے ساتھ بھی یہی ماجرا ہو گیا تھا..

ہم کس مُنہ سے واپس جاتے، یاد رہے کہ جب میں اُس چیمہ ماموں کا لاڈلا بھانجا تھا تو میں بھی کیسے ہار مان لیتا..

سیڑھیاں چڑھنا اتنا دشوار نہ تھا لیکن جوں جوں ہم بلند ہو رہے تھے سردی اور تیز ہوا کی کاٹ ہمارے بدنوں کو کاٹتی چھید کر رہی تھی.. صرف تیس چالیس سیڑھیاں باقی رہ گئی تھیں جب میں نے دیکھا کہ میمونہ تھکن سے نہیں سرد ہوا کے تھپیڑوں سے لاچار ہوئی جا رہی ہے اور اپنا توازن قائم رکھنے کی خاطر بار بار ریلنگ کا سہارا لیتی ہے تب میں نے اُس سے گزارش کی کہ وہ واپس چلی جائے اور اس بار شاید

''نپولین کافی اور جوزفین آج کی شب نہیں''

میدانِ واٹرلو میں ایستادہ اُس یادگار اہرام کی چوٹی کی جانب اٹھتی سوا دو سو سیڑھیوں کو عمران ثاقب نے دیکھا، پھر مجھے دیکھا۔ ''تارڑ صاحب یہیں سے نظارہ کر لیجیے۔ اس عمر میں تو مسجد کی سیڑھیاں چڑھنے سے بھی گریز کرنا چاہیے اور ویسے بھی چوٹی پر سوائے ایک شیر کے اور کچھ نہیں۔''

''میں نے جانا ہے۔''

''اوپر کچھ بھی نہیں۔ سوائے ایک شیر کے۔''

''میں نے ایک مدت سے کوئی شیر نہیں دیکھا۔ اگر وہاں ایک شیر ہے بے شک پتھر کا ہے پھر بھی میں نے جانا ہے۔ ایورسٹ کے ایک کوہ پیما سے جب یہ دریافت کیا گیا کہ آخر آپ پہاڑوں کی چوٹیوں کو سر کرنے کی خاطر اپنی جان جوکھوں میں کیوں ڈالتے ہیں، کیوں چڑھتے ہیں پہاڑوں پر تو اُس نے کیسا فلسفیانہ جواب دیا تھا کہ۔ اس لیے کہ وہ وہاں ہیں۔ اسی طور اگر وہ شیر وہاں ہے تو میں نے جانا ہے۔''

میمونہ اپنے کلارک کے جوگرز میں اپنی بہو کی سٹائلش سمور کے کالر والی سیاہ جیکٹ میں لپٹی سردی سے شُوں شُوں کرتی کشاں کشاں میرے ساتھ چلی آتی تھی تو عمران نے مجھ سے مایوس ہو کر اُس سے درخواست کی کہ بیگم صاحبہ آپ تو۔ اور وہ مردِ ناداں نہیں جانتا تھا کہ اس بیگم صاحبہ میں نیم بڑھاپے کے باوجود راجپوت خون اپنے تمامتر اکھڑپن اور جہالت کے ساتھ موجزن ہے۔ ''ابھی دو چار ماہ پہلے ہم سمیر کی گریجوایشن میں شامل ہونے کی خاطر کارنیل گئے تھے تو وہ ہمیں ایک حیرت بھرے آبشاروں اور تالابوں والے ایک ایسے چٹانی درّے میں لے گیا تھا جہاں ہم نے بلندی تک جاتی پوری ساڑھے پانچ سو سیڑھیاں طے کی تھیں اور یہ۔ سوا دو سو سیڑھیاں، میں انہیں کیا سمجھتی ہوں۔ اونہہ۔''

عمران، رضا اور اُن کے بال بچے اچھلتے کودتے سیڑھیاں طے کرتے ہم سے آگے نکل گئے

اور جب آئی تو شیشے کے گلاس میں آئی جس میں اُس کی دو تہیں الگ الگ عیاں تھیں.. بالائی سطح پر کافی کی سیاہ گھناوٹ تھی اور نچلی سطح کسی زرد محلول سے لبریز تھی، ایک گھونٹ بھرا تو کافی طبق روشن ہو گئے اور اُس کیفے میں براجمان جتنے بھی لوگ تھے وہ نپولین نظر آنے لگے۔

عمران ثاقب اپنی میزبانی کا حق ادا کرنے کے لیے ذاتی طور پر ہمیں واپس ہالینڈ لے جا رہا تھا.. میمونہ کے ناتواں بدن میں واٹرلو کے میدان کی شدید سردی اب بھی کپکپاتی تھی جب میں نے اُن سے پوچھا کہ.. کیا تم کچھ کھانا پسند کرو گی؟

تو اُس نے کار کی حدّت آمیزی میں ٹھٹھرتے ہوئے کہا ''آئس کریم۔''

میمونہ خوراک سے کچھ شغف نہیں رکھتی، اتنا کم کھاتی ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ یہ ابھی تک زندہ کیسے ہے لیکن تین چیزیں ہیں جن میں اُس کی جان اٹکی ہوئی ہے.. اور جان کنی کی حالت میں بھی اُن سے انکار نہیں کرے گی.. سرفہرست ہے دیسی خالص کھوئے کی برفی.. انجیر اور آئس کریم..

بعد ازاں سویڈن کی ایک قہر انگیز سرد یلی منجمد رات میں جب کہ درجہ حرارت منفی سے جانے کتنے درجے گر چکا تھا، آس پاس برفوں کے انبار تھے اور آسمان سے بھی روئی کے سفید گالے اگرتے تھے یہاں تک کہ گھروں کے باہر جو سائیکلیں تھیں وہ بھی برف میں اٹی ہوئی تھیں اور وہ بے اختیار ٹھٹھرتی سردی سے لاچار ہوتی لگتا تھا کہ آخری دموں پر ہے تو میں نے پوچھا ''میمونہ کچھ کھاؤ گی'' تو اس نے گھگھیائی ہوئی منجمد ہوتی سرگوشی میں کہا ''آئس کریم..''

چنانچہ ہم شاہراہ سے الگ ہو کر ایک روشن سٹور میں چلے گئے کہ وہاں..

آئس کریم..

ہیگ پہنچے تو ناجیہ اور اعزاز اداس چہرے لیے رات کے کھانے پر ہمارے منتظر تھے..

اُس شب.. کچھ دیر پہلے نیند سے، میرے منتشر شدہ حواس میں یہ نپولین تھا جو اپنی محبوبہ سے معذرت کرتا تھا کہ.. ناٹ ٹو نائٹ جوزفین.. آج کی شب نہیں جوزفین..

شاید نپولین اسی لیے مجھے عزیز تھا کہ میں بھی عمر کے اس حصے میں کسی بھی جوزفین کی چاہت اور خود سپردگی کی فرمائش پر بہانہ بنا سکتا تھا کہ.. جوزفین آج کی شب نہیں..

♦♦.....♦♦.....♦♦

زندگی میں پہلی بار اس نے میرا کہنا مان لیا..اس لیے بھی کہ وہ ایک پریکٹیکل عورت ہے..اُس نے مجھ سے کچھ بحث نہ کی کہ صرف تیس چالیس سیڑھیاں ہی تو باقی ہیں تو میں واپس نہیں جاؤں گی..وہ واپس ہوگئی..اور میں وہیں کھڑے ہو کر اُسے سیڑھیاں اترتے دیکھتا رہا، وہ ایک بے چارگی کے ساتھ بے سہارا محسوس کرتی مجھ سے دور ہوتی جا رہی تھی اور اُس لمحے میں نے اُس کے لیے اپنے دل میں بے پناہ محبت محسوس کی..میرا دل اُس کی محبت سے بھر گیا..

اُس یادگار کی چوٹی پر پہنچ کر میں نے اُس کے نواح میں پھیلے واٹرلو کے میدان پر ایک نظر کی..

اور ایک ایسا لمحہ مجھ پر آیا جب اس جنگ کے سارے منظر میرے سامنے زندہ ہونے لگے..میں اُس فارم ہاؤس کو دیکھ سکتا تھا جس کے حصول کے لیے اتنی خوں ریزی ہوئی..وہ گھنا جنگل جواب نہ تھا جہاں سے آسٹریا کا بوڑھا جنرل ''ہم قیدی نہیں لیں گے'' دھاڑتا نپولین پر حملہ آور ہوا تھا..اور وہ کھائی جہاں فرانس کے شہ سوار منہدم ہو کر فنا ہوئے تھے..یہاں تک کہ وہ مقام بھی میری آنکھوں کے فوکس میں آ گیا جہاں نپولین کے جنرل اُسے زبردستی دھکیلتے ہوئے میدانِ جنگ سے باہر لے گئے تھے..

یہ سب منظر مجھے ایک آبی پردے کے پار دھندلے دکھائی دیئے کہ چوٹی پر ہوا اتنی تیز تھی کہ آنکھوں میں پانی بھرتی تھی..

اور وہ شیر..وہ تو چوٹی پر سے دکھائی ہی نہ دیتا تھا..کہ وہ ہمارے سروں پر سایہ فگن تھا..

میں دیکھ بھال کر آہستہ آہستہ وہ سوا دو سو سیڑھیاں اُترتا نیچے آ گیا..

نیچے عمران، رضا اور میمونہ میرے منتظر تھے..

یادگار کے سامنے سڑک کے پار ایک کیفے نپولین یا کچھ کیفے تھا جس کے مطمئن اور آسودہ ماحول میں چند ایک مقامی لوگ تھے اور بیشتر سیاح تھے اور اُن میں جاپانی بہت تھے جو یورپ، امریکہ اور کینیڈا میں ان دنوں بہت ہوتے ہیں، جاپانی سیاح کچی مچھلی کے ساتھ نپولین برانڈی کے گھونٹ بھرتے تھے کہ واٹرلو کے میدان میں بھلا اور کونسا ایسا مشروب ہے جسے بھرا جا سکتا ہے..

چونکہ ہم شریعت کے پابند مومن تھے اس لیے ہم نے محض گرم کافی کا انتخاب کیا۔اگرچہ میں نے ذرہ بھر انحراف کیا، عمران کو عندیہ دیا کہ اگرچہ میں بھی کافی پیوں گا لیکن آئرش کافی کو ترجیح دوں گا..

ہر ایک کے لیے کافی آ گئی لیکن جانے میری کافی براہ راست آئرلینڈ سے منگوائی جا رہی تھی کہ کافی دیر ہو گئی..

ہی خدوخال والے غیر ملکی نے اُن کے سب سے بڑے تخلیقی دیوتا کے پوتے کو بیدردی سے قتل کر دیا تھا.. دنیا بھر میں جہاں کہیں بھی کوئی ایک شخص ایسا ہے جسے مصوری سے کُچھ شغف ہے، رنگوں کے سحر میں مبتلا حُسن کا شیدائی ہے تو وہ ہالینڈ کے نہ کسی بادشاہ کے نام سے واقف ہے اور نہ کسی ملکہ کے بارے میں کُچھ علم رکھتا ہے.. وہ شاید یہ بھی نہیں جانتا کہ یہ ہالینڈ نام کا ملک ہے کہاں لیکن وہ ونسنٹ فان خوخ کو جانتا ہے اور اُس کی تصویروں کی جادوگری ایسی ہے کہ وہ اس بیکار زندگی میں ایسے رنگ بھرتی ہے کہ وہ بامقصد اور خوبصورت ہو جاتی ہے.. میں بھی فان خوخ کے ستاروں، سورج مکھی کے پھولوں اور سرو کے درختوں کا اسیر ہوں..

یہ قصہ ایک معمولی سی ڈاکومنٹری فلم ''فتنہ'' سے شروع ہوا.... اس کا تصور ایک متعصب تنگ نظر ڈچ شخص کے اخروٹ جتنے دماغ میں آیا اور اُس نے اس فلم کی ہدایتکاری کے لیے فان خوخ کے پوتے کی خدمات حاصل کیں اور وہ بھی کوئی ایسا نامی گرامی ہدایتکار نہ تھا.. اپنے داستانوی دادا کی شہرت کی کھٹی کھاتا تھا.. ''فتنہ'' ایک بنیاد پرست محدود ذہن کے مالک شخص کی جہالت کی آئینہ دار تھی.. اُس نے اسلام کو یورپ اور خاص طور پر ہالینڈ کے لیے ایک ''فتنہ'' ثابت کرنے کی کوشش کی تھی.. یہ ایک ایسی ڈاکومنٹری تھی جسے محدود سے چند لوگوں نے دیکھا کہ ایسی سینکڑوں ڈاکومنٹریز بنائی جاتی ہیں، اُنہیں چند لوگ دیکھتے ہیں اور فراموش کر دیتے ہیں.. یورپ میں ہر فلم میکر کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ کوئی سنسنی خیز اور چونکا دینے والی بے شک سراسر دروغ گوئی پر مبنی فلم بنائے اور لوگوں کی توجہ حاصل کر لے.. اس ڈاکومنٹری کو بھی زیادہ سنجیدگی سے نہ لیا گیا.. ہالینڈ میں مجھے کوئی ایک بھی شخص ایسا نہ ملا جس نے یہ ڈاکومنٹری دیکھی ہو لیکن سب نے اس کے بارے میں سُن رکھا تھا صرف اس لیے کہ کسی ایک پاکستانی نے اسے سنجیدگی سے لے لیا اور فان فوخ کے پوتے کو قتل کر کے سرخرو ہو گیا..

ہم اس وقوعے کے نتیجے میں ظہور پذیر ہونے والے ردعمل کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں اگر ہم یہ تصور کر لیں کہ ہمارے اپنے پاکستان میں ایک یورپی شخص صرف اس لیے آباد ہے کہ یہاں اُسے غربت اور بے روزگاری سے پناہ ملی ہے، اُسے آئین کے تحت وہ تمام حقوق حاصل ہیں جو کسی بھی پاکستانی کو حاصل ہیں اس لیے کہ اب وہ ایک پاکستانی شہری ہے.. وہ یہاں ایک آسودہ زندگی بسر کرتا ہے اور رزق کماتا ہے اور پھر محض مثال کے لیے وہ.. علامہ اقبال کے پوتے کو قتل کر دیتا ہے تو اس صورتِ حال میں ایک عام پاکستانی کے جذبات کیا ہوں گے... میرا خیال ہے کہ ہم اتنے طیش میں آئیں گے کہ اپنے ملک

''ہیگ میں خزاں کے زرد آنسو پتّے گرتے جاتے ہیں''

وہ سفید گھر..ایک خواب ناک مینڈرلے..جس کے گرد جتنے بھی شجر پُرفسوں تھے وہ خزاں کی دیوی کے چرنوں کو چُھونے کے لیے اپنے جگر گوشے زرد پتّے گراتے تھے،خود تہی دامن ہوئے جاتے تھے لیکن خزاں کے قدموں کا دامن بھرتے تھے..اس گھر کی سفید بالکونیاں ایسی تھیں جیسے کسی جولیٹ کی منتظر ہوں اور اُن کے نیچے ہریاول یوں بچھتی تھی جیسے کسی رومیو کے قدموں تلے آنے کو ترستی ہو..یہ سفید گھر اور اس پر اُمڈتے ہوئے خزاں آلود شجر ہماری جڑوں میں بیٹھ گئے..ہم آرام طلبی کے شکار ایسے افیونی ہوگئے جو کسی لوٹس آئے لینڈ میں اونگھتے ہوں..ہم بحرالکاہل ہوگئے..

میں حسبِ علّت ہیگ کی سرد سویروں میں سیر کے لیے نکل جاتا اور گھر سے باہر جاتے ہوئے وہ ریموٹ جیکٹ کی جیب میں رکھنا نہ بُھولتا جس کا ایک بٹن دبانے سے آہنی پھاٹک کُھل جاسم سم..ہولے ہولے وا ہونے لگتا..ایک روز ریموٹ کا بٹن دبا کر پھاٹک کھولا اور بے دھیانی میں اُسے صدر دروازے کی اُس میز پر بُھول گیا جس پر ملاقاتی کتابی دھری تھی جس پر پاکستانی پرچم سایہ کرتا تھا..سیر سے واپسی پر جیکٹ کی جیب ٹٹولی تو ریموٹ ندارد..چنانچہ میں نے بند پھاٹک کے ستون میں نصب انٹرکام کے بٹن کو دبایا اور سپیکر کے قریب مُنہ لاکر ''ہیلو ہیلو..کوئی ہے'' پکارنے لگا۔اس دوران قریب سے گزرتی ایک ڈچ خاتون اپنے دبیز کُتے کے ہمراہ جو دل آویزی میں اُس سے کہیں برتر تھا،لحہ بھر کے لیے ٹھٹک گئی کہ یہ غیر ملکی جو شکل سے مسلمان سا دکھائی دیتا ہے جانے اس شاندار رہائش گاہ کے گیٹ میں کوئی آتش گیر مواد چپکے چپکے نصب کر رہا ہے..

اگر ان دنوں ایک ڈچ شہری کسی گندمی رنگت کے شخص کو ذرا خفیہ انداز میں کسی رہائش گاہ کے ستون سے ناک جوڑے دیکھتا ہے اور ٹھٹک جاتا ہے تو آپ اُسے موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے..کہ کسی ایسے

بھی میرا گمان تھا کہ ہر یرسو مجھے دیکھتے ہوئے اپنا تیرنا لمحہ بھر کے لیے موقوف کر دیتی تھیں کہ یہ کون آیا سویرے سویرے..ایک مانوس اجنبی کہاں سے آیا اور کیوں آیا؟

واپسی پر ناشتے کی میز پر وہ میرے منتظر ہوتے..اعزاز اپنی نوخیز مسکراہٹ اور خوش لباسی میں سفارت خانے جانے کے لیے تیار اور ناجیہ ایک ٹیولپ کی مانند تروتازہ اور کھلتی ہوئی..

اور وہ قطعی طور پر نظر انداز کر دیتے کہ میرے جوگرز کے تلوں سے چپکی ہوئی گھاس اُن کے سن روم کے قالین کو پراگندہ کر رہی ہے..

بعد ازاں میں قیلولہ کرتا..اور میمونہ..وہ ناجیہ کے ہمراہ کہیں نہ کہیں نکل جاتی..جانے کہاں..لیکن نکل جاتی اور میں قیلولہ کرتا رہتا..کیسی افیونیوں ایسی بامقصد حیات تھی..اور باہر..ایک سرد آسمان تلے جتنے بھی شجر تھے..وہ خزاں کی آزردگی اور اداسی میں زرد آنسو بہاتے چلے جاتے تھے..وہ دراصل میری حیات کے پرتو تھے..آزردہ اور خزاں رسیدہ..کوئی دن جاتا تھا جب حیات کے شجر کا آخری پتہ اپنی نمود کی شاخوں سے جُدا ہو کر زمین بوس ہوتا تھا..خاک نشیں ہوتا تھا..

♦♦.....♦♦.....♦♦

میں مقیم جتنے بھی یورپی پناہ گزین ہیں اُنہیں قتل نہیں کریں گے تو ملک بدر ضرور کر دیں گے۔

لیکن اہل ہالینڈ نے اس نوعیت کا ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ صرف یہ کہ مجھے ایک پھاٹک کے ستون کے قریب دیکھ کر ایک ڈچ خاتون لمحہ بھر کے لیے ٹھٹک جاتی ہے..

اس دردناک قصّے کا المیہ یہ ہے کہ یہ فان خوخ کا پوتا قصوروار نہ تھا.. اُسے تو ایک ڈاکومنٹری بنانے کے لیے معاوضہ دے کر اس کی پروڈکشن کے لیے چُنا گیا تھا... اور وہ جو اصل مُجرم تھا جس نے اس شرانگیز ڈاکومنٹری کی سکرپٹ تیار کی اُس کی جانب کسی کا دھیان نہ ہوا.. اور اُس نے فان خوخ کے پوتے کے قتل کا پرچم بلند کر کے ایک متعصّب سیاسی پارٹی کی بنیاد رکھ دی.. جس کا منشور یہ تھا کہ ہالینڈ میں مقیم جتنے بھی مسلمان ہیں اور خصوصی طور پر جتنے بھی پاکستانی ہیں وہ سب کے سب دہشت گرد جہادی ہیں جو ہمارا نمک کھاتے ہیں اور ہمارے قومی ہیرو فان خوخ کے پوتے کو ہلاک کر دیتے ہیں تو انہیں اس ملک سے نکال دیا جائے... نفرت کے اس منشور کی بنیاد پر اُس نے ہالینڈ کی پارلیمنٹ میں تقریباً سترہ نشستیں حاصل کر لیں اور ان دنوں وہ مخلوط حکومت میں برسر اقتدار ایک ایسا شعلہ بیان مقرر ہے جس کا ایک ہی نعرہ ہے کہ ان مسلمانوں کو ہالینڈ سے نکال دیا جائے.. انہیں ان کے آبائی ملکوں کی بُھوک اور بیروزگاری کے حوالے کر دیا جائے.. صرف یہی نہیں وہ ایک اور ڈاکومنٹری ''فتنہ-2'' کے نام سے بنا رہا ہے.. ڈچ پارلیمنٹ کے روشن دماغ اُن ممبروں کے لیے جو اُس کے نفرت انگیز رویوں سے اختلاف کرتے، ہالینڈ کے آئین میں درج ہر مذہب کے احترام اور اُس پر عمل پیرا ہونے کے قانونی حق کی حمایت کرتے ہیں، وہ یہ ثابت کرنے پر تُلا ہوا ہے کہ اسلام ایک مذہب نہیں، دہشت گردی، خوں ریزی اور قتل کا ایک فرقہ ہے.. مذہب نہیں.. اور اُسے یہ ثابت کرنے کے لیے کافی شواہد ہم خود مہیا کر رہے ہیں..

میں مقفل آہنی دروازے کے ستون میں نصب انٹرکام کے قریب اپنا مُنہ لا کر جب ہیلو ہیلو کر رہا تھا تو بالآخر اس میں سے جمیل کی مترنم گاتی ہوئی آواز آئی.. کون ہے.. میں ہوں.. میں ہوں.. اچھا اچھا.. تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے..

مینڈرلے کے خوابناک مینشن کا آہنی پھاٹک ہولے سے وا ہونے لگا..

اس خوابوں کے سفید قصر کے نواح میں تقریباً چار پانچ کلومیٹر کے دائرے کے اندر جتنے بھی گلی کُوچے اور بازار تھے اُن کے پتھریلے فرش میرے جوگرز تلے آ کر مجھے جان کر مجھے خوش آمدید ہر سو یر کہتے تھے، یہاں تک کہ انجماد کی قربت میں نہروں کے جو پانی تھے، اُن میں تیرتی بطخیں اور مرغابیاں

''کیا ملاقات ممکن ہے..اگر ہو سکے تو میرے فنکشن میں شریک ہو جاؤ..مجھے خوشی ہوگی..''

''مستنصر..''اس کی آواز میں عمر بھر کی تھکاوٹ اور زمانے کی ناقدری کی نقاہت تھی..''تم نہیں جانتے میں کس حال میں ہوں..مجھ سے ہیگ تک کا سفر نہ ہوگا..''

مجھے ایک کار اور شوفر کی سہولت حاصل تھی اور میں در پردہ خواہش کرتا تھا کہ اگر وہ میرے پاس نہیں آ سکتا تو میں اُس کے پاس چلا جاؤں لیکن مجھے کوئی اشارہ نہ ملا..اُس کے لہجے میں بیزاری اور بیگانگی تو نہیں تھی پر کچھ حوصلہ افزائی بھی نہ تھی اور میں نے کچھ شکایت نہ کی کہ اگر وہ اپنی تنہائی اور پوشیدگی برقرار رکھنا چاہتا ہے تو یہ اُس کا حق ہے جس سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا..مجھے مایوسی تو نہیں قلق ہوا کہ میں اپنے ایک دیرینہ دوست سے ملاقات نہ کر سکا..

ایک نام اسد مُفتی کا تھا..مجھے یاد ہے کہ ہالینڈ میں سکونت اختیار کرنے کے بعد وہ ایک دو بار چیمبرلین روڈ پر واقع میری سبزیوں اور پھولوں کی بیجوں کی دکان ''کسان اینڈ کمپنی'' پر مجھ سے ملاقات کرنے کے لیے آیا تھا اور اُسے اپنے ڈچ گھر کے لیے ایسے بیج درکار تھے جو درون خانہ پنپ سکیں اور بیلوں کی صورت اختیار کر کے اُسے پاکستان کی یاد دلا سکیں...ایک دو بین الاقوامی ادبی کانفرنسوں میں بھی آمنا سامنا ہوا..میں نے اعجاز سیفی سے درخواست کی کہ وہ اسد مُفتی سے رابطہ کر کے اُسے میرے فنکشن پر مدعو کرے تا کہ تجدید ملاقات ہو سکے..سیفی کے معنک چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ تھی جب اُس نے مجھے اطلاع کی کہ مُفتی صاحب نے پوچھا تھا کہ کیا اس فنکشن میں مجھے بھی سٹیج پر آ کر کچھ کہنا ہے..اگر نہیں تو اس فنکشن میں آنے کا فائدہ..اُس نے انکار کر دیا تھا..یہ ملاقات کی خواہش نہ دوستی پر اور نہ ہی کسی کی گراں قدر صلاحیت پر مبنی تھی..یہ انگریزی زبان میں ایک کامن کرٹسی تھی، جسے میں نے نبھا دیا..

اور پھر فاروق خالد تھا..وہ بھی شاید تیس برس سے اسی گُل لالہ اور آبِ روانی کے دیس میں مقیم تھا..بیتے دنوں میں ایک پریشان حال نوجوان اپنے ناول ''سیاہ آئینے'' کے مسوّدے کو سینے سے لگائے لاہور کی حشر انگیز گرم دوپہروں میں پسینے سے شرابور میری بیجوں کی دکان پر آیا جایا کرتا تھا..اور اُس میں ایک حوصلہ مندی ایسی تھی کہ جو آپ کو مجبور کر دیتی تھی..یہ ابھی پچھلے برس کی بات ہے جب اُس نے مجھ سے پھر رابطہ کیا کہ میں پاکستان میں ہوں، آپ کے ہاں آ جاؤں..اور یہ ایک اور فاروق خالد تھا، ہالینڈ کے تیس برسوں نے اسے کچھ کا کچھ..جیسا کچھ بھی..بنا دیا تھا..میں اُسے اپنے گھر کے گیٹ کے باہر

''کچھ مقامی ''دوستوں'' سے ''ملاقات''

ہالینڈ کے نومبر میں اُس کی سرد کٹیلی ہوا میں کچھ سانس لینے کے بعد کچھ ایسے نام نہروں کے مدھم بہاؤ کی مانند میرے ذہن میں بہتے ہوئے آئے جو شناسا تھے، کہیں نہ کہیں یادداشت پر نقش تھے اور اُن میں سے اولین اور عزیز ترین حسین شاہد تھا۔ اُس کے والدین نے اسے غلام حسین کا نام دیا لیکن اُسے کسی کا بھی غلام کہلانا پسند نہ تھا اس لیے حسین شاہد ہو گیا۔ جس نے اُن زمانوں میں اپنی تخلیقی قوت کو صرف پنجابی کے لیے وقف کیا جب اپنی ماں بولی میں لکھنے والوں کو ایک کمتر مخلوق سمجھا جاتا تھا، اُن کی کہیں کچھ پذیرائی نہ ہوتی تھی اور اس کے باوجود وہ اپنی دھرتی کی دھڑکن کے ساتھ جڑے رہے، صلے اور ستائش کی تمنا سے ماورا۔ حسین شاہد پنجابی افسانے، تنقید اور شاعری میں ایک کلاسیکی انداز میں نامور ہوا۔ اُسے اداکاری اور فلم میکنگ سے بھی لگاؤ تھا اور اُس نے اپنی ٹیلنٹ اور محدود وسائل سے ان جذبوں کی بھی آبیاری کی۔ اُس کا اردو سفرنامہ ''کُرتے پتے'' بھی اُس کی کشاکشِ حیات کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ اب اَن گنت برسوں سے ہالینڈ کی کسی غیر معروف بستی میں اپنی من مرضی سے ایک گمنام زندگی بسر کر رہا تھا۔ وہ چند ادبی پرچوں کے اوراق پر تو باقاعدگی سے دکھائی دے جاتا لیکن وہ کسی سے بھی رابطہ رکھنے کا قائل نہ تھا۔ ہالینڈ کے لیے روانگی سے پیشتر میں نے اُسے فون کر کے اپنی آمد کے بارے میں خبر کی لیکن اُس کے لہجے میں کچھ اشتیاق نہ تھا۔

ہیگ پہنچ کر میں نے پہلا فون حسین شاہد کو کیا۔

''پہنچ گئے ہو؟'' اُس نے پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے اُسے کچھ تفصیل بتائی۔ ''اور میمونہ بھی میرے ساتھ ہے۔'' وہ مجھ سے بے شک تعارف ہوتا تھا لیکن میمونہ کے لیے اس کے دل میں ہمیشہ سے ایک نرم گوشہ تھا اور جب بھی پاکستان میں ملاقات ہوتی وہ ایک شفیق بزرگ کی مانند اُسے سر پر پیار دیتا۔

مخبوط الحواس سا لگا تھا۔''

''تم بتاؤ کہ میرے جتنے بھی شناسا ہیں اُن میں سے کتنے ہیں جو اپنے حواس میں ہیں تو تم تیاری پکڑ لو۔ وہ پورے گیارہ بجے یہاں موجود ہوگا۔''

چنانچہ ہم دونوں نے تیاری پکڑ لی۔ بکتر بند ہو گئے۔ اعزاز اور ناجیہ کو اطلاع کر دی کہ ہمارے لیے دوپہر کے کھانے کا تردد نہ کیا جائے کہ ہم نے تو اس سے پیشتر ایمسٹرڈیم کی نہروں کی جانب پرواز کر جانا ہے۔

گیارہ بجے اور پھر ہمارے بارہ بج رہے تھے جب اُس کا فون آیا کہ ''تارڑ صاحب ایک ذاتی نوعیت کی مصروفیت نے مجھے گھیر لیا ہے، میں دو بجے آؤں گا۔''

نہایت شرمندگی سے ہم نے دوپہر کا کھانا تناول فرما لیا۔

پورے چار بجے جب ہم دونوں اپنے بہترین لباسوں میں تیاری پکڑے ہوئے بیڈروم کے صوفوں پر منتظر اونگھ رہے تھے کہ جمیل کی مترنم آواز آئی کہ ''صاحب... باہر آپ کے کوئی دوست آن پہنچے ہیں۔''

فاروق خالد۔ ایک شاہانہ ڈرائنگ روم کے ایک صوفے میں دھنسا ہوا عینک کو اپنی ناک پر استوار کرتا معصومیت سے مسکرا رہا تھا ''یار راستے میں ٹریفک ایک حادثے کی وجہ سے درہم برہم ہو گئی تو چلیں ایمسٹرڈیم۔''

''تم یہاں چائے کے ایک دو گھونٹ بھرو میں اپنی بیگم کو اطلاع کرتا ہوں۔''

''بیگم کو۔'' اُس کی عینک ناک پر سے کھسک کر ٹھوڑی سے آ لگی ''وہ بھی چلیں گی؟''

''ہاں۔ میں نے تمہیں بتایا تو تھا۔''

''اچھا تارڑ صاحب۔ آپ کی بیگم۔ یعنی میری بھابھی۔ معاف کیجیے گا کیا چھریرے بدن کی ہیں یا قدرے فربہ ہیں؟''

چونکہ میں فاروق خالد کو جانتا تھا کہ وہ کچھ کچھ نہیں بہت کچھ کہیں نہ کہیں ذہنی طور پر لرزیدہ ہے اس لیے میں نے اس استفسار پر خفگی کا اظہار نہ کیا ''تم کیوں پوچھتے ہو؟''

''میری پجارو میں اگلی نشست پر صرف دو لوگوں کی گنجائش ہے اور اُس کے پچھواڑے میں کچھ کاٹھ کباڑ ہے تو میں سوچ رہا تھا کہ اگر بھابھی پتلی ہیں تو اگلی نشست میں ہم دونوں کے ساتھ فِٹ

الوداع کہنے کے لیے آیا تو پوچھا..رات ڈھل چکی ہے..تم اس سمے اپنے گھر..شاید باغبانپورہ میں کیسے جاؤ گے..تو اُس نے گیٹ کے سامنے واقع باغیچے کی آہنی ریلنگ سے بندھی ایک نام کی سائیکل بوسیدہ اور زنگ آلود سائیکل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ''اس پر..'' اور آہنی ریلنگ کے ساتھ بندھی ہوئی اس سائیکل کی حالتِ زار کچھ ایسی تھی کہ اگر جانوروں کی مانند سائیکلوں کی بے رحمی کا بھی کوئی محکمہ ہوتا تو یقیناً فاروق کا چالان کر کے اُس سائیکل کو کسی اولڈ سائیکل ہوم میں بھیج دیا جاتا..

''آپ فکر نہ کرو..'' فاروق نے لاپروائی سے کہا ''میں اپنے گھر سے نکلا تو پہلے کرشن نگر گیا..پھر اِدھر آپ کے ہاں گلبرگ آیا اور اب یہاں سے پیڈل مارتا گھر چلا جاؤں گا..نو پرابلم۔''

وہ عمر میں مجھ سے کچھ برس ہی کمتر ہو گا لیکن میں اُس کی ہمت اور بدنی بے وقوفی کا قائل ہو گیا۔

میں نے نہیں، فاروق خالد نے مجھے ہالینڈ میں تلاش کر لیا..

''تارڑ صاحب..میں ہیگ آ رہا ہوں..آپ کو جہاں کہیں گے لے چلوں گا..''

میں خوش ہو گیا کہ کوئی تو رابطہ ثمر آور ہوا..''ابھی تک میں..بلکہ میری بیگم ایمسٹرڈیم نہیں گئے تو اگر ممکن ہو تو ہم کل وہاں چلے چلیں..کچھ آوارہ گردی کریں اور پھر سرِ شام کسی نہر کے کنارے واقع کسی ریستوران میں رات کا کھانا کھائیں اور پھر لوٹ آئیں۔''

''میں کل پورے گیارہ بجے آپ کو لینے کے لیے آ رہا ہوں..تیار رہیے گا۔''

اگلی سویر میں نے میمونہ کو وارننگ دی کہ بیگم تیاری پکڑ لو..آج ہم ایمسٹرڈیم جائیں گے..اُس کی جادو بھری نہروں کی روانی میں بہتے جائیں گے..فان خوخ کے عجائب گھر میں اُس کے شوخ رنگوں میں رنگے جائیں گے اور پھر..ایک یادگار ڈنر کریں گے، کیا تم اپنی خوش بختی پر نازاں نہیں ہو..فاروق خالد ابھی آیا ہی چاہتا ہے....''

''وہ کون ہے؟''

میں نے اپنی بیگم کی ادبی جہالت پر تادیر کف افسوس ملا اور کہا ''وہی جو پچھلے برس ہمارے گھر آیا تھا اور ہم دونوں تادیر سٹڈی میں بیٹھے رہے تھے..وہی..'' بیگم نے کچھ توقف کیا، یادداشت پر زور دیا اور پھر کہنے لگی ''وہ جو سائیکل پر آیا تھا..''

''بس وہی..''

''تو وہ کہیں پھر سے ہمیں اپنی سائیکل پر لے جانے کے لیے نہ آ جائے..وہ مجھے کُچھ کُچھ

''ہینڈل بار مونچھیں، کار ڈرائے کا کوٹ اور وہ حنیف جو مرچکا''

ہالینڈ میں مقیم میرے سبھی دوست کبھی ایسے تو نہ تھے..لیکن یہ تو صدیوں پرانے قصے ہیں جب میرے دوست ایسے بھی ہوا کرتے تھے..جیسے تہران میرے لیے سُکھ دیپ تھا، پیرس پاسکل تھی..روم پیئر لوجی تھا، سٹاک ہوم مارگریتا اور ریاض چیمہ تھے ایسے ہالینڈ میرے لیے حنیف تھا..

''کولون سے ہالینڈ جانے والی گاڑی میں سوار ہو کر میں شام کے ساڑھے سات بجے آرنہم پہنچ گیا اور وہاں سے ایک مقامی گاڑی کے ذریعے دِیرن تک آ گیا۔

دِیرن ایک بہت ہی معمولی قسم کا قصبہ تھا جو بمشکل ایک درجن دکانوں اور چند سو رہائشی مکانوں پر مشتمل ہوگا۔ میں نے پھولوں کی ایک دکان سے حنیف کا پتہ دریافت کیا اور قصبے کی اکلوتی سڑک کے بیچوں بیچ چلنا شروع کر دیا۔ سڑک بالکل خالی پڑی تھی۔ چند بچے سڑک کے درمیان چاک سے کھینچی ہوئی لکیروں پر ''کیڑی کاڑا'' قسم کا کوئی کھیل کھیل رہے تھے۔ کبھی کبھار کوئی سائیکل سوار بھی آ نکلتا۔ ہالینڈ کے لوگ انگریزوں کی مانند اپنے گھر کو قلعہ بنا کر نہیں رکھتے بلکہ سرے سے چار دیواری بنانے کا رواج ہی نہیں۔ سرِ شام لوگ آرام کرسیاں باغیچے میں ڈال کر پڑوسیوں کے ساتھ خوش گپیاں کرتے ہیں اور سڑک پر کھیلتے ہوئے بچوں پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ باغیچوں میں گڑیوں اور چکیوں کے ماڈل سجے ہوتے ہیں۔ میں ان باغیچوں کے سامنے گزرتا تو اکثر لوگ مسکرا کر ہاتھ ہلاتے۔ وہ مجھے اور میرے پیچھے گھسٹتے ہوئے سوٹ کیس کو نہایت دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ چند بچے میرے ساتھ ساتھ چلنے لگے اور اُن میں سے ایک نے راہبر کے فرائض انجام دینے شروع کر دیئے۔

ہو جائیں گی۔''

میں تھوڑا سا بھڑکا۔''فاروق میں نے تم سے کہا تھا کہ میری بیگم ہمراہ ہوگی۔''

مجال ہے وہ پریشان ہوا ہو۔نہایت تحمل سے بولا۔''ویسے تارڑ صاحب میں آپ کو ایک عظیم ادیب مانتا ہوں تو کیا آپ یکسر آزاد نہیں ہو سکتے۔اپنی بیگم کو ترک کر کے میرے ساتھ نہیں آ سکتے۔ہم موج کریں گے۔''

''اپنی بیوی کو ترک کر کے۔آزاد ہو کر۔موج تو کریں گے لیکن اس کے بعد کیا میں اپنے آخری ایام کسی اولڈ پیپل ہوم میں بسر کروں۔''میرا پارہ چڑھتا جاتا تھا۔

''آزادی کے لیے قربانی تو دینی پڑتی ہے۔چلیں؟''

میں نے معذرت کر کے بمشکل اُسے رخصت کیا، واپس بیڈ روم میں آ کر اپنی بنی سنوری میمونہ سے کہا''سوری۔''

تو اُس نے کچھ برا نہ مانا اور کہا کہ۔مجھے پہلے ہی پتہ تھا کہ وہ ایک سائیکل پر آئے گا۔

♦♦.....♦♦.....♦♦

''تمہارے پُر جوش استقبال نے میری روح کو گرما دیا ہے۔'' کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے جل کر کہا۔ حنیف کی دھیمی طبیعت کو اچھی طرح سمجھنے کے باوجود اُس کی سرد مہری میرے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اُس نے خود ہی تو مجھے سٹاک ہوم میں لکھا تھا کہ ایمسٹرڈیم جانے سے قبل دِیرن میں میرے پاس ضرور رُکنا۔۔

''تمہارا کیا خیال ہے میں تمہیں دیکھ کر خوشی سے ناچنے لگوں گا؟'' اُس کے باوقار چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ برف کا تودہ پگھل رہا تھا۔ ''تم آ گئے۔ بس ٹھیک ہے۔ کھانے کا وقت ہوا چاہتا ہے۔ تم جلدی سے کپڑے بدل کر نیچے آ جاؤ۔''

اُس شب ہم نزدیکی شہر اپیل ڈارن میں واقع ایک مشہور ریستوران ''میوزیم ٹیورن'' میں گئے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ''میوزیم ٹیورن'' ریستوران کم اور عجائب گھر زیادہ تھا۔ قدیم وضع کے چھوٹے سے ہال میں کھانے کی میزوں اور دیواروں پر بے شمار شیشے کے مرتبان دھرے تھے جن میں مختلف انواع کے جانوروں کے لاشے کسی آبی محلول میں تیر رہے تھے۔ مگرمچھ، گرگٹ، کچھوے، گلہریاں اور جانے کیا کیا! مرتبانوں کے اوپر حنوط شدہ پرندے قطار اندر قطار اپنے بے جان پَر پھیلائے ماحول کو اور بھی وحشت ناک بنا رہے تھے۔ گول گول آنکھوں والے اُلّو، کریہہ النظر چمگادڑیں، لمبی چونچ والے گِدھ۔

''مجھے یہاں آ کر بڑا سکون ملتا ہے۔'' حنیف نے سنجیدگی سے کہا۔ ''دنیا کی بے ثباتی کا احساس شدید ہو جاتا ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ کل کلاں مر جاؤں تو مجھے بھی شیشے کے مرتبان میں.... خیر تم کھاؤ گے کیا؟''

''مجھے تو بالکل بھوک نہیں۔'' ہماری میز پر رکھے مرتبان میں ایک کریہہ الشکل چھپکلی اوندھی تیر رہی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ فراعنہ کے مصر میں کسی بڑی دعوت میں کھانے سے قبل مہمان کو دنیا کی اسی بے ثباتی کا احساس دلانے کے لیے اُس کے سامنے ایک ممی پیش کی جاتی۔ میرا خیال ہے کہ کھانے کے دوران میزبان ممی اٹھا کر واپس تابوت میں رکھ آتا ہوگا تاکہ آئندہ دعوت پر کام آئے مگر یہاں تو سینکڑوں جانوروں کی ممیاں پورے ماحول کا ایک لازمی جز تھیں۔ حنیف کے اصرار پر میں نے مچھلی منگا لی اور بمشکل چند ٹکڑے نگلے۔ وہ کم بخت چھپکلی اب اوندھی تیرنے کی بجائے سیدھی ہو گئی تھی۔

ہم رات گئے واپس لوٹے۔ میں نے کپڑے تبدیل کیے اور بستر پر لیٹ گیا۔ مکان کے

قصبے کی آخری حد سے چند سو گز پرے ریلوے لائن کے ساتھ ایک پرانی طرز کا فارم نما گھر تھا جس کے باغیچے میں حنیف آرام کرسی پر دراز کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ مجھے دیکھ کر اُس نے اپنی ہینڈل بار نما مونچھوں کو ایک بَل دیا اور کُرسی سے اٹھ کر بڑی بے دلی سے ہاتھ ملایا۔ یوں لگتا تھا جیسے میری آمد سے وہ قطعاً خوش نہیں ہوا۔

''تمہیں اِن فتنوں نے تنگ تو نہیں کیا؟'' اس نے اکتاہٹ سے بھرپور لہجے میں میرے گرد کھڑے ہوئے بچوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا اور پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر کہنے لگا ''میں نے تو ان کے روزمرہ کے تعاقب سے بچنے کے لیے شام کو گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیا ہے۔ جہاں جاتا ہوں پیچھے ہو جاتے ہیں اور تالیاں بجاتے ہیں۔ ان کے لیے ایک پاکستانی عجوبے کی حیثیت رکھتا ہے۔'' اس نے میرا سوٹ کیس اٹھایا اور مکان کے اندر ڈائننگ روم میں لے گیا جہاں ایک ڈچ مرد اور عورت آرام دہ صوفوں میں دھنسے ٹیلی ویژن دیکھ رہے تھے۔ ''مسٹر اور مسز کِپ جن کی فیکٹری میں مَیں تربیت حاصل کر رہا ہوں۔'' حنیف نے کروایا۔

''تم ضرور مستنصر ہو گے۔'' کِپ کے وجیہہ چہرے پر ایک مشفقانہ مسکراہٹ کھیل گئی۔ ''حنیف بڑی شدت سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔''

''واقعی!'' میں نے حنیف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو ایک کونے میں میری موجودگی سے بے خبر اپنی بڑھی ہوئی داڑھی کھجانے میں مشغول تھا۔

حنیف کی شخصیت صرف ہالینڈ میں ہی نہیں بلکہ لاہور میں بھی ایک عجوبے سے کم نہ تھی۔ گرمیوں کی تپتی دوپہروں میں کار کی موجودگی میں بھی سائیکل پر فیکٹری جاتا۔ کسی بڑی دعوت پر مدعو ہوتا تو اپنے درجنوں سُوٹ چھوڑ کر کسی پرانی سویٹر کے ساتھ کارڈرائے کی پتلون اور پاؤں میں چپل پہن کر وہاں پہنچ جاتا۔ کسی موضوع پر بحث چھڑتی تو ہمیشہ کہتا کہ اگر ایسا ہے تو کیا خرابی ہے اور اگر ویسا ہو جاتا تو کون سی قیامت برپا ہو جاتی۔ اپنی سنکی طبیعت کی وجہ سے اکثر لوگوں میں انتہائی غیر مقبول تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود اُس میں منافقت اور تصنع نام کو نہ تھا۔ حنیف کا باطن خلوص اور پیار کا ایک ایسا برفانی تودہ تھا جو دوستی کے جذبے کی ہلکی سی آنچ سے پگھل کر اُبلنے لگتا۔

لکڑی کی تنگ سیڑھیاں طے کر کے وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گیا جہاں اُس نے میرے لیے ایک علیحدہ پلنگ ڈلوالیا تھا۔

کا ایک بھائی پاکستان بحریہ میں ایڈمرل کے عہدے پر پہنچ کر نیول چیف کے طور پر ریٹائر ہوا تھا۔ یقیناً اُس کے یوں دنیا جہان سے کٹ کر ایک بیزار زندگی بسر کرنے میں اُس کا دوش بھی تھا۔ اُس کی خصلت میں کہیں بے رُخی اور دنیا جائے بھاڑ میں روّیہ بھی پنہاں تھا۔ میں نے اسے اُس کی ذاتی زندگی اور خاندان سے سرد مہری کے بارے میں کبھی نہ کُریدا۔ اُس کے اندر ایک حد درجے کی قنوطیت جڑیں پکڑ چکی تھی جس کا ایک سبب دوسروں کی غفلت اور محبت کے بغیر زندگی بسر کیے جانا بھی تھا اور بہت کم لوگ اس بظاہر سرد مزاج کسی حد تک چڑچڑے شخص کی دنیا میں داخل ہونے کی جرأت کرتے اور شاید میں اُن میں سرفہرست تھا۔ وہ مجھے اپنے روزمرہ کے عام دوستوں کی نسبت ایک منفرد اور گہرا شخص لگتا۔

ہالینڈ جس کی مہک گُل لالہ میں ہے اور جس کی رُوح سائیکلوں کے پہیوں میں گردش کرتی ہے وہاں اُس نے سائیکل مینوفیکچرنگ کے تمام شعبوں میں ٹریننگ حاصل کی کہ اُس کے اندر مشینوں کو سمجھنے اور اُن کے کَل پُرزوں پر عبور حاصل کرنے کی ایک حیرت انگیز صلاحیت تھی۔ وہ ڈرائنگ بورڈ پر بیٹھ کر طرح طرح کی مشینوں کے قابل عمل نقشے بنانے میں ماہر تھا۔ وطن واپسی پر وہ اپنے والد کی فیکٹری میں پاکستان میں ساخت شدہ اولین سائیکل کا موجد تھا۔ پھر جانے کیسے جگر فراش حالات ظہور پذیر ہوئے کہ یا تو وہ خود الگ ہو گیا لیکن غالب امکان یہی ہے کہ بوجوہ الگ کر دیا گیا۔ اب وہ سراسر تنہا اور بے شکار شخص تھا، ایک ایسا بیروزگار شخص تھا جسے اپنی گزر اوقات کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا۔ وہ ایک زرخیز ذہن کا مالک تھا۔ اُس نے تحقیق کی کہ پاکستان میں سوئیٹس اور ٹافیاں بنانے والی خودکار مشینیں اس لیے نہیں بنائی جاتیں کہ اُن کی مانگ بے حد محدود ہے، انہیں بڑے پیمانے پر بنانا گھاٹے کا سودا ہے۔ اگرچہ مانگ بے شک محدود تھی مگر اُس نے اپنے ڈرائنگ بورڈ پر بیٹھ کر اپنے گرمیوں میں بھی اوڑھے ہوئے کارڈرائے کے ایک سیلیٹی کوٹ اور ہینڈل بار مونچھوں سمیت ایسی مشینوں کے نقشے تیار کیے اور پھر اُن کے سینکڑوں پُرزوں کو کبھی وزیر آباد اور گوجرانوالا کے مستریوں کی خراد مشینوں پر اور کبھی برانڈرتھ روڈ کے کاریگروں سے اپنی نگرانی میں تیار کروایا اور اُن مشینوں کو ایک مختصر ورکشاپ میں اپنے ہاتھوں سے جوڑا۔ جن دنوں میں اپنی دکان ''کسان اینڈ کمپنی'' کے کاؤنٹر کے پیچھے ایک گھومنے والی کُرسی پر بیٹھا چیمبرلین روڈ کی تب ویران اور دُھول آلود سڑک کو گرم دوپہروں میں تکتا رہتا تھا تو اُس کی ویرانی میں حنیف اُسی کارڈرائے کوٹ میں ملبوس مونچھوں کی مانند کندھے جھکائے اپنے لیمبرٹیا سکوٹر پر

ساتھ ہی ریلوے کا پھاٹک تھا۔ گاڑی کی آمد سے چند منٹ قبل پھاٹک پر خطرے کی تیز گھنٹی زور زور سے بجنے لگتی۔ گاڑی گزر جاتی تو دھمک کی وجہ سے پورے مکان پر کپکپی کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ یہ سلسلہ تمام رات جاری رہا اور میں بالکل نہ سو سکا۔''

لاہور کینٹ کی ایک ایکڑوں میں پھیلی ہوئی کوٹھی کے ایک کونے میں وہ الگ تھلگ بغیر کسی محبت اور پدرانہ شفقت کے کہ اُس کی ماں مر چکی تھی اور باپ نے دوسری شادی کے بعد اُس سے ایک مجرمانہ غفلت اختیار کر لی تھی، وہ اُس بے ترتیب اور دھول آلود کمرے میں کاٹھ کباڑ کے گودام میں پڑا ایک بیکار پرزہ تھا۔ اُس نے اپنے آپ پر ایک تنہائی مسلط کر لی تھی اور عزیزوں کی بے رُخی نے اُسے کسی حد تک ایک نفسیاتی مریض بنا دیا تھا، وہ پہروں اپنے کمرے میں بند پڑا رہتا، کتابیں پڑھتا، کبھی رات گئے تک اُس زمانے کے لاہور کینٹ کی سنسان سڑکوں پر بے مقصد گھومتا رہتا۔ کبھی کبھار میں اُسے ملنے کے لیے چلا جاتا اور مجھے دیکھ کر بظاہر اُس کے چہرے پر وہی اکلاپے کے حزن کی سیاہی چھائی رہتی لیکن اُس کی دبیز ہینڈل بار مونچھوں میں ایک ہلکی سی لرزش محسوس ہوتی یعنی اُن میں تقریباً پوشیدہ اُس کے ہونٹ ایک مسکراہٹ میں پل بھر کے لیے لرزے تھے۔

''اُس شب ہم نے کھانا گھر پر ہی کھایا کیونکہ ٹیلی ویژن پر ایک بہت ہی خصوصی پروگرام دکھایا جانا تھا۔ آج خلائی جہاز اپالو گیارہ چاند پر اتر رہا تھا۔ علی الصبح نیل آرم سٹرانگ ایک آؤٹ آف فوکس بھوت کی طرح چاند پر اترا ''انسان کا ایک قدم مگر انسانیت کے لیے ایک عظیم جست'' چاند پر انسان کے اولین الفاظ۔ سٹاپ ہارس کا قصبہ ایک قدم اٹھا کر ہی رک گیا تھا اور دنیا ایک عظیم جست لگا چکی تھی۔ مجھے اس سائیکل سوار جوڑے کا خیال آ گیا جنہوں نے صرف تصویر اتارنے کے جرم میں ہمیں پتھر مارے تھے۔ شاید وہ بھی اس وقت ٹیلی ویژن دیکھ رہے ہوں گے۔ ازمنہ وسطیٰ کی ذہنیت کا انسان چاند کے انسان کے بارے میں کیا سوچتا ہوگا۔ شاید وہ اس وقت نیل آرم سٹرانگ کو کوس رہے ہوں۔ اُس نے آج چاند پر قدم رکھنے کی جرأت کیونکر کی؟ آج تو اتوار تھا۔''

حنیف کے والد کا شمار پاکستان کے ابتدائی دور کے بڑے صنعتکاروں میں ہوتا تھا اور اُن

جاٹ دانش ور ہو جائے یا کوئی سردار احمدی ہو جائے.. قیافہ لگایا گیا کہ ایسا کیسے اور کیوں کر ہو گیا.. وہ جو اُس کے ایک دو دوست تھے جو اُس کی سرد مزاجی اور قنوطیت کو پار کر کے اُس کے قریب ہو گئے تھے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ کپ کی سیکرٹری ان برسوں کی شناسائی کے دوران حنیف کی لاابالی اور بیزار بینڈل بار مونچھوں والی شخصیت پر فدا ہو گئی ہو گی اور اُسی نے حنیف کو شادی کی پیشکش کی ہو گی اور جب یہ پیشکش متعدد بار دہرائی گئی ہو گی تو حنیف نے اُکتا کر کہا ہو گا اور کندھے اچکا کر کہا ہو گا کہ بی بی اگر چہ یہ شادی وغیرہ تو ایک فضول سی چیز ہے لیکن تم کہتی ہو تو کر کے دیکھ لیتے ہیں..

مال روڈ پر واقع وہ جو ایک زمانے میں کیا خمار آور ہوٹل انٹرنیشنل تھا جس کے سوئمنگ پول میں لاہور کے چاندی بدن تیرا کرتے تھے اُس کے برابر میں ایک خاموش راستہ تھا اور وہاں ایک ایسا پرسکون گوشہ تھا جس میں ایک سہولت بھرا گھر تھا اور اس گھر کی سجاوٹ اور تنظیم کسی ڈچ خاتون کی ترتیب اور ذوق جمال کی گواہی دیتے تھے.. لاہور کے بے مثال موسم سرما کی مدھم دھوپ میں اُس کی کھلی چھت پر ایک آرام کرسی میں حنیف ایک ڈریسنگ گاؤن میں آراستہ زیر مونچھ طمانیت سے مسکرا رہا تھا اور میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار اُسے یوں مطمئن، شانت اور اپنے کارڈرائے کے کوٹ کے بغیر دیکھا.. اور اُس کی لمبی تڑنگ کسی حد تک بے ڈھنگی ڈچ بیوی نے مجھے خوش آمدید کہتے ہوئے کہا ''اوہ.. ہم تو ہالینڈ میں مل چکے ہیں اور میں جانتی ہوں کہ حنیف تم سے کتنا قریب ہے..''

کوئی بھی یہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ حنیف کو یوں آسودہ، مطمئن اور زندگی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مجھ میں مسرت کے کیسے چشمے اُبل پڑے.. بالآخر ایک بے آسرا اور غفلت سے آلودہ حیات کے بعد اُسے ایک گھر ایک محبت کرنے والی بیوی مل گئی..

اُس نے مجھے بتایا کہ اُس کے معاشی حالات اتنے سُدھر چکے ہیں کہ وہ اگلے چند روز میں کینٹ میں واقع ایک نئے اور وسیع گھر میں شفٹ ہو جائے گا اور اُس کی مونچھیں شرمندگی سے مسکرائیں کہ اُس کی بیوی امید سے ہے..

لکشمی مینشن کے فلیٹ نمبر 17.. تیسری منزل پر واقع.. اُس کے بوسیدہ، بارشوں اور گرمیوں کے مارے ہوئے بدرنگ دروازے پر کسی نے دستک دی..

میں نے زنگ آلود کنڈی کھولی تو سیڑھیوں پر حنیف کا ایک دیرینہ دوست کھڑا تھا.. میں

سوار گزر جاتا اور میں جان جاتا کہ وہ برانڈرتھ روڈ جا رہا ہے..اور واپسی پر وہ دکان کے باہر فٹ پاتھ پر اپنا سکوٹر کھڑا کر کے پسینہ اور دُھول پُونچھتا زیرِ مونچھ مسکراتا میرے سامنے آ بیٹھے گا..اس کاروبار میں قباحت یہی تھی کہ اس نوعیت کی مشینوں کی محدود مانگ کے باعث وہ دس بارہ مشینیں فروخت کرتا اور اُن کی مارکیٹ لبریز ہو جاتی اور وہ پھر اپنے ڈرائنگ بورڈ پر بیٹھ کر ایک اور مشین کے نقشے بنانے لگتا.... وہ کسی حد تک آسودہ ہو گیا۔لیکن اس آسودگی کے باعث نہ تو اُس کا کارڈرائے کا کوٹ بدلا اور نہ ہی مونچھیں بلکہ سکوٹر بھی وہی رہا..اس دوران وہ اپنی وسیع کینٹ کے علاقے میں پھیلی کوٹھی کے اُس کمرے سے منتقل ہو چکا تھا..اُس کا پہلا ٹھکانہ بوڑھے راوی کے پُل کے ادھر ایک گنجان عمارت کی تیسری منزل پر واقع ایک فلیٹ تھا..وہ مجھے سڑک کے پار براجمان ایک ایسے مجذوب کے قصّے طنزیہ انداز میں سناتا جو ننگ دھڑنگ ایک چھتری کے سائے میں پڑا رہتا تھا اور علاقے کے جتنے بھی جواری اور نوسر باز تھے، وہ اُس کی بڑبڑاہٹ سے دوڑیں جیت جانے والے گھوڑوں کے نام اور سٹّے کے نمبر اخذ کرتے رہتے تھے..عورتیں اُس کے منہ سے بہتی رالوں کو پونچھ کر ایک بیٹے کی تمنائی ہوتی تھیں..حنیف کا کہنا تھا کہ وہ ایک خوش نصیب پاگل تھا کہ مشرق میں تھا، اگر مغرب میں ہوتا تو وہ کسی میڈ ہاؤس میں زیرِ علاج ہوتا..اُس نے یہ پیشین گوئی بھی کی کہ مستنصر تم دیکھنا کہ یہ بابا چھتری والا مرنے کے بعد ایک ولی اللہ ہو جائے گا..حنیف کی پیشین گوئی پوری ہوئی اور آج بابا چھتری والے کے مزار پر زائرین کا ایک ہجوم اُن کی روحانی عظمت کے گیت گاتا ہے اور اُن کے عُرس کے موقع پر راوی روڈ کی ٹریفک معطل ہو جاتی ہے..

ازاں بعد وہ میرے توسط سے میرے ''نکلے تری تلاش میں'' کے سفر کے ساتھی محمد علی کی کوٹھی میں منتقل ہو گیا جو میری موجودہ رہائش سے چند قدم کے فاصلے پر فردوس مارکیٹ کی نزدیکی میں واقع تھی..اس کے ڈرائنگ روم میں ہمہ وقت ایک بانسی ٹوکری دھری رہتی تھی جو بھنی ہوئی مونگ پھلی سے لبریز ہوتی تھی اور میں جب کبھی اُسے ملنے جاتا وہ کہتا ''یار مونگ پھلی کھاؤ..'' وہ کوٹھی اب ایک مختلف اور جدید رُوپ دھار چکی ہے لیکن میں جب کبھی اپنے گھر کے راستے میں ادھر سے گزرتا ہوں تو مجھے مونگ پھلی سے لبریز وہ ٹوکری یاد آ جاتی ہے۔

پھر مجھے خبر ملی کہ حنیف نے جواب بھی ہالینڈ آتا جاتا رہتا تھا کپ کی لمبی تڑنگی سیکرٹری سے شادی کر لی ہے..حنیف اور شادی..یہ خبر مجھ پر بجلی بن کر گری کہ یہ تو ممکنات میں سے نہ تھا..جیسے کوئی

لِونگ روم میں بانس کی ایک ٹوکری بُھنی ہوئی مونگ پھلی سے لبریز ہوتی تھی اور حنیف اپنے کارڈ رائے کوٹ میں ہینڈل بار مونچھوں میں مسکراتا ہر بار کہتا ہے.. یار مونگ پھلی تو کھاؤ.. جانے وہ کارڈ رائے کا کوٹ اُس کی بیوی اپنے ساتھ لے گئی یا اُس نے لاہور چھوڑتے ہوئے اُسے کسی ڈسٹ بن میں پھینک دیا..

اور میں ہالینڈ میں تھا.. اگر مجھے کچھ بھی اتہ پتہ ہوتا کہ وہ کہاں ہے تو میں یقیناً اُس کی بیٹی سے ملاقات کرنے کی خاطر بہر طور وہاں پہنچ جاتا.. وہ جوان ہو چکی ہوگی اور شاید شادی شدہ ہو کر اپنے بچوں سے کھیلتی ہوگی.. میں اُس کے سر پر پیار دے کر اپنا تعارف کرواتا لیکن وہ پنجابی یا انگریزی کہاں جانتی ہوگی، ڈچ بولتی ہوگی تو میں صرف اُس کی شباہت میں اپنے اُس یار کے چہرے کی کُچھ پرچھائیاں تلاش کرتا جو اس دنیا سے معدوم ہو چکا ہے..

تو اِس ہالینڈ میں کبھی.. میرے حنیف جیسے دوست بھی تھے..

♦♦.....♦♦.....♦♦

نے اُسے اندر آنے کے لیے کہا تو اُس نے سر ہلا کر اٹکتے ہوئے لہجے میں کہا ''تارڑ صاحب..حنیف مر گیا ہے..''

''کہاں مر گیا ہے..'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا..حنیف کے دوست بھی تو اُس جیسے تھے۔ اسی نوعیت کی باتیں کرتے تھے..

''دس روز ہو گئے ہیں..میں نے سوچا آپ کو اطلاع کر دوں..اور یہ بتا دوں کہ وہ کہاں دفن ہے..''

وہ ہوٹل انٹرنیشنل کے برابر میں واقع اپنے گھر سے کینٹ کے ایک بنگلے میں شفٹ ہو رہا تھا۔ جب میاں میر پُل کی چڑھائی چڑھتے اُس کی کار کے سامنے ایک رکشا آ گیا جو غلط لین میں تھا، اُسے بچانے کی کوشش میں حنیف ایک دیوار سے جا ٹکرایا اور اُس کا سر سٹیئرنگ پر جا لگا..وہ اپنے تئیں ہوش میں تھا جب وہ کار میں سے باہر آیا اور ایک رکشہ روک کر اُس میں بیٹھا اور کہا..مجھے کسی بھی ہسپتال میں لے چلو..اُس کے خون نے رکشے کی نشست اور فرش کو لمحوں میں سرخ کر دیا..ہسپتال میں وہ ایک مرتبہ پھر ایک ایسا شخص تھا جو تنہا تھا اور اُس کا کوئی والی وارث نہ تھا..اگلے روز اس کی ہینڈل بار مونچھیں آخری بار لمحہ بھر کے لیے لرزش میں آئیں اور وہ مر گیا..

مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ وہ کون سا قبرستان تھا جہاں وہ دفن ہوا..بس یہ یاد ہے کہ اُس کی قبر کی مٹی سُوکھ چکی تھی اور اُس پر بکھری گلاب کی چند پتیاں مرجھا چکی تھیں..وہ اپنی آخری تنہائی میں اتر چکا تھا..

اُس کی ڈچ بیوی اپنی نومولود بچی کے ساتھ کچھ عرصہ تو لاہور میں مقیم رہی اور پھر واپس ہالینڈ چلی گئی..

حنیف کے سبھی حوالے صفحۂ ہستی سے مٹ گئے..نہ کبھی اُس کی بیگم نے مجھ سے رابطہ کیا اور نہ ہی مجھے خبر ہوئی کہ وہ کہاں ہے..آج بھی، ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں اسلام آباد سے واپس لاہور آ رہا ہوں، راوی پار کر کے بوڑھے راوی کے پُل کے قریب ہوا ہوں، بابا چھتری والے کے مزار کے قریب سے گزر رہا ہوں تو میں نے دائیں جانب کی عمارتوں کو دیکھ کر حنیف کو یاد نہ کیا ہو۔ اپنے گھر کے قریب تقریباً ہر دو چار روز بعد میں اُس اب نوتعمیر شدہ گھر کے پاس سے گزرتا رہتا ہوں جس کے

کے حوالوں سے لوگوں کی توجہ حاصل کر لی تھی.. وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوتے تھے..اور میں جانتا تھا کہ میرے اندر کچھ بھی نہیں.. میں نصیب کے ہاتھوں میں ایک کٹھ پُتلی ہوں صرف اس فرق کے ساتھ کہ لوگوں نے دیگر درجنوں کٹھ پتلیوں کی موجودگی میں صرف مجھے اپنی توجہ کے لائق سمجھا تھا..تو اس میں میرا کچھ کمال نہ تھا، صرف عنایت کی ایک نظر تھی..

میں تقریباً بھاگتا ہوا، ایک کھسیانی مسکراہٹ کے ساتھ سٹیج پر جا پہنچا صرف اس لیے کہ یہ مہربان لوگ پلیز جلد از جلد دوبارہ اپنی نشستوں پر بیٹھ جائیں اور مجھے مزید شرمندگی سے دوچار نہ کریں..گمان یہ بھی گزرا کہ یہ تالیاں بجاتے خواتین وحضرات میرا استقبال نہیں کر رہے بلکہ سردی کی شدت سے اپنے سرد ہو چکے ہاتھوں کو گرمانے میں مشغول ہیں..

یہ سب کیا دھرا دبیز شیشوں کی عینک کے عقب میں روپوش سیفی کا تھا جو اس تقریب کا کرتا دھرتا تھا، میزبان تھا، اس لیے یہ سب اُس کا کیا دھرا تھا..مجھے خوش آمدید کہنے کے لیے اعزاز نے میرے اعزاز میں، میرے بیٹے سلجوق اور ناول ''راکھ'' کے حوالے سے ایک توصیفی سفارتی نوعیت کی تقریر کی..اور پھر مجھے سٹیج پر تنہا چھوڑ دیا..اس درخواست کے ساتھ کہ عوام سے گفتگو سے پیشتر اگر میں یوم اقبال کے حوالے سے کچھ اظہار کروں تو یہ رسم دنیا بھی ہے اور موقع بھی ہے اور دستور بھی ہے..

مجھ میں اتنی بلند پروازی تو نہ تھی کہ میں حضرت علامہ کے شاہین کے شانہ بہ شانہ پرواز کر سکتا..بھلا میں مولا ایک باز کے ساتھ کیسے پنجہ آزمائی کر سکتا تھا لیکن میں نے اُس مُرشد رومی کو اپنا مرشد مان کر اپنی عقیدت کا اظہار کیا اور جب محسوس کیا کہ حاضرین میری دانشوری سے ہراساں ہو کر جمائیاں لینے کو ہیں تو میں نے قوم کو جگانے کی خاطر اپنے اظہار کو ایک لطیف پیرائے میں ڈھال دیا....خواتین وحضرات ابھی حال ہی میں میرے اور علامہ اقبال کے درمیان ایک غلط فہمی نے جنم لیا ہے جسے میں مخاصمت کہنے کی جرأت نہیں کروں گا..میرا ایک نازک ملوک سا پوتا یا شار ظفر علی روڈ پر واقع ''کِڈز کیمپس'' میں نرسری کی کلاس میں کھیلتا کُودتا ہے اور وہ اکثر رونی سی شکل بنا کر مجھ سے شکایت کرتا تھا کہ دادا..میری کلاس میں ایک موٹا سا بچہ سیفی ہے جو مجھے مارتا ہے..تو میں اُسے کہتا کہ بیٹے یہ تو بہت بری بات ہے تم ایک تارڑ دادا کے پوتے ہو..تم اُسے کیوں نہیں مارتے تو وہ روہانسا ہو کر کہتا، دادا وہ میرے اوپر بیٹھ جاتا ہے..وہ بہت موٹا ہے..ایک روز اُس کے سکول کی جانب سے ایک پروانہ ملا کہ ہم ایک ''گرینڈ پیرنٹ ڈے'' کا اہتمام کر رہے ہیں، آپ آئیے اور دیکھیے کہ آپ

''ہیگ کی ایک شبِ بے مثال..جس میں سارے چہرے میری محبت میں دمکتے تھے''

روزن زال...ذخ ٹن برگلان نمبر 23..ڈین ہاگ..

نیچی چھت کے ہال کے اندر تقریباً ساڑھے تین سو لوگوں کے جذبات کی ایک آسودہ حدت تھی..اور اس حدت میں اُن کے دلوں میں جو میرے لیے محبت تھی، اُس کی ایسی آمیزش تھی کہ وہ میری روح کے نہاں خانوں میں اترتی اُسے بھی نہال کرتی میرے ماتھے کو شرمندگی کے پسینے سے بھگوتی تھی اور باہر..شدید پالا اتر رہا تھا.. پارک شدہ کاروں کی ونڈ سکرینیں کُہرے کی سفیدی سے اندھی ہو رہی تھیں..

اور اس ہال میں کیسے کیسے خوش نظر اور خوش لباس لوگ سجے تھے جن کے چہرے میری جانب دیکھتے دمکتے تھے..وہ صرف ہیگ سے ہی نہیں، ہالینڈ کے دور دراز شہروں اور قصبوں سے..ایمسٹرڈیم، روٹرڈیم اور جانے کہاں کہاں سے موسموں کی شدت سہتے میرے لیے آئے تھے تو وہ یقیناً کسی فریب کے دھوکے میں آ گئے تھے ورنہ میں اس لائق تو ہرگز نہ تھا کہ جب مجھے سٹیج پر آنے کی دعوت دی گئی تو وہ سب کے سب اپنی نشستوں سے کھڑے ہو کر میرے استقبال کی خاطر مسلسل تالیاں پیٹنے لگیں، نعرے لگانے لگیں اور ان میں ایک چھوٹی سی بچی بھی تھی جس نے سرخ رنگ کا دبیز سویٹر پہن رکھا تھا اور اُس کے رخسار بھی سویٹر کے رنگ کے لال گلال تھے اور وہ بھی آس پاس حیرت سے دیکھتی تالیاں بجا رہی تھی، اُس کا خیال تھا کہ ابھی سٹیج پر کوئی تماشہ ہوگا..کوئی کارٹون کردار آئے گا، کوئی مسخرہ نمودار ہوگا..اور پورے ساڑھے تین سو لوگوں میں سے صرف وہ بچی تھی جس نے دراصل مجھے پہچان لیا تھا..میں بھی تو زندگی کی سٹیج پر ایک کارٹون کردار تھا..ایک ایسا مسخرہ تھا جس نے اپنے سفرناموں، ناولوں اور ٹیلی ویژن

اس ہالینڈ کے شکر گزار رہیے..اس کے وفادار رہیے..اپنی ثقافت اور عقیدے کی شناخت کو فراموش نہ کیجیے لیکن اس گُل لالہ کی سرزمین کے شکر گزار رہیے....اس کے گیت گائیے..ازاں بعد نمونہ کلام کے طور پر میں نے اپنے دو کالم ''کیا آپ نے کبھی اُلّو دیکھا ہے'' اور ''اپنی ماں کا گوشت کھانے والے'' پڑھے جو شگفتہ ہونا چاہیں اُن کے لیے اور جو رنجیدہ ہونا چاہیں اُن کے لیے بھی..

سٹیج سے اترا ہوں تو حاضرین نے شکر کیا کہ میں رخصت ہو رہا تھا اور اُنہوں نے شکرانے کے طور پر پھر اپنی نشستوں سے اٹھ کر تالیاں بجائیں..بے شمار مہربان لوگ محبت کے گُل لالہ اپنے چہروں پر کھلائے مجھے اپنی نشست پر بیٹھنے نہ دیتے تھے..اور میں ایک روبوٹ کی مانند سر ہلاتا خجالت سے مسکراتا چلا جاتا تھا..اُن کی معصوم فرمائشوں کی تکمیل کرتا..اپنے آپ کو جذبات کی نم رو سے بچاتا اُن سے ہاتھ ملاتا، تصویریں اتر واتا اور آٹو گراف سائن کرتا چلا جاتا تھا اور اتنے لوگوں نے مجھے اپنی چاہت کے دسترخوانوں پر مجھے مدعو کیا کہ اگر میں یہ دعوتیں سب کی سب قبول کر لیتا تو مجھے اگلی کرسمس تک ہالینڈ میں ہی قیام کرنا پڑتا۔اس دوران میں دیکھ رہا تھا کہ سیفی کے ایک فرزند ارجمند کانوں میں بالے ڈالے جھومتے جھامتے ساؤنڈ سسٹم کی نگرانی کرتے پھرتے تھے کیونکہ سٹیج پر موسیقی کے پروگرام کا تانا بانا بُنا جا رہا تھا، سازندے اپنے ساز سُر میں کر رہے تھے اور گائیک اپنے گلے صاف کرتے کھنگورے بھی مار رہے تھے اور میں نہ جان سکا کہ وہ مجھے متوجہ کرنا چاہ رہے تھے اور جب میں نہ ہوا تو اُن میں سے ایک گلوکار نے ایک غصیلا کھنگورا مارا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ''تارڑ صاحب..ہُن بس وی کرو..اسی وی پاکستان توں ایس محفل وچ گون لئی آئے آں..'' اور یہ گلوکار پہچان میں آتا تھا..ریاض امتیاز کی جوڑی کو پاکستان میں سُر سے شغف رکھنے والے سب کان جانتے ہیں اور ان دونوں میں سے یہ امتیاز تھا جو کھنگورے مار رہا تھا..امتیاز نے بھی بیشتر گلوکاروں کی مانند اپنے بیٹے کو ہالینڈ میں سیٹل کر دیا تھا اور یہاں اُس کی نیم کلاسیکی گائیکی کو پسندیدگی حاصل ہو چکی تھی..

''جی بسم اللہ..'' میں نے ہاتھ اٹھا کر امتیاز سے کہا..

''بسم اللہ تو سرکار ہم تب کریں اگر آپ اپنی نشست پر بیٹھ جائیں اور یہ خواتین و حضرات جو آپ کے گرد ہیں، یہ بھی مہربانی کریں..ورنہ ہماری یہاں کون سنتا ہے..''

دونوں باپ بیٹوں نے اس اجنبی پن چکیوں، پنیر اور اور ٹیولپ کی سرزمین کو اپنی کلاسیکی گائیکی سے یوں مدھر اور سُریلا کیا کہ پن چکیوں کے پَر اُن کی راگ داری سے حرکت میں آ گئے، پنیر کا

کے پوتے پوتیاں کس ماحول میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں تو میں اور میمونہ کشاں کشاں وہاں پہنچے اور وہاں کیا دیکھتے ہیں کہ علامہ اقبال کے فرزند جسٹس جاوید اقبال اور اُن کی اہلیہ ناصرہ اقبال بھی موجود ہیں.. میں نے جسٹس صاحب سے استفسار کیا کہ حضور آپ کہاں..تو وہ کہنے لگے، تارڑ صاحب میرا پوتا سیفی بھی یہاں پڑھتا ہے..

کُھلا یہ کہ میرے پوتے یاشار کو پھینٹی لگانے والا بچہ سیفی جاوید اقبال کا پوتا اور حضرت علامہ اقبال کا پڑپوتا ہے، تب میں نے بصد ادب جاوید اقبال سے گزارش کی کہ محترم بے شک ہم آپ کا اور آپ کے ابا جی علامہ اقبال کا بے حد احترام کرتے ہیں لیکن اس احترام کی بھی کوئی حد ہوتی ہے..ہم اگرچہ معمولی نوعیت کے کاشتکار تارڑ جاٹ ہوتے ہیں لیکن اگر آئندہ آپ کے پوتے نے..علامہ اقبال اپنی جگہ اور میرا پوتا یاشار اپنی جگہ..

ازاں بعد مجھے اپنی ذات کے حوالے سے کچھ کلام کرنا تھا..اُن مہربان لوگوں سے ہم کلام ہونا تھا..اور اس کلام میں کچھ تاثیر تو نہ تھی لیکن اُس ہال میں موجود لوگ اپنے وطن اور اُس وطن سے جڑے ہوئے ایک شخص کے لیے پیاسے تھے، وہ یورپ کے اس اپنی تہذیب سے جدا ایک ایسے صحرا میں تھے جہاں وہ اپنے دیس کے پانیوں کے لیے ترستے پیاس سے نڈھال ہوتے تھے..میں وہاں نہ ہوتا اُن کے وطن کے پانیوں کا کوئی بھی اور قطرہ ہوتا تو وہ اُس کے لیے بھی اپنی تمام تر محبتیں نچھاور کر دیتے..یہ جواب تک بات بنی ہوئی تھی تو وہ صرف اس لیے کہ وہ پیاسے لوگ پاکستان کے لیے پیاسے تھے..

مجھ سے بہت سوال جواب ہوئے اور میں قطعی طور پر توقع نہ کر رہا تھا کہ یہ اپنے رزق روزگار کے لیے دن رات مشقت کرنے والے لوگ میری تحریروں سے اتنے آگاہ ہوں گے کہ میرے پہلے سفرنامے ''نکلے تری تلاش میں'' سے شروع ہوں گے اور میرے ناول ''خس و خاشاک زمانے'' تک کے حوالے دیتے چلے جائیں گے..وہ مجھے ان ایام کی یاد دلائیں گے جب میں ایک اداکار ہوا کرتا تھا..میرے سیریل ''سورج کے ساتھ ساتھ'' کا تذکرہ کریں گے اور لامحالہ ٹیلی ویژن کے پہلے مارننگ شو کی باتیں کریں گے، اُن لوگوں نے مجھے حیران کر دیا..

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے مکالمے کے بعد میں نے اپنی گفتگو کو سمیٹتے ہوئے گزارش کی کہ..اگر آج آپ سب اتنے آسودہ اور آرام سے ہیں تو یہ سب اس ملک ہالینڈ کی دین ہے..جس نے اپنا سینہ فراخ کر کے آپ کو قبول کیا..اپنے آئین کے مطابق آپ کو حقوق دیئے، آپ پر رزق روزگار کے دَر وا کیے تو..

پُر وجاہت جنٹل مین..تھری پیس سُوٹ میں ملبوس..مجھے اُن کے گھر میں منعقد کردہ ایک محفل یاد آ گئی جس کا اہتمام سرفراز سید نے کیا تھا..اُنہوں نے فلم ''برسات'' کی وہ دُھن بجائی جس کے بارے میں راج کپور نے اقرار کیا تھا کہ پیرس کے کسی فٹ پاتھ پر ایک بھکاری وائلن بجا کر لوگوں کو متوجہ کر رہا تھا اور وہ دُھن راج کپور نے شنکر جے کشن کے گوش گزار کی اور پھر..ہو ہو..مجھے کسی سے پیار ہو گیا، پیار ہو گیا دل بے قرار ہو گیا...ہیگ میں مجھے احسان کی وائلن کی اداسی سنائی دینے لگی..

بے شک موسیقی کے بارے میں اکثر ایک فضول سا بیان دیا جاتا ہے کہ یہ..رُوح کی غذا ہے..چلیے فرض کر لیجیے کہ یہ ہے لیکن اس کے باوجود یہ حلوے پوڑی..چکن کڑھائی، گرما گرم کبابوں اور روٹیوں کا متبادل تو نہیں ہو سکتی..چنانچہ اس محفل موسیقی کے بعد ان سب غذاؤں کا اہتمام کر دیا گیا..

اور ہاں وہ جو سیفی تھا جیسے اہل زبان کہتے ہیں کہ نچلا تو نہ بیٹھتا تھا، ایک معنک لٹو کی مانند گھومتا انتظامات کرتے پھرتا چلا جاتا تھا..پل بھر کے لیے ساکت ہوا اپنی حجاب پوشیدہ زوجہ سے میرا تعارف کروایا اور پھر سے متحرک ہو گیا..

روزن زال..ذخن ٹن برگلان 23..ڈان ہاگ..کا ہال نصف شب کی قربت میں سرد ہونے لگا کہ اُس میں سینکڑوں چہروں کی اُلفت کی جو گرمی تھی وہ زائل ہونے لگی..لوگ رخصت ہونے لگے..مجھے بھی جانا تھا..

میں باہر کُھلی ہوا اور ایک رات میں آیا تو مجھے ایک دھچکا سا لگا کہ ابھی تو میں اپنے وطن کے لباسوں، روایتوں اور گفتاروں میں تھا اور اب وہاں ہیگ کی رات کی سرد مہری ہے..کاروں کی ونڈ سکرینوں پر کُہر کی سفید نابینائی بچھی تھی اور آسمانوں سے اترتی ایک برفیلی ٹھنڈک میرے رخساروں پر یخ ہوتی اُنہیں بوسوں کی مانند گیلا کرتی تھی..

♦♦.....♦♦.....♦♦

ذائقہ گلے میں اترنے لگا اور ٹیولپ کے پھولوں کے رنگ نکھر گئے.. بیٹے کی آواز میں ایک مدھم ٹھہراؤ تھا جو غزل کی گائیکی کے لیے نہایت موزوں تھا اور امتیاز اکثر اوقات اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لیے خواہ مخواہ کوئی تان لگا دیتا یہ ثابت کرنے کے لیے کہ میں تو اس کا بھی باپ ہوں.. مہدی حسن کی دو غزلوں کے ساتھ انصاف کرنے کے بعد حاضرین میں سے ایک صاحب نے جو اس دوران جمائیاں لے رہے تھے، کھڑے ہو کر نعرہ لگایا.. قمیض تیری کالی.. رزق کے لیے انسان کیا کچھ نہیں کرتا.. وہ دونوں اس فرمائش کی تکمیل کی خاطر اپنا کلاسیکی ورثہ ترک کر کے عوامی ہو گئے.. عیسیٰ خیلوی کے اس پسندیدہ لوک گیت میں گائیکی سے زیادہ سنگت کرنے والے طبلہ نواز کے زورِ بازو کا امتحان ہوتا ہے اور وہ.. ایک افغان موسیقار.. طبلے پر خاصا عبور رکھتا اس امتحان میں سرخرو ہوا.. موسیقی کی اس محفل میں سٹیج کے ایک کونے میں سر جھکائے اپنی وائلن سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے ایک معنک، چھریرے اور فاقہ کش چہرے والے نوجوان نے مجھے اپنا گرویدہ کر لیا.. وہ ایک گہرے استغراق میں گم تھا، قطعی طور پر غافل تھا کہ کونسا راگ یا گیت گایا جا رہا ہے، نہ صرف گلوکاروں بلکہ سامعین کی موجودگی سے بھی ماورا وہ اپنے ایک ذاتی جہان میں گم تھا.. کبھی کبھار وہ چونکتا اور نہایت نزاکت سے آغوش میں آرام کرتی اپنی وائلن کی تاروں پر گز کھینچ کر ایک مدھم سی ''چُوں اُوں'' تخلیق کرتا اور پھر غرق ہو جاتا.. مجھے شائبہ ہوا کہ ابھی حال ہی میں ہالینڈ میں نشیلے دھویں کو پھیپھڑوں میں اتارنے کی جو قانونی اجازت حاصل ہوئی ہے شاید سٹیج پر براجمان ہونے سے پیشتر وہ کچھ دھواں دھواں ہو چکا ہے کہ اس نوعیت کا استغراق اور غرقابی یونہی تو حاصل نہیں ہو جاتے... مجھے یہ بھی گمان ہوا کہ وہ چائے کوسکی کی کسی سمفنی کی دُھن وائلن میں سے کشید کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور کبھی کبھار چونک کر اُسے.. قمیض تیری کالی.. سے ہم آہنگ کرنے لگتا ہے..

گائیک جو مہدی حسن کی غزلیں گانے کے دوران بنجر پڑے رہے تھے، قمیض تیری کالی گاتے ہوئے اُن پر یورو کے نوٹ نچھاور ہونے لگے اور تب اُن کی جان جان میں آئی اور وہ نہال ہو گئے..

افغان طبلہ نواز نے بالآخر آخری دھماد ھم کر کے موسیقی کی اس محفل کا انجام اور اختتام کیا..

ہجوم میں سے ایک نوجوان میرے قریب ہوا ''تارڑ صاحب.. شاید آپ میرے والد صاحب کو جانتے تھے.. وہ وائلن بجایا کرتے تھے.. احسان صاحب.. شاید..!''

احسان اگرچہ خاندانی نہ تھے لیکن وائلن بجانے میں اُنہیں کمال حاصل تھا.. ایک

نہ کیے اور کچھ ملال سا بھی ہوا کہ اگر ٹکٹ چیک نہیں ہونے تھے تو خواہ مخواہ اتنا زرِ کثیر ان کے حصول کے لیے بہا دیا.. بے ٹکٹے سفر کر لیتے..

''معاف کیجیے گا..''

وہ مسکراتا ہوا رُک گیا..

''یہ ٹرین کتنے عرصہ میں ایمسٹرڈیم پہنچے گی؟'' میں نے پوچھا.. اور ظاہر ہے انگریزی میں ہی پوچھا..

''تقریباً ایک گھنٹے میں.. اور کیا آپ ڈچ زبان نہیں جانتے؟''

''نہیں.. ہم دونوں پاکستانی ٹورسٹ ہیں، چند روز کے لیے یہاں آئے ہیں۔''

''ڈچ زبان تو اتنی آسان ہے کہ چند روز میں ہی سیکھی جا سکتی ہے.. انگریزی کی نسبت تو بہت ہی آسان ہے۔'' وہ اپنی صحت مند حالت میں ٹہلتا ہوا مسافروں پر سرسری نگاہیں ڈالتا چلا گیا..

اور ریل گاڑی چھک چھک کرتی ایمسٹرڈیم کی جانب بے آواز چلی جاتی تھی..

جب ہم مایوس ہو گئے کہ آس پاس کوئی نہیں جو ہمیں اپنی کار میں بٹھا کر ایمسٹرڈیم کی سیر کروا دے اور مایوسی کے اس کفن میں آخری کیل فاروق خالد نے ٹھونک دی تھی تو پھر ہم کمر ٹھونک کر ذاتی طور پر اس سفر کے لیے کمر بستہ ہو گئے.. ویسے ہمیں اعزاز اور ناجیہ کی جانب سے پیشکش کر دی گئی تھی کہ ہم وہاں ایک شوفر ڈرِون کار میں سہولت سے لے جائے جا سکتے ہیں اور بعد ازاں واپس لائے جا سکتے ہیں لیکن.. ہماری حمیّت نے یہ گوارہ نہ کیا کہ اب اتنا اپاہج ہو جانا بھی مناسب نہیں.. چنانچہ ہم نے طرح طرح کے بہانے کر کے آزاد سفر کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے اُنہیں صرف اس قدر اجازت دی کہ سفارت خانے کا وہی شاہد جس کے دماغ میں گراریاں اور پن چکیاں چلتی تھیں ہمیں ہیگ کے سٹیشن پر چھوڑ آئے.. بس یہ بتا دے کہ پلیٹ فارم پر کھڑی وہ کونسی گاڑی ہے جو ہمیں ایمسٹرڈیم لے جائے گی.... اور ہاں ٹکٹ کہاں سے حاصل کیے جا سکتے ہیں بس اتنا بتلا دے.. اُس نے ہمارے لیے ٹکٹ خریدتے ہوئے کاؤنٹر کے پار بیٹھی خاتون کو متاثر کرنے کے لیے ڈچ زبان میں کہا کہ یہ ٹکٹ ہمارے ملک کے ایک ایسے نامور ادیب کے لیے ہیں جن نے پینتالیس برس پیشتر ہالینڈ کا سفر کیا تھا اور اس کا تذکرہ اپنے سفرنامے میں کیا تھا تو وہ خاتون نہایت پر اشتیاق ہو کر کہنے لگی. تم مجھے اِس کا نام لکھ دو، میں

''میمونہ کی سیال آنکھوں میں
ایمسٹرڈیم کی نہریں بہتی ہیں''

ہیگ سے ایمسٹرڈیم جانے والی ریل گاڑی چھک چھک کرتی چلی جارہی تھی..

اللہ جانے ہم جس شے میں سوار تھے، اس کے آگے انجن نام کی کوئی شے تھی بھی یا نہیں..اگر تھی تو خاموش اور بے آواز تھی..لیکن میرے کانوں میں وہی چھک چھک کی آواز سنائی دے رہی تھی جو سٹیم انجن میں سے برآمد ہوتی پٹڑی کے گرد جتنے بھی شجر گزرتے تھے اُنہیں دھویں کی دُھونی دیتی، ان میں پوشیدہ پرندوں کو اپنی آواز سے پھڑ پھڑاتی چلی جایا کرتی تھی.. بلکہ اس دومنزلہ ٹرین کی دوسری منزل پر براجمان جیسے کسی لاؤنج میں بیٹھے ہوں میں اور میمونہ کچھ دیر مخمصے میں رہے کہ یہ ٹرین حرکت میں آچکی ہے یا ابھی تک ہیگ کے سٹیشن پر کھڑی ہے کہ نہ کوئی جھٹکا اور نہ ہی پٹڑی پر گھسٹتے آہنی پہیّوں کی گڑگڑاہٹ.. سچی بات ہے جب سے یہ واہیات بے آواز بجلی کے انجن ایجاد ہوئے تھے ریل کے سفر میں لطف ہی نہ رہا تھا، ہم اُن دنوں چلتی گاڑی کی کھڑکی میں سے مُنہ باہر کر کے جھانکتے تو منہ کالا ہو جاتا..میرا تو بہت ہو جاتا کہ رنگ ماشاءاللہ پہلے سے ہی خاصا کالا تھا..بہرطور غیر اخلاقی حرکتوں کے ارتکاب کے بغیر مُنہ کالا کرنے کا یہ آسان ترین نسخہ تھا...بجلی کے انجنوں کی آمد سے یہ سہولت بھی چھن گئی..

اس دوران ایک صحت مند ڈچ جس کے جُثّے سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اُس نے نہ صرف ساری عمر ڈچ گائیوں کا دودھ براہ راست اُن کے تھنوں کی دھاروں سے سُرکا ہے بلکہ ناشتے پر ڈچ پنیر کے تودے بھی شکم میں اتارے ہیں، ٹہلتا چلا آیا..مسافروں پر سرسری نظر ڈالتا چلا آیا..بے شک وہ کسی ٹکٹ چیکر کی وردی میں تو نہ تھا لیکن گمان یہی تھا کہ یونہی ٹہلتا نہیں چلا آیا..اُس نے ہمارے ٹکٹ چیک

لڑکیوں میں ذوق لباس کمال کا ہے.. یہ اُن سے بہتر ذوق جمال رکھتی ہیں، جو لباس زیب تن کرتی ہیں سراسر پورے تن پر نہیں کرتیں، اُسے کہیں کہیں تنہا بھی چھوڑ دیتی ہیں۔''

اُسے ان ڈچ لڑکیوں کے بارے میں صرف ایک ہی اعتراض تھا کہ اُن میں کچھ کچھ مردانہ پن ہے.. جیسے اپنے صوبہ سرحد کی کچھ نازنینوں میں ہوتا ہے.. گمان ہوتا ہے کہ اُن کے بھیتر میں شاید ایک مردانہ پن ہو..

اور یہ گمان کم از کم ہالینڈ میں ممکن ہو چکا تھا..

یہاں مرد و زن کے درمیان تخصیص ممکن نہ رہی تھی..

ہالینڈ دنیا بھر میں وہ پہلا ملک ہے جس نے ایک ہی جنس کے افراد کو شادی کر لینے کی قانونی اجازت بخش دی تھی کہ نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز.. ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے..

ہالینڈ کی دیکھا دیکھی امریکہ میں بھی ہم جنس شادیوں کو قانونی قرار دے دیا گیا.. امریکہ میں قیام کے دوران میں نہایت اشتیاق سے ''نیویارک ٹائمز'' کے اُس سیکشن پر اپنی توجہ مرکوز کرتا جس میں نو بیاہتا جوڑوں کی تصویریں شائع ہوتیں.. میری توجہ کیا دیکھتی ہے کہ دو مرد ایک دوسرے سے لپٹے دُلہا دُلہن ہوئے جاتے ہیں اور دو خواتین جپھے مارے یک جان ہو رہی ہیں اور ہم کیسے جان سکتے ہیں کہ ان میں سے کون ہے جو جملہ عروسی میں گھونگھٹ نکالے ہوگی اور کون ہے جو اُس کا گھونگھٹ اٹھائے گی۔

ابھی پچھلے برس ٹیلی ویژن پر براہ راست ایک ایسی شادی دکھائی گئی جس میں معروف گلوکار ایلٹن جونز نے جانئے وہ دلہا یا دلہن تھے اور وہ ایک اور مرد کے ہمراہ بانہوں میں بانہیں ڈالے پادری صاحب کے سامنے اقرار کر رہے ہیں کہ ہاں میں اسے اپنا خاوند قبول کرتا ہوں.. یا شاید کرتی ہوں... یہ شادی نہایت دھوم دھام سے ہوئی یہاں تک کہ اس میں برطانوی شاہی خاندان کے افراد بھی شریک ہوئے... اور مجھ پر آخری وقت تک یہ نہ کُھلا کہ اُن دونوں میں سے.. بظاہر دو مرد سُوٹوں میں ملبوس.. تو ان میں سے کون ہے جو ڈولی میں بیٹھے گا اور کونسا ایسا ویر ہے جس کے بارے میں گیت گائے جائیں گے کہ.. وِیر میرا گھوڑی چڑھیا.... ظاہر ہے دونوں میں سے ایک وِیر گھوڑی پر سوار ہوگا اور دوسرا ویر ڈولی میں بیٹھ جائے گا.. یہ تو ممکن ہی نہیں کہ بینڈ باجے والے ''راجہ کی آئے گی بارات'' کی دُھن نہ بجانے لگیں.. اور یہاں بھی یہی اُلجھن ہے کہ دونوں ہی راجہ صاحب ہیں، جانے ان میں راج کمار کون ہوگا اور راج کماری کونسی ہے.. بس یہی فروعی نوعیت کی کچھ الجھنیں ہیں ورنہ مجھے ایسی شادیوں پر چنداں

گوگل پر چیک کروں گی کہ کیا واقعی یہ عجیب سا پریشان حال شخص پاکستان کا ادیب ہے کہ نہیں..میں پہلے تو قدرے نروس ہوا کہ جانے گوگل پر کلک کرنے سے میرے بارے میں کوئی معلومات کمپیوٹر سکرین پر ظاہر ہوتی ہیں یا نہیں اور پھر میں ریلیکس ہو گیا کہ گوگل تو ایک ایسا معجزہ ہے کہ اس پر میرے سبزی والے اللہ رکھا کے کوائف بھی درج ہوں گے بلکہ اُس کے چھابوں میں جو گاجریں اور بھنڈی توریاں ہوتی ہیں اُن کی تفصیل بھی ہو گی تو پھر میں بھی کہیں نہ کہیں ہوں گا..

ہیگ ریلوے سٹیشن قطعی طور پر پیچیدہ نہیں.. یہاں آپ کو اپنی ٹرین پکڑنے کے لیے کسی پلیٹ فارم کو تلاش کرنے کی حاجت نہیں.. پلیٹ فارم ایک ہی ہے، گاڑی بیک گیئر لگا کر اُس پر آ کھڑی ہوتی ہے اور اس کے ساتھ بورڈ پر اس کی منزل کا نام روشن ہو جاتا ہے..اور آپ بے دھڑک اُس میں داخل ہو جاتے ہیں..

ہم نے دو منزلہ ٹرین کی بالائی منزل کا انتخاب اس لیے کیا تا کہ راستے میں پڑتی لینڈ سکیپ کا مشاہدہ ذرا بلندی سے کیا جا سکے..کمپارٹمنٹ خالی پڑا تھا..ہم نہایت سہولت سے براجمان ہو گئے..ابھی براجمان ہوئے تھے کہ تین ڈچ لڑکیاں ڈبے میں کھٹ کھٹ کرتی داخل ہوئیں کہ یہ اُن کی اونچی ایڑھیوں کی کھٹ کھٹ تھی اور ہمارے برابر کی نشست کو اپنی متناسب دراز قامتی سے سرفراز کر دیا...اُن کی شکلوں پر نظر تا دیر نہ ٹھہرتی تھی کہ وہ سیدھی سیدھی گوری چٹی بگی سی میمیں تھیں جن کے ناک نقش خوش آثار نہ تھے، اُن میں کچھ کشش نہ تھی..البتہ نظر اُن کی شکلوں سے نیچے اترتی تھی تو اُسے ایک کوہ پیما ہو جانا پڑتا تھا، کبھی نشیب میں اترنا پڑتا تھا اور کبھی بلندیوں پر چڑھنا پڑتا تھا..اور ان راستوں میں طرح طرح کی رکاوٹیں تھیں..اُن کے متناسب بدن یونانی دیویوں کی مانند کاملیت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے..شاید وہ ڈھلے ہوئے تھے یا شاید اُنہیں ڈوریوں اور شکنجوں میں جکڑ کر یُوں ڈھالا گیا تھا کہ وہ دیگچی میں اُبلتے ہوئے پانی کی مانند کناروں سے باہر آنے کو لگتے تھے..چرمی جیکٹیں، تقریباً گھٹنوں تک آتے سیاہ بُوٹ اور سیاہ جرابیں جو اُن کے فُل بوٹوں سے اٹھ کر اُن کی ٹانگوں کو جکڑتی وہاں تک جاتی تھیں..جہاں ایک اور جہان تھا..اور ان سیاہ جرابوں میں بھی جا بجا ایسے شگاف تھے جن میں سے اُن کی مدھر لامی ٹانگیں جھلک دکھلاتی آپے سے باہر ہوتی تھیں..

میں تو اُن کے سراپے کے نشیب و فراز میں محض ایک ادیب ہونے کی مجبوری سے مگن تھا لیکن میمونہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور کہنے لگی ''میرا مشاہدہ ہے کہ امریکہ اور کینیڈا کی نسبت ہالینڈ کی

دھرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اُس نیلاہٹ کا کچھ شائبہ ابھی باقی ہے یا سب کچھ بلیک اینڈ وہائٹ ہو چکا..

سنٹرل سٹیشن سے باہر قدم رکھا تو ایک مدھم دھوپ بھری سویر میں یوں قدم رکھا کہ وہ دھوپ ہم دونوں کے چہروں پر حیرت اور مسرت کے پرخمار بلبلے تخلیق کرنے لگی جیسے چہرے نہ ہوں شیمپئن کے دو جام ہوں جن کے کناروں سے وہ گلابی مے چھلک چھلک پڑتی ہو.. ویسے اگر ہم سنٹرل سٹیشن سے باہر قدم رکھتے احتیاط نہ کرتے تو ایمسٹرڈیم کی مرکزی نہر میں جا گرتے.. اور ہمیں تو تیرنا بھی نہ آتا تھا.. اور ہم یوں غرقِ نہر ہوتے کہ نہ کہیں جنازہ اٹھتا اور نہ کہیں مزار ہوتا..

سب سے پہلی نظر بائیں جانب واقع سائیکلوں کے ایک جمِ غفیر پر پڑی.. پارک شدہ ہزاروں سائیکلوں کی ایک گنجلک آپس میں الجھی ہوئی ایک کائنات تھی جس میں ہر سائز اور ہر شکل کی طرح طرح مردانہ اور زنانہ سائیکلیں منہ جوڑے کھڑی تھیں کہ یہ ہالینڈ تھا، ایک ایسا ملک جس کے حواس پر جیسے شاعروں کے حواس پر عورت سوار ہوتی ہے ایسے ڈچ لوگوں کے حواس پر سائیکل سوار ہوتی ہے بلکہ وہ اُس پر سوار ہوتے ہیں اور یہاں پھر وہی الجھن کہ کیا جانئے کے مردانہ اور زنانہ سائیکلیں قانونِ قدرت کے مطابق آپس میں منہ جوڑے گتھی پڑی ہیں یا مردانہ سائیکلیں اپنی ہم جنس سائیکلوں کے ساتھ چہلیں کر رہی ہیں اور زنانہ سائیکلیں صرف زنانہ سائیکلوں کے ساتھ بوسہ بازی کر رہی ہیں کہ.. یہ ہالینڈ تھا..

ویسے مجھے تو اس سے کچھ فرق نہ پڑتا تھا کہ میری زنانہ سائیکل میمونہ نے ایک عرصے سے مجھے مُنہ نہ لگایا تھا..

تو جب سنٹرل سٹیشن کے باہر قدم رکھتے ہی اُس مدھم دھوپ نے نہ صرف ہمارے چہروں کو روشن کیا بلکہ وہ ہمارے بدن میں سرائت کرتی گئی تو میں نے ایمسٹرڈیم کی ہوا کو ایک طویل سانس بھر کر اپنے اندر اُتارا اور میرے اندر نے ہی سوال کیا کہ.. اے ایمسٹرڈیم، کیا تم مجھے پہچانتے ہو، میں پہلے بھی یہاں آیا تھا..

اور جب ہم اس شہر کے دل میں اترے تو کیا دیکھتے ہیں کہ اس کے فٹ پاتھوں پر.. زیبرا کراسنگ پر قدم دھرتی پار جانے والی اور نہروں کے پُلوں پر سے جھانکنے والی قابل دید اشیاء وہ لڑکیاں ہیں، خوش بدن اور خوش لباس جو دھڑکتی ہیں.. اور وہ اپنے لباسوں کے اندر کم اور باہر.. اتنا دھڑکتی ہیں کہ دل دھک سے رہ جاتا ہے.. اور آپ اس دھک کو ذرا مخفی رکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کہیں بیگم اس

اعتراض نہیں، بڑھتی ہوئی آبادی کی روک تھام کا تیر بہ ہدف نسخہ ہے، آزمائش شرط ہے.. یہاں مجھے وہ سردار صاحب یاد آتے ہیں جو کچھ عرصہ انگلستان میں بسر کرنے کے بعد یکدم ایک ہراساں کیفیت میں وطن لوٹ آئے.. کسی نے پوچھا کہ سردار جی لوگ تو انگلستان جانے کے لیے مرے جاتے ہیں اور آپ اچھے بھلے وہاں سیٹل تھے اور وہاں سے بھاگ نکلے.. کہنے لگے، بھائی میرے جب میں انگلستان گیا تھا تو وہاں ہم جنس پرستی ایک غیر قانونی فعل تھا.. پھر اسے قبول کیا جانے لگا.. پھر قانون آ گیا کہ ہم جنس پرست آپس میں شادیاں بھی کر سکتے ہیں تو میں نے سوچا کہ اس سے پیشتر کہ اسے قانونی طور پر لازمی قرار دیا جائے یہاں سے نکل چلو..

ایمسٹرڈیم کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں تھی.. ایک ہموار یکسانیت کی لینڈ سکیپ تھی جس میں کہیں ایک آدھ بے رُوح سی پن چکی نظر آ جاتی.. بھیڑیں اور گائیاں تھیں، اور پلاسٹک کی چادروں سے ڈھکے وسیع کھیت تھے جن میں ٹیولپ کے بلب بہتر موسموں کے منتظر تھے.. یہاں تک کہ کوئی ایک گھنا شجر بھی اُس زمینی منظر میں نظر نواز نہ ہوا.. میں نے سوچا کہ اگر اس ہموار لینڈ سکیپ میں کہیں صرف ایک کیکر کا مصورانہ امکانات کا حامل ٹیڑھا ترچھا کوئی ایک درخت ہوتا تو وہ اسے سجا دیتا..

راستے میں یونیورسٹی ٹاؤن لائیڈن آیا جہاں ٹرین رُکی تو وہ تینوں حشر ساماں بدن لڑکیاں کھڑی ہوئیں تو ڈبے کی چھت سے ٹکراتی بچیں اور پھر جھکی جھکی سٹیشن پر اتر گئیں.. شاید وہ لائیڈن کی مشہور یونیورسٹی میں پڑھتی تھیں، پڑھتی تو ہوں گی لیکن کسی نہ کسی کو تو ان بدنوں کے ساتھ پڑتی بھی ہوں گی..

اور پھر ایک اور مختصر مسافت کے بعد ٹرین ایمسٹرڈیم کے سنٹرل سٹیشن میں رینگتی ہوئی داخل ہوئی اور جب بقیہ مسافر اٹھنے لگے تو ہم نے جانا کہ یہ رُک گئی ہے..

میں ہیگ سے تو ایک غیر جانبدار کیفیت میں چلا تھا کہ میمونہ کو تو ہیگ کے قصبے کے بعد ایک اصلی یورپی شہر دکھانا ہی ہے تو ہم بھی دیکھ لیں گے لیکن ٹرین سے اترتے ہوئے میرے بدن میں اشتیاق کے رنگا رنگ خیمے نصب ہونے لگے جن میں سے بیشتر نیلے رنگ کے تھے کہ نصف صدی پیشتر جب میں نے اپنی حیات کے پہلے یورپی شہر میں قدم رکھا تھا تو مجھے ہر سُو نیلی دُھند میں ڈوبا ایک شہر نظر آیا تھا.. یہاں تک کہ ہر چہرہ، ہر نہر اور ہر کشتی نیلو نیل دکھائی دی تھی تو اتنی مدت بعد اُس آبی شہر میں پھر سے قدم

''سوہنا شہر اے ایمسٹرڈیم''

ہم بہتے جا رہے تھے..
ایک ایسی شیشہ کشتی میں جس کا نام ''لورز'' تھا..یعنی محبت کرنے والے..
اور مجھے منیر نیازی کا لکھا ہوا وہ گیت یاد آ گیا جو میں نے اپنے ایک ٹیلی ویژن سیریل میں تھیم سونگ کے طور پر متعارف کروایا تھا کہ..

''محبت اب نہیں ہوگی..
یہ کچھ دن بعد میں ہوگی..
گزر جائیں گے جب یہ دن..
تو ان کی یاد میں ہوگی..
محبت اب نہیں ہوگی..''

ہیگ سے روانہ ہوتے ہوئے یہ طے تھا کہ ہم سنٹرل سٹیشن سے باہر قدم رکھتے ہی سب سے پہلے ایمسٹرڈیم کی ساڑھے تین سو کے قریب نہروں میں سے کُچھ میں بہتے جائیں گے..اس آبی شہر پر رواں ہو کر اپنے من میں جو مرجھا چکے کنول ہیں اُن کو کھلاتے جائیں گے اور بعد ازاں ہم فان خوخ میوزیم کی جانب پیدل چلتے ہوئے جائیں گے جیسے مرید ننگے پاؤں چلتے اپنے مُرشد کی درگاہ پر حاضری دینے کے لیے سفر کرتے ہیں..اور مُرشد بھی ایک ایسا رنگریز کہ وہ تمہاری روح اور بدن کو ایسے رنگوں میں رنگ دے جو کسی ستاروں بھری رات کے ہوں، سورج مکھی کے پھولوں اور سرو کے بوٹوں کے ہوں..اور رنگ ایسے کہ ابھی تک گیلے ہوں..تو یہی طے تھا..

دھک کو نہ سُن لے..اگر چہ بیگم خوب جانتی ہے کہ یہ بڑے میاں کب کے بے ضرر ہو چکے، لاکھ دھک دھک ہو تب بھی محض ان کی آنکھوں میں کُچھ دم ہے تو ان کے سامنے یہ گُل بدن، شعلہ ساماں، آتش پیراہن ساغر و مینا پڑے رہنے دو کہ یہ تو ساغر اٹھانے جوگے بھی نہیں رہے..ایک بوڑھے ہو چکے شیر ہیں جن میں کُچھ دم خم نہیں، جو اِن فتنہ ساماں گلہریوں کو دیکھ کر اگر بہت ہی اشتعال میں آئے تو زیادہ سے زیادہ اپنی ناتواں دُم اٹھا کر زمین پر پٹخ دیں گے..بے شک یہ گلہریاں اُن کی دُم سے چھیڑ چھاڑ کرتی رہیں ان میں اب کُچھ دم نہیں، جب دم تھا تو مجال ہے میں نے کسی بھی گلہری کو ان کے قریب پھٹکنے بھی دیا ہو..چنانچہ بیگم بے پرواہ تھی..

♦♦.....♦♦.....♦♦

پانیوں پر گرتے اُن پر خزاں کی تصویریں پینٹ کرتے تھے.... کشتی کے گزرنے سے ہموار پانی میں سے لہریں جنم لیتیں اور اُن کے دھکیلنے سے وہ پتّے کناروں کے ساتھ جا لگتے..

جتنے بھی پُل گزرے.. بلکہ ہم اُن کے نیچے سے گزرے، مریل پُل، کماندار پُل وغیرہ تو مجھے شائبہ ہوتا کہ گزرے تھے ہم یہاں سے اور جن زمانوں میں گزرے تھے تب تو یہ محال لگتا تھا کہ کبھی ہم بھی گزر جائیں گے اور اب تو یہ ہے کہ اس جہاں سے گزر جانے کے خیال میں رہتے ہیں.. لیکن قطعی طور پر ملول اور رنجیدہ نہیں رہتے کہ جو کُچھ دیکھ لیا وہ کتنوں نے دیکھا اور جو کچھ نصیب ہوا وہ کتنوں کے نصیب میں آیا اس لیے کچھ قلق نہیں گزر جانے میں..

دھندلائی ہوئی شناسائی کے پرتو گزرتے جاتے تھے.. میں نے ایمسٹرڈیم میں قدم رکھا تو سوال کیا کہ اے شہرِ آب مجھے پہچانا اور اب اس آبی شہر کے منظر مجھ سے پوچھتے تھے کہ ہم یاد ہیں کہ نہیں..

نہروں کے کناروں کے ساتھ قطار اندر قطار رہائشی کشتیاں جانے کب سے لنگر انداز تھیں کہ اُن کے وجود پر سبز کائی رینگ رہی تھی.. وہ ہماری شیشہ کشتی کے گزرنے سے، ہلکی لہروں کے جنم لینے سے اُن کے دھکیلنے سے قدرے بے آرام ہو کر ذرا ڈولتیں اور پھر سے قائم ہو جاتیں.. اِن کشتیوں میں جانے کیسے کیسے لوگ آن بسے تھے، جو زمین پر ایستادہ ایک گھروندے کے ایک مستقل سکوت کو برداشت نہ کر سکتے تھے اس لیے پانیوں پر بسیرا کرنے کے لیے آ گئے.. کہ یہاں ایک خفیف سا تلاطم شب و روز میں پنہاں تھا، زمین کا جمود نہ تھا.. اور کچھ رہائشیوں نے تو اپنے کشتی گھروں میں مختصر سے باغیچے بھی بنا رکھے تھے، تختوں پر کچھ گھاس بچھا کر.. گملوں میں کچھ گُل بُوٹے سجا کر اور اُن کے درمیان میں ایک بنچ پر وہ سرِ شام بیٹھ کر اپنی آبی گلی میں گزرنے والی ٹریفک سے لطف اندوز ہوتے، ڈچ بیئر کے گھونٹ بھرتے یہ نہیں جانتے تھے کہ یہ ہمارا آبی گھر ہے جو ڈول رہا ہے یا ہم ہیں جو اک گونہ بے خودی سے ڈولتے ہیں..

ان رہائشی کشتیوں میں سے ایک کے چوبی ماتھے پر ایک صلیب آویزاں تھی، ان آبی مکینوں کا چرچ.. اس کلیسا کا پادری بھی یقیناً کوئی ایسا شخص ہوگا جس نے کبھی ایک ملاح کے طور پر ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے کسی سمندری جہاز پر زندگی بسر کی ہوگی ورنہ ایک مسلسل ڈولتے ہوئے کلیسا میں وعظ کرتے ہوئے کوئی زمینی پادری اپنے آپ کو کیسے سنبھال سکتا ہے..

سمندری بگلوں کا ایک لپکتا جھپکتا غول خزاں رسیدہ درختوں کے سائے میں نہر کے گدلے

تو ہم بہتے جا رہے تھے ایک شیشہ کشتی میں جس کا نام ''لورز'' یعنی محبت کرنے والے تھا۔ اُس شہرِ آب ایمسٹرڈیم کی شریانوں اور رگوں میں جو کہ اُس کی نہریں تھیں۔ میمونہ کناروں کے ساتھ لنگر انداز کشتیوں اور ایمسٹرڈیم کے قدیم مکانوں اور خزاں رسیدہ درختوں کو اپنی سیاہ آنکھوں میں سموتی، اپنی بہوطیبہ کی جیکٹ کے سمور کے کالر میں لپٹی، ابھی تک گھنے اور رنگے ہوئے بالوں میں، ٹھوڑی کے گرد اپنی ملوک انگلیاں جمائے کیسی دل کش لگ رہی تھی، اب بھی تر اُحسن ہے دل کش مگر کیا کیجئے۔ اُس کی، مُونا کی گھنیری آنکھیں اُس کے بقیہ چہرے کے زوال سے الگ ویسی ہی سحر انگیز سیاہی میں تھیں جیسی ہماری اولین راتوں میں ہوا کرتی تھی۔ اور وہ ایسی سیال آنکھیں تھیں جیسے پانیوں کے اوپر پانی بہتے جا رہے ہوں۔

میمونہ کی ایک قریبی دوست نے میرا حج کا سفرنامہ ''مُنہ وَل کعبے شریف'' پڑھنے کے بعد کہا تھا کہ مستنصر تمہارے لیے اُلفت کے ایسے اظہار کرتے ہیں جیسے تم اُن کی بیوی نہیں گرل فرینڈ ہو۔ وہ بی بی کیا جانے کہ یہ عشق یک طرفہ ہے۔ میں کبھی بھی اُس کا بوائے فرینڈ نہیں ہوا۔

تو وہ میری سابقہ بیوی اور حالیہ گرل فرینڈ اپنی سیاہ آنکھیں ایمسٹرڈیم کی نہروں پر یوں رواں کرتی تھی جیسے پانیوں کے اوپر پانی بہتے ہیں۔

یہ کروز شیشہ کیپسول کشتی سنٹرل سٹیشن کے دامن میں سے نکلی اور کچھ دیر بعد ایمسٹرڈیم کی بندرگاہ کے کُھلے پانیوں پر رواں ہوگئی۔ کشتی کی چھت میں نصب سپیکرز میں سے مختلف زبانوں میں ہمیں آس پاس سے گزرتے قابل دید مقامات کے بارے میں جانکاری دی جانے لگی۔ ایک سمندری جہاز کی شکل میں ایک سائنس میوزیم پنہاں تھا اور اُس کے برابر میں ایک عجیب بے ہنگم نوعیت کا جدید پُل تھا جو لگتا تھا کہ تعمیر کے دوران گرتے گرتے سنبھل گیا اور ایک ترچھی حالت میں ٹھہر گیا۔ شیشہ بدن کشتی سر جھکا کر بمشکل اُس کے نیچے سے گزری اور پھر ہم ایمسٹرڈیم کی آبی گلیوں کی بھیڑ بھاڑ میں داخل ہوگئے۔ اور یہ نہریں سینکڑوں برسوں سے بہتی چلی آئی تھیں اور اُن کے پانی بھی لگتا تھا اتنے ہی پرانے ہیں کہ ہرگز صاف آئینہ شفاف نہ تھے۔ اتنے گدلے مٹیالے اور آلودہ اور گھنے پانی تھے کہ نظر اُن میں ڈوبتی نہ تھی سطح پر اچٹتی چلی جاتی تھی۔ ہمارے کسی گاؤں میں ہوتے تو جوہڑ کہلاتے، چونکہ ایمسٹرڈیم میں تھے اس لیے نہریں کہلاتے تھے۔ البتہ اُن کی گدلاہٹ اور بدرنگی کی پردہ پوشی خزاں کے ملال میں اُن پر گرتے زرد پتے تھے جو کناروں پر کھڑے شجروں کی شاخوں سے ٹپ ٹپ زرد آنسوؤں کی مانند اُن گھنے

سپیکرز پر ریکارڈ شدہ آواز گونجی.. بائیں جانب نگاہ کیجیے، این فرینک کا گھر گزر رہا ہے، میں نے اس بار اُس کی جانب نگاہ نہ کی.. بے شک دوسری جنگ عظیم کے دوران لاکھوں یہودیوں کو بھسم کر دیا گیا اور اُس یہودی بچی پر بھی بہت ظلم ہوا.. اُس کی ڈائری کے اوراق دنیا بھر میں ایک مقدس صحیفے کی مانند پڑھے گئے اور اُن پر اب تک آنسو بہائے جاتے ہیں.. لیکن کم از کم ظلم میں تو کچھ تخصیص نہ ہونی چاہیے کہ اگر یہ ایک یہودی بچی پر روا رکھا جائے تو یہ ستم ہے اور اگر ایک فلسطینی بچی پر ڈھایا جائے تو چشم پوشی کر لی جائے.. فلسطین کی درجنوں ''این فرینکس'' ہیں جنہوں نے اسرائیلیوں کے ہاتھوں ہلاک ہو جانے سے پیشتر اپنے آبائی گھروں سے بے دخل ہو کر زیتون کے درختوں تلے پناہ لیتے ہوئے کچھ اوراق تحریر کیے.. ڈائریاں لکھیں اور اُن میں سے کچھ شائع بھی ہوئیں اور اس کے باوجود وہ یورپ اور امریکہ کے ضمیر کو جھنجھوڑ نہ سکیں کہ وہ یہودی نہ تھیں، عیسائی یا مسلمان تھیں..

اِک روئی سی دِھی پنجاب دی..
تے تُوں لکھ لکھ مارے وَین..
اج لکھاں دھیاں روندیاں تے وارث شاہ نُوں کہن..

وہ ایک این فرینک یورپ کی روئی تھی اور اُس کے لیے کیسے کیسے بین کیے گئے اور آج لاکھوں نہیں تو ہزاروں فلسطینی این فرینکس روتی ہیں اور کوئی بھی ایسا دردمند نہیں ہے جو اُن کے لیے ایک آنسو بہا دے..

اُن کی ایک این فرینک مر گئی اور وہ اب تک زندہ ہے.. اور ہماری ہزاروں این فرینکس مر گئیں اور.. وہ ہمیشہ کے لیے رزق خاک ہو گئیں..

تو اس بار میں نے کشتی کے قریب سے گزرتے این فرینک ہاؤس پر ایک نگاہ نہ کی کہ وہ بھی تو ہماری این فرینکس کی جانب نگاہ نہ کرتے تھے..

وہ چند سیاح.. اپنے کیمرے سنبھالے باہر چلے گئے..

تب مجھے علم نہ تھا کہ شیشہ کشتی کی اس قید سے باہر جا کر بھی سانس لیا جا سکتا ہے۔

میمونہ مگن تھی۔

''آج ایمسٹرڈیم میں میرا آخری دن تھا۔ میں دوسری صبح ہیگ اور برسلز سے ہوتا ہوا لنڈن

پانیوں پر اترتا، چھینٹے اڑاتا شور کر رہا تھا.. بلکہ غول تھا تو غُل کرتا تھا..ان آبی گلیوں میں سفر کے دوران چوک بھی آ جاتے اور کشتی کی رفتار مدھم ہو جاتی تا کہ دائیں بائیں سے آنے والی کسی اور کشتی کے ساتھ تصادم نہ ہو جائے..

چند سیاح جو ہماری طرح شیشہ کھڑکیوں کے ساتھ ناکیں چپکائے باہر دیکھتے تھے، اٹھے، اپنے کیمرے سنبھالے باہر چلے گئے..

مجھے علم نہ تھا کہ ہم اس شیشے کی قید سے آزاد ہو کر باہر کُھلی ہوا میں بھی سانس لے سکتے ہیں..

میمونہ مگن تھی..

اس یورپ یاترا کا ایک جواز یہ بھی تھا کہ میمونہ جوروس، قطر، سعودی عرب اور کینیڈا تو دیکھ چکی تھی اور امریکہ میں تو تقریباً آباد رہ چکی تھی تو اُسے یورپ کے باغ بہاراں کی سیر بھی کروا دی جائے..

بے شک ان دنوں اگر کوئی باغ تھا تو وہ بہاراں میں نہ تھا، پت جھڑ کی زردی میں مبتلا تھا..مجھے یاد ہے کہ جب میں مائل نہ ہوتا تھا اور میری ہمشیرگان مجھے شادی پر مائل کرنے کے لیے میمونہ کو دیکھ آنے کے بعد اُس کی توصیف یوں کرتی تھی کہ بھائی جان یُوں سمجھ لیجیے کہ اُس لڑکی میں ایک حُسن بیمار کی سی دل کشی ہے اور اُس کی پلکیں تو اپنے بوجھ سے اٹھتی ہی نہیں ہیں..یہ تو بعد میں کُھلا کہ اُس حسن بیمار نے مجھے کیسا بیمار کیا اور جب اُس کی پلکیں اٹھیں تو اُن میں پوشیدہ ایک شیر کی آنکھیں تھیں..نکاح کے دوران میری زری کی اچکن اور سلک کی پگڑی کے برابر میں وہ ایک سُرخ جوڑے میں سمٹی بیٹھی تھی اور جب کبھی میں ایک دزدیدہ نگاہ اُدھر کرتا تو وہ مجھے ٹیولپ کے ایک سُرخ پھول کی مانند نظر آتی..

''دائیں جانب نگاہ کیجیے..یہ ایمسٹرڈیم کا سب سے مختصر گھر گزر رہا ہے، چوڑائی میں صرف دس فٹ..صرف ایک کھڑکی..''

میں نے نیویارک کے گرین اِچ ولیج میں بھی اُس شہر کا سب سے چھوٹا گھر دیکھا تھا جو صرف ایک دروازے اور ایک کھڑکی پر مشتمل تھا اور تب بھی مجھے خیال آیا تھا کہ اگر مختصر ترین گھر کے ساتھ سیاحوں کو فریب دیا جا سکتا ہے تو آیئے پاکستان آیئے، آپ سب مختصر گھروں کو بھول جائیں گے..لاکھوں جھگیاں..ایک کمرے کے گھر اور کچھ خاندان سیورج پائپوں کے اندر گھر بنائے بیٹھے..سوتے جاگتے، بچے پیدا کرتے اور مرتے..ان کے سوا لاکھوں مخلوق جن کے سر پر آسمان کے سوا کوئی اور چھت نہیں تو ہے کوئی اور جو ہمارے مقابل آئے..

گھٹتی چلی جاتی ہے۔ یہ پچھلی صدی کے ڈچ سوداگروں کے شاہانہ مکان ہیں۔ پہلی منزل پر بڑے کمرے میں گھر کا مالک اور اس کی بیوی قیام پذیر ہوتے تھے۔ دوسری منزل جو نسبتاً چھوٹی ہے۔ بچوں کے لیے مخصوص تھی۔ تیسری منزل جس پر صرف ایک چھوٹا سا کمرہ ہے نوکروں کا کوارٹر تھا۔''

''اور آخری منزل پر کیا گھوڑے باندھتے تھے؟'' ایک لمبے تڑنگے امریکی نے سیاحوں کو محفوظ کرنے کی ناکام کوشش کی۔

''نہیں جناب۔'' گائیڈ نے کہا۔ ''چوتھی منزل کی چھوٹی کوٹھڑی ساس کو رکھنے کے لیے تھی۔''

''کس کی ساس؟ عورت کی یا مرد کی؟'' ایک امریکی عورت نے تڑاخ سے پوچھا۔

''اگر امریکہ ہوتا تو یقیناً عورت کی ساس رکھی جاتی مگر ہم ترقی یافتہ ملک ہیں اس لیے یہاں مرد کی ساس کے رہنے کا انتظام تھا۔''

''اور یہ اوپر والی منزل پر لوہے کا کنڈا کیا ساس کو لٹکانے کے کام آتا تھا؟'' ایک موٹے جرمن نے قہقہہ لگاتے ہوئے پوچھا۔

''جی نہیں۔'' گائیڈ نے ہنس کر جواب دیا۔ ''اس کے ساتھ رسّہ لٹکا کر سامان اوپر چڑھایا جاتا تھا۔''

''شہر میں تقریباً ساڑھے چار سو نہریں اور اُن کی ذیلی شاخیں ہیں۔ ان نہروں پر ساڑھے پانچ سو پُل ہیں۔''

''باقی سو پُل کیا خشکی پر تعمیر کیے گئے ہیں؟'' کسی نے نعرہ لگایا۔

''یہ وہ پُل ہے جہاں سے بیٹلز نے چھلانگ لگائی تھی۔ پُلوں کے ساتھ آہنی کنڈوں والے لمبے بانس اس لیے رکھے گئے ہیں تاکہ اگر کسی صاحب کا ہیٹ ہوا سے اُڑ کر نہر میں جا گرے تو بانس کی مدد سے نکالا جا سکے۔''

ہم یکے بعد دیگرے سات خوبصورت سجے سجائے پُلوں کے نیچے سے گزرے۔ ان سات پُلوں کو ''سات بہنوں'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

''یہ پُل صرف لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ سامنے والے پُل کو ''مریل پُل'' کہا جاتا ہے کیونکہ معمار کا نام Skinny یعنی ''مریل'' تھا۔ یہاں سے پورے شہر کا گندا پانی بحرالکاہل میں سے ہو کر امریکہ پہنچ جاتا ہے۔'' امریکیوں نے اس بات کا بے حد برا منایا۔

جا رہا تھا۔ سنٹرل سٹیشن سے سفر کا ایڈوانس ٹکٹ خرید کر میں مَنٹ ٹاور کے قریب پھولوں کے بازار کی طرف چلا گیا جہاں سے شہر کی مختلف نہروں کے لیے خوبصورت کشتیاں چلتی تھیں۔ میں نے کنارے سے ٹکٹ خریدا اور ایک کشتی میں سوار ہو گیا۔ شیشے کی چھت اور آرام دہ نشستوں سے مزین خوبصورت کشتی غیر ملکی سیاحوں سے پُر تھی۔ وہ بھی میری طرح ایمسٹرڈیم کی نہروں کا حسن قریب سے دیکھنے آئے تھے۔ انجن سٹارٹ ہوئے۔ ڈرائیور نے بھونپو بجایا اور ہم نہر کی پرسکون سطح پر تیرنے لگے۔ کشتی کے سرے پر ہالینڈ کا پرچم لہرا رہا تھا۔ ہمارے دونوں طرف نہر کے کناروں پر خوبصورت شاہ بلوط، چرواں پتّوں والے ایلم اور لائم درختوں کی قطاریں تھیں جن کے پیچھے ایمسٹرڈیم کے قدیم تاجروں کے شاہانہ مکان کھڑے تھے۔ اِن مکانوں کی قدیم وضع اور دیدہ زیب طرزِ تعمیر برقرار رکھنے کی خاطر عمارت میں کسی قسم کا ردوبدل کرنا خلاف قانون ہے۔ اکثر مکان اب تجارتی اداروں اور بینکوں کے دفاتر کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔

ہمارا گائیڈ بے حد دلچسپ تھا۔ نہروں کے کناروں پر واقع تاریخی عمارتوں اور قدیم پُلوں کی نشاندہی کرنے کے علاوہ وہ چھوٹے چھوٹے چٹکلے بھی بیان کرتا چلا جاتا۔

''خواتین وحضرات! کیا آپ کو معلوم ہے کہ ہالینڈ کے ایک باشندے پیٹر سٹائی وسن نے دریائے ہڈسن کے کنارے ایک شہر کی بنیاد رکھی اور اسے نیو ایمسٹرڈیم کا نام دیا؟ بعد میں اسے انگریزوں نے ہتھیا لیا اور اپنے شہر یارک کا نام دے کر نیو یارک کر دیا۔''

''ہم کینیڈا کی طرف سے وارد ہو جاتے تو اب اُس کا نام نیو پیرس ہوتا۔'' ایک فرانسیسی بوڑھے نے خوشدلی سے کہا۔

''دائیں ہاتھ والے مکان میں لُوئی نپولین کا قیام تھا اور بائیں ہاتھ پر وہ جگہ ہے جو آج سے پانچ سو سال قبل ایک اصطبل تھی۔''

''اوہ واقعی؟'' ایک عورت نے حیرت زدہ ہو کر کہا ''اور اب کیا ہے؟''

''اب بھی اصطبل ہے۔'' گائیڈ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''اور یہ ہے وہ کلیسا جس کی نقل پیرس میں کلیسائے نوٹرڈیم کے نام سے مشہور ہے۔'' فرانسیسیوں نے اس بے عزتی پر خوب شور مچایا۔

''آپ ان چار منزلہ مکانوں کو تو دیکھ ہی رہے ہیں جن کے کمروں کی چوڑائی منزل بہ منزل

''سیکس میوزیم، واڈ کا میوزیم اور ایمسٹرڈیم کی ہیرا منڈی''

ایک چیز ہے جو خوبصورتی کی سب سے بڑی دشمن ہے..بھوک!

پیٹ میں نہ ہوں روٹیاں تو سب باتیں کھوٹیاں..

یعنی ایمسٹرڈیم کے سب ہیرے، کانچ کے ٹکڑے..نہریں، گندے نالے... ٹیولپ کے پھول بھی کاغذ کے بنے ہوئے، بے مہک....اور تو اور فان خوخ کی تصویروں کے رنگ بدرنگ.. یہاں تک کہ اُس کے پینٹ کیے ہوئے سورج مکھی کے پھول سُوکھے سڑے اور ستاروں بھری رات کے سب ستارے ماند اور بجھتے ہوئے..

بھوک نہ صرف خوبصورتی بلکہ عشق کی بھی دشمن ہے..اور اس امر کی گواہی تو اہل دمشق بھی دے سکتے ہیں جنہوں نے اس کے ہاتھوں لاچار ہو کر عشق بھی فراموش کر دیا تھا..

بس اسی لیے کہ کانچ کے ٹکڑے پھر سے ہیروں میں بدل جائیں، نہروں کی روانی کا سحر جاری ہو جائے، ٹیولپ پھر سے نو بہار ہو جائیں اور بے چارے فان خوخ کی تصویروں میں جان پڑ جائے..سب کھوٹے کھرے ہو جائیں ہم نے اپنی آنکھیں ایمسٹرڈیم کے حُسن سے بند کر لیں اور پیٹ پُوجا کے مندروں یعنی ریستورانوں وغیرہ کے لیے کھول دیں..

سنٹرل سٹیشن سے ڈیم سکوئر تک جانے والی مشہور زمانہ سڑک پر واقع ہر دوسری دکان ہالینڈ کے سیاحتی تحفوں کی تھی اور اُس سے پہلی ایک ریستوران یا مے خانہ تھا اس لیے خورد و نوش کے وسیع امکانات اور اختیار تھے..میں کسی ہنگیرین ریستوران کے باہر آویزاں باتصویر گولاش کی خوراک کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہوں تو میمونہ کہتی ہے، اسے دفع کرو گوشت اور سبزیوں کا بدذائقہ ملغوبہ

اب شام ہو چکی تھی۔ نہروں میں چلتی ہوئی کشتیوں، درجنوں پُلوں، سوداگروں کے شاہانہ مکانوں اور شاہِ بلوط کے درختوں میں نصب شدہ قمقمے ایک دم جَل اٹھے اور ہزاروں جھلمل جھلمل کرتی روشنیوں کا عکس پانی میں جھولنے لگا۔ شہر کی نہروں کا چکر پورا کرنے کے بعد جب کشتی ہمیں واپس پھولوں کے بازار کے پاس لائی تو ایمسٹرڈیم کی سرمئی شام گہری رات میں ڈھل چکی تھی اور ہر طرف چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ میں کشتی سے اُترا اور ٹرام میں سوار ہونے کی بجائے پیدل ہی اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایمسٹرڈیم میں یہ میری آخری شام تھی۔ میں نے ایک پُل پر سے نیچے جھانکا۔ دودھیا چاندنی کی تہ آسمانوں سے اُتر کر ایمسٹرڈیم کی نہروں پر بچھ گئی تھی۔ لائم درختوں کے سُرخ پتّے اور زرد کلیاں پانی میں تیر رہی تھیں۔ ''نکلے تری تلاش میں'' 1969ء

میں بھی اپنا کیمرہ تھامے جس کی بیٹری مدھم ہوتی جاتی تھی، باہر کُھلی فضا میں آ گیا اور باہر ایک سرد ہوا تھی جس نے ایمسٹرڈیم کے حُسن کے خمار کو دوچند کر دیا اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ نہ تو ایمسٹرڈیم کی نیلاہٹ بھری خوبصورتی زوال پذیر ہوئی ہے اور نہ ہی مجھ پر عمر اور گزر چکے زمانے اثر انداز ہوئے ہیں.. ہم دونوں.. ایمسٹرڈیم اور میں اب بھی اتنے نوخیز تھے کہ اُس کی شریانوں میں بہتی نہریں اور میری رگوں میں دوڑتے خون میں ابھی تک وہی تُندی اور روانی تھی جو کہ تب تھی..

ایک سمندری بگلا غُل کرتا عین میرے سر پر سے گزر گیا..

نہر کنارے سیاہ چرمی جیکٹ میں لپٹی ایک سنہری بالوں والی لڑکی سر جھکائے چلتی جاتی تھی..

شیشہ کشتی ایمسٹرڈیم کی نہروں میں ایک سودائی کی مانند گھومتی پھرتی.. پانیوں پر سفر کرتی بالآخر وہیں آن رُکی.. سنٹرل سٹیشن کے دامن میں جہاں سے وہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ پیشتر رواں ہوئی تھی.. تو میمونہ نے باہر آتے ہوئے اپنی گھنیری پلکوں کو جھپکاتے ہوئے کہا ''سوہنا شہر اے..''

♦♦.....♦♦.....♦♦

تھا۔ یہ فارمولا کسی حد تک کشمیر میں بھی آزمایا گیا۔ گوشت جیسا کیسا بھی میّسر ہو گیا اور اکثر بڑا گوشت اور سب سے فالتو شلجم وغیرہ تو اُنہیں چولہے پر چڑھا دیا گیا۔۔ پوری رات چڑھا رہا اور اگلے روز یہ ہے کشمیر کی مایۂ ناز خوراک۔۔ شب دیگ!

علاوہ ازیں بہت سے چینی ریستوران بھی تھے اور چونکہ یہ پاکستان میں نہ تھے اس لیے یہاں دنیا کے بہترین چینی کھانے تیار نہیں ہوتے تھے بلکہ ان ریستورانوں کے قریب سے گزر جایئے تو جسم و جاں عجیب سی بدبوؤں سے معطّر ہو جاتے تھے۔۔ ایک دو آئرش سٹیک ہاؤس تھے۔۔ کورین، تھائی، جاپانی یہاں تک کہ تبت کی خوراک کے بھی بندوست تھے لیکن ہم ان سب سے اجتناب کرتے آخر ''گو امریکہ گو'' والے امریکہ صاحب بہادر کی خوراک کے اشتہار دیکھ کر جان بوجھ کر اُس کے بہلاوے میں آ گئے کہ میکڈونلڈ اور کے ایف سی ہی وہ صاف ستھرے اور عمدہ خوراک کے نخلستان تھے جن کی جانب ہماری بھوک کا اونٹ والہانہ طور پر ٹھمک ٹھمک چلا جاتا تھا۔۔ ماؤزے تنگ نے امریکہ کو کاغذ کا شیر قرار دیا اور یہ حقیقت ہے کہ ماؤ کے سامنے امریکہ واقعی کاغذ کا ایک شیر رہا لیکن اِن زمانوں میں اُس کے حنوط شدہ بدن پر امریکی میکڈونلڈ اور کے ایف سی کے نیون سائنوں کی روشنیاں پڑتی ہیں کہ اہل چین کی مرغوب خوراک اب برگر اور کینٹکی فرائڈ ہے۔۔ امریکہ اپنی تمام تر قاہر اور خدائی قوت سے چین کو زیر نہ کر سکا لیکن اُس کے ایک برگر نے اُسے تسخیر کر لیا۔۔ اور اس کا سبب ان خوراکی اداروں کی صفائی ستھرائی اور دنیا بھر میں خوراک کی یکساں کوالٹی ہے۔۔ بلکہ ماسکو میں تو ہم ایک میکڈونلڈ میں برگر اور فرنچ فرائز کھاتے ہوئے آبدیدہ ہو گئے کہ ہم نے قیام روس کے دوران دنیا کی بدذائقہ ترین خوراک نگلی تھیں۔۔ رُوسی خوراک۔۔ رُوس کے شدید موسم سرما سے بھی زیادہ ہولناک ہے۔۔ صرف خوراک ہی نہیں' اُن امریکی خوراک گھروں کے غُسل خانے بھی شفاف ترین ہیں چاہے وہ غسل خانوں کے بدترین ملک رُوس میں ہوں یا پاکستان میں موٹروے کی مسافت کے دوران ہوں۔۔ رُوس کے ایک قدیم کلیسائی قصبے کی جانب سفر کرتے ہوئے جب میں نے ڈرائیور سے گزارش کی کہ کہیں رُک جایئے، آبی بوجھ بڑھتا جا رہا ہے تو اُس نے کہا۔۔ تارڑ صاحب۔۔ وہاں ایک میکڈونلڈ بھی ہے جس کے غسل خانے اس لائق ہیں کہ۔۔۔ آپ ذرا کچھ دیر ضبط کر لیجیے۔

مختصر یہ کہ ہم نے ایک کے ایف سی کو منتخب کیا اور اُس کے اندر گئے تو بھوک کے باعث سب کھرے کھوٹے ہو رہے تھے، شاد کام ہو کر باہر ایمسٹرڈیم کے ایک فٹ پاتھ پر آئے تو سب کھوٹے بھی

سا لگتا ہے اور گوشت بھی جانے کیسے کیسے جانوروں کا ہے..

ویسے تاریخی طور پر میمونہ بالکل درست کہتی تھی کہ یہ اہل مغرب ایک زمانے میں خوراک کی شدید قلّت کا شکار تھے، برصغیر کی مانند وہاں دنیا کی ہر سبزی اور پھل زرخیز زمین کے باعث خود بخود نہیں پھوٹ پڑتا تھا، برفانی موسموں اور بنجر زمین کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ آلو پھوٹ پڑتا تھا.. جب میں نے اعزاز سے ڈچ لوگوں کی مرغوب ترین خوراک کے بارے میں پُوچھا تو اُس نے کہا، آلو... میں نے پُوچھا کہ اس کے سوا.. تو وہ کہنے لگا.. مزید آلو.. ایک ڈچ پاکستانی نے باقاعدہ شکایت کی کہ تارڑ صاحب ہم لوگ اگر کبھی کسی ڈچ خاندان کے ہاں ڈنر کے لیے مدعو کر لیے جائیں تو کھانا گھر سے کھا کر جاتے ہیں کہ وہاں تو... آلو.. اور بہت آلو.. ابلے ہوئے.. تلے ہوئے، دم پخت کیے ہوئے.. دو چار سبزیاں، پنیر کے چند پارچے اور.. آلو ہی آلو.. ویسے صرف اہل ہالینڈ ہی نہیں اطالیہ اور ہسپانیہ کے سوا بقیہ تمام یورپ آلو ہے.. کسی سیانے نے انگریزوں کے بارے میں کہا تھا کہ اُنہوں نے نہیں آلوؤں نے تقریباً پوری دنیا کو تسخیر کر لیا تھا کہ وہ دن رات آلو کھاتے کھاتے تنگ آ گئے اور کسی بہتر خوراک کی تلاش میں اپنے جزیرے کو تیاگ کر نکل کھڑے ہوئے.. سوویت یونین سے واپسی پر میری قلمی دوست ایلکے سومرز نے برلن میں مجھے اپنے نہایت شاہانہ گھر میں لنچ کے لیے مدعو کیا تو وہاں.. آلو ہی آلو.. البتہ ایک جرمن خاتون جو میرے ایک انگلستان کے زمانوں کے دوست کوکی کی شاید تیسری یا چوتھی جرمن بیوی تھی وہ آلوؤں سے بے حد الرجک تھی، میز پر صرف ایک آلو کا قتلہ دیکھتی تو ابکائیاں لیتی واش رُوم کی جانب بھاگ نکلتی.. میں نے سبب پُوچھا تو کہنے لگی کہ مستنصر دوسری جنگ عظیم کے دوران جب برطانوی فضائیہ ہمارے شہروں پر بمباری کرتی اُنہیں کھنڈر کر رہی تھی تو میں اور میری ماں اپنی جان بچانے کی خاطر ایک تہہ خانے میں پورے تین ماہ روپوش رہے.. تب میں صرف تین برس کی تھی اور اُس تہہ خانے میں ہمارے پاس کھانے کے لیے کُچھ نہ تھا سوائے کچّے آلوؤں کے.. اور کبھی کبھار جب ہم آگ جلا سکتے کُچھ بُھونے ہوئے آلوؤں کے.. تب سے میں اگر اخبار میں بھی ''پوٹیٹو'' کا لفظ دیکھتی ہوں تو مجھے قے آنے لگتی ہے.. غالباً وہ واحد یورپی خاتون تھیں جو آلوؤں سے الرجک تھیں.. تو اُن زمانوں میں اہلِ ہنگری بھی جیسا کہ اُن کے ملک کے نام سے ظاہر ہے ہنگری ہوا کرتے تھے.. تو جو کُچھ بھی میسر ہوتا، کوئی بھی سبزی.. کسی بھی نوعیت کا گوشت.. کوئی گھاس پھونس وغیرہ تو وہ تسلے میں ڈال کر اُسے پانی سے لبریز کر کے آگ پر چڑھا دیتے اور جو کُچھ بھی اگلی سویر تک تیار ہو جاتا وہ ہنگیرین گولاش ہوا کرتا

سووینئر ہی ساتھ لے چلیں۔ چنانچہ ہم ایک ایسے وسیع سووینئر سٹور میں چلے گئے جہاں ہالینڈ کے یادگاری نمونوں کی ایک نمائش سجی تھی... کُچھ دل کو لگیں جن میں ایمسٹرڈیم کے قدیم مکانوں کی صُورت کا ایک مگ تھا، فان خوخ کی ''سٹاری نائٹ'' کی ایک نمائشی پلیٹ تھی اور کُچھ انٹ شنٹ سووینئر تھے.. ادائیگی کی خاطر کاؤنٹر پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ سٹور ایک تُرک برادر کی ملکیت تھا..ہم نے جان بوجھ کر اُسے اپنا پاکستانی ہونے کا بتایا کہ شاید تُرکی اور پاکستان کے برادرانہ تعلقات کی زد میں آ کر کُچھ یورو کم ہو جائیں پر ترک بھائی نے چنداں لحاظ نہ کیا..کاؤنٹر پر ایک حنوط شدہ نہایت فربہ گھنے سفید بالوں والی ایک حسین بلّی ابوالہول کے انداز میں ساکت بیٹھی تھی، اُس کی بلوریں آنکھیں زندہ لگتی تھیں اور جس لمحے میں اُسے ایک پیار بھری تھپکی دینے کی خاطر ہاتھ بڑھانے کا ارادہ کر رہا تھا تو میری نظر اُس کے برابر میں آویزاں ایک بورڈ پر پڑی جس پر درج تھا کہ ''براہِ کرم اس بلّی کو ہاتھ مت لگائیے۔''

وہ شاندار موٹی گھپلی میاؤں اُس تُرک برادر کی پالتو بلّی تھی جو بقول اُس کے صُبح سویرے کاؤنٹر پر بٹھا دی جاتی تھی اور وہ شام تک اُسی حالت میں حنوط رہتی تھی۔ ایک بھی میاؤں نہ کرتی تھی.. میرا خیال ہے اُس کے حُسن کا کُچھ مول نہ پڑا تھا کہ وہ ایک جنسی طور پر ناآسودہ بلّی لگتی تھی جس کے نصیب میں کوئی ہینڈسم بالگڑ بلّا نہ تھا..

ہم پھر سے گاہے بگاہے چلنے لگے اور ایک بورڈ کے قریب رُک گئے جس پر لکھا تھا ''واڈکا میوزیم..خوش آمدید''..ہم نے سوچا کہ ام الخبائث کے اس عجائب گھر پر ایک نظر ڈال کر کُچھ عبرت حاصل کرتے ہیں... میوزیم تو کیا ہونا تھا یہ لوگوں کو متوجہ کرنے کا ایک حربہ تھا، سیدھی سادھی واڈکا شراب کی دکان تھی جس میں دنیا بھر کی جہاں جہاں بھی واڈکا تیار ہوتی تھی وہاں وہاں کی بوتلیں شوکیسوں میں اپنے اندر خمار کے قوی امکانات لیے نظر نواز ہوتی تھیں..ظاہر ہے یہاں رُوسی واڈکا راج کرتی تھی کہ روسیوں کے بارے میں ایک کہاوت ہے کہ وہ صرف دو چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں، ایک تو اپنے آرتھوڈوکس چرچ پر اور دوسرے واڈکا پر.. یہ بھی کہا گیا کہ چونکہ نپولین برانڈی پیتا تھا اور رُوسی واڈکا، چنانچہ واڈکا نے برانڈی کو مات دے دی..اور اگر اُنہیں واڈکا نہ ملے تو آرتھوڈوکس چرچ کی عیسائیت پر بھی اُن کا ایمان متزلزل ہو جاتا ہے..اب یہاں میری حب الوطنی عود کر آئی اور میں نے شوکیسوں میں سجی بوتلوں میں پاکستانی کوسک واڈکا کو تلاش کرنے کی کوشش کی پر وہ وہاں نہ تھی..وطن کی حمیّت کا سوال تھا۔ چنانچہ میں نے اس میوزیم کے نگہبان کو سرزنش کرتے ہوئے کہا ''یہ کیسا واڈکا میوزیم ہے جہاں

کھرے نظر آنے لگے..

میمونہ کے لیے ایمسٹرڈیم کی یہ چہل پہل اور کھنکتی رونقیں تعجب، حیرت اور انبساط کا باعث بن رہی تھیں کہ وہ ابھی تک ہیگ کی پُر وقار اور سناٹوں بھری قدامت کے ٹھہراؤ کی عادی تھی اور وہ اب یورپ کی بے فکر گہما گہمی اور رنگ و نُور کے سیلاب سے آشنا ہوئی تھی۔

ہم طے کر چکے تھے، ہیگ سے روانہ ہوتے ہوئے.. کہ ایمسٹرڈیم کی نہروں میں روانی کے بعد ہم یونہی خراماں خراماں چلتے فان خوخ میوزیم تک چلے جائیں گے اور اُس پاگل کن کٹے مصوّر کے وہ بے شمار شاہکار دیکھیں گے جنہوں نے دنیا کو پاگل بنا رکھا ہے۔ نہیں.. خراماں خراماں نہیں.. بلکہ گاہے بگاہے..

گئے زمانوں میں آج کے محاورے کے مطابق مغرب زدہ، صرف انگریزی تہذیب سے آشنا اگرچہ ایک معصوم خصلت اور پیاری سی خاتون تنویر مسعود نام کی ہوا کرتی تھی جو مسعود نام کے ایک ناتواں سے آرکی ٹیکٹ سے بیاہی ہوئی تھی۔ اپنے تئیں بامحاورہ اردو بولنے کی کوشش کرتی رہتی تھیں تو ایک روز اقبال ٹاؤن میں واقع کشور ناہید کے ادیبوں کے یتیم خانے میں وارد ہوئی تو کسی نے پُوچھا کہ تنویر تم کیسے آ گئیں تو اُس نے کہا.. بس میں گھر سے نکلی اور گاہے بگاہے چلتی یہاں آ گئی۔

تو ہم بھی خراماں خراماں نہیں بلکہ گاہے بگاہے فان خوخ میوزیم کی جانب چلتے جا رہے تھے.. تو راستے میں ایک بورڈ نظر آیا ''سیکس میوزیم''

میں اُس بورڈ پر ایک حسرت بھری نظر ڈال کر گاہے بگاہے چلنے کو تھا جب میمونہ نے نہایت سنجیدگی سے کہا ''میں باہر انتظار کرتی ہوں آپ ہو آیئے۔''

اگرچہ میں اس میوزیم کے اندر جانے کے لیے مرا جاتا تھا تاکہ سیکس کے رموز سے کُچھ ابتدائی آگاہی حاصل کر سکوں لیکن میں نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا ''توبہ توبہ بیگم.. ایسی مخرب الاخلاق عجائب گھر میں جا کر میں کیوں اپنی عاقبت کو مزید خراب کروں.. جانے وہاں کیا کیا اخلاق باختہ نمائش پر ہو گا.. توبہ توبہ۔''

میں اپنی بیگم کی وسیع النظری کا قائل ہونے کو تھا کہ مُجھے کُچھ دھیما سا شک ہوا کہ اُس نے یہ اجازت قدرے طنزیہ انداز میں مرحمت فرمائی ہے..

ہم اگر ایمسٹرڈیم میں آئے تھے تو یادگاری کے طور پر اس گلی کے کُچھ پتھر ہی لے چلیں.. کُچھ

میمونہ کو دکھائی دے گئی کہ ڈیم سکوئر کے وسیع چوک میں جہاں ریستورانوں، مے خانوں کے درجنوں نیون سائن جلتے بجھتے تھے وہاں میری بیگم کی نگاہ تیر کی مانند ڈیم سکوئر کے ایک کونے میں واقع ایک سٹور کے ماتھے پر آویزاں ''ایمسٹرڈیم ڈائمنڈز'' کے ایک بورڈ پر ٹھاہ کر کے جا لگی اور وہ اس بورڈ کو دیکھ کر وفورِ جذبات سے یوں لبریز ہوئی جیسے کسی غرق ہو چکے جہاز کا کوئی ایک مسافر کسی جزیرے میں پہنچ کر وہاں دنیا جہان سے کٹ کر زندگی بسر کرتا ہے اور پھر اُسے ویران سمندر کے افق پر ایک کشتی نظر آ جاتی ہے اور وہ اُسے دیکھ کر چیختا ہے کہ.. کشتی۔ البتہ میمونہ نے چیختے ہوئے تو نہیں لیکن ایک پُر اشتیاق آواز میں کہا.. ہیرے..

اور اس ہیرا اجمال کا قصہ کُچھ یوں ہے کہ میمونہ جونہی ہالینڈ سے بیلجیئم میں داخل ہوئی تو اُس کی سیاہ آنکھیں یکدم روشن ہو گئیں.. ہیرے..

اور میں نے ہراساں ہو کر اُسے سمجھایا کہ بیگم.. یہ ہیرے وغیرہ تو جنوبی افریقہ یا گولکنڈہ کی کانوں وغیرہ میں پائے جاتے ہیں تو اس بیلجیم میں کہاں.. تو میمونہ کہنے لگی، میں خوب جانتی ہوں کہ یہاں بہت ہیرے ہوتے ہیں، یاد نہیں جب وہ ہمارا البرٹی مارکیٹ والا جیولر مجھے کوئی انگوٹھی یا نیکلس خریدنے پر مائل کرتا تھا تو کہتا تھا کہ بیگم صاحبہ یہ بیلجیم گٹ ہے..

''لیکن یہ تو ایمسٹرڈیم ہے۔''

''میں یہ بھی خوب جانتی ہوں کہ کوہ نور ہیرا اسی شہر میں تراشا گیا تھا تو چلو ہیرے خریدتے ہیں.. ہم پیرس تو نہیں جا سکے اُس رقم سے ہیرے خریدتے ہیں..''

دراصل یہ میری اپنی ایک پرائیویٹ حماقت تھی۔ جب پیرس یاترا کی بیل منڈھے نہ چڑھ سکی اور حرام ہے مجھے کُچھ بھی شائبہ ہو کہ یہ جو بیل ہے کس اور کیسے منڈھے پر نہیں چڑھ سکتی۔ میں نے تو یونہی اپنی زبان دانی کا رعب جمانے کے لیے یہ محاورہ استعمال کر دیا ہے.. تو پیرس کے سفر اور قیام کے لیے میں نے جو رقم مختص کر رکھی تھی وہ اس بیل کے منڈھے نہ چڑھنے کے باعث فالتو ہو گئی تھی تو میں نے میمونہ کو پیشکش کر دی تھی کہ تم بلا جھجک اس خطیر رقم سے اگر چاہو تو کبوتر کے دو چار انڈوں کے حجم جتنے ہیرے خرید سکتی ہو اور کیا یاد کرو گی کہ کیسے مخیّر خاوند سے پالا پڑا ہے..

اور یہاں واقعی پالا پڑ رہا تھا، سردی بڑھتی جاتی تھی اور میمونہ ایک ٹیولپ کی مانند کھلتی ہوئی ''ایمسٹرڈیم ڈائمنڈز'' کی جانب لپکتی جاتی تھی۔

پاکستان کی نمائندگی ہی نہیں ہے۔''

نگہبان غریب کے تو اوسان خطا ہو گئے اور وہ ہکلا کر بولا ''کیا پاکستان ایسے مذہبی اور شدت پسند ملک میں بھی واڈ کا تیار ہوتی ہے؟..اگر ہوتی ہے تو کیسی ہوتی ہے؟''

''مجھے کیا پتہ کہ کیسی ہوتی ہے۔'' میں نے ٹھٹک کر کہا۔''پر اتنا جانتا ہوں کہ اہل ذوق کے مطابق وہ رُوسی اور سویڈش ایپسلوٹ سے بھی بڑھیا ہوتی ہے۔''

اُس نگہبان نے فوری طور پر اپنی ڈائری میں پاکستان درج کیا اور معذرت بھرے لہجے میں بولا ''سَر آپ اگلی مرتبہ جب ایمسٹرڈیم آئیں گے تو ہمارے میوزیم میں پاکستانی واڈ کا بھی نمائش پر ہوگی..'' کون کہتا ہے کہ ہم پاکستانی غیر ملکوں میں جا کر اپنے ملک کا تشخص اجاگر نہیں کرتے۔

ڈیم سکوئر..ایمسٹرڈیم کے سینے میں ایک ایسا دل جو دن رات دھڑکتا چلا جاتا ہے دراصل ایک ڈیم فُول سکوئر تھا جہاں نہ تو کوئی سیانا ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی ذی ہوش..جتنے لوگ بھی وہاں ہجوم کرتے ہیں زندگی کی تمام تر بے وقوفیوں میں مبتلا نیم مدہوش ہوتے ہیں کہ یہ ایک کھلنڈرا اور اپنی عاقبت سے لاپرواسکوئر ہے..میمونہ بیگم نے مجھے ترک کیا اور ایک ایسے شاپنگ سٹور کے اندر چلی گئی جو امریکہ میں بھی اُس کا پسندیدہ رہا تھا..میں اس دوران سکوئر کے ایک پتھریلے بنچ پر بغلوں میں ہاتھ دیئے کہ سردی بڑھتی جاتی تھی اُن کبوتروں کو دیکھنے لگا جو سیاحوں کے ڈالے ہوئے دانوں کو چُگتے اتنے فربہ ہو چکے تھے کہ موٹے سومو پہلوانوں کی مانند بمشکل کندھے مارتے چلتے تھے..میرے برابر میں تین ڈچ نوجوان آ بیٹھے جن میں سے کم از کم ایک مسلمان شکل کا کوئی مراکشی وغیرہ تھا۔اُن میں سے ایک نے جین کی جیب میں سے کُچھ مڑے تڑے سگریٹ برآمد کیے اور پھر وہ تینوں اُنہیں سلگا کر دم مارو دم لگانے لگے..اور وہ جو کیف آور دھواں میرے نتھنوں میں سرائت کرتا تھا تو مجھے یوں لگا جیسے میں پاکستان میں کسی صُوفی بزرگ کے مزار شریف پر حاضری دے رہا ہوں..ایمسٹرڈیم کے ڈیم سکوئر میں لال شہباز قلندر اور شاہ حسین رقص کرتے تھے..وہ تینوں چرس بھرے سگرٹوں کے سُوٹے لگاتے دنیا کی بے ثباتی پر غور کرتے کرتے اُس بنچ پر سے گرنے لگتے اور پھر سنبھل جاتے۔

میمونہ اُس سٹور میں سے برآمد ہوئی تو سکندر کی مانند خالی ہاتھ تھی...دفع کرو ہالینڈ کو..امریکہ میں اس سے کہیں بہتر اور ارزاں شاپنگ ہوتی ہے۔

ہم ایک مرتبہ پھر گاہے بگاہے چلنے لگے اور تب ہمیں ہیرا منڈی دکھائی دے گئی۔مُجھے نہیں

میں تازہ ہرے بھرے کھیرے بھر گئے..دراصل صاحبِ کرامت بزرگ ذرا اونچا سنتے تھے..ہمارے ساتھ بھی یہی سانحہ ہو گیا تھا..ہیرے نہیں کھیرے ہو گئے تھے..بہرطور یہ مایوسی عارضی تھی کہ ایمسٹرڈیم ایک ایسا شہر ہے جہاں تادیر ناخوش نہیں رہا جا سکتا....ہم اُس بجھتی دوپہر میں ایک نہر کے کنارے چلتے اور گاہے بگاہے چلتے جا رہے تھے جب سرد ہوا کا ایک جھونکا آیا اور اُس کے ساتھ ہی درختوں کے پتّے ایک پل کے لیے زرد آنسوؤں کی مانند ہم پر برسے اور پتھریلے فٹ پاتھ پر بچھتے چلے گئے...نومبر کے آخری دنوں کی ہواؤں میں برفباری سے پیشتر کی ایک سکوت بھری اداس خنکی تھی..ایک کبڑے پُل پر ایک صدرنگ گُل وگلزار کھلا تھا..ایک اوپن ایئر فلاور شاپ سجی تھی اور وہاں کیسے کیسے سحر انگیز بناوٹوں والے سجیلے پھول اور پودے سجے تھے..ہم ایک ''چیز شاپ'' میں داخل ہو گئے کہ اُس کے شوکیس میں سورنگ اور سواقسام کے چیز نمائش پر تھے...جی ہاں وہی چیز..کہ ایک پرواز کے دوران جب ایئر ہوسٹس نے ایک سردار صاحب کی خدمت میں کُچھ پنیر پیش کیا تو وہ بولے ''یہ کیا ہے؟'' ایئر ہوسٹس نے بصد ادب عرض کیا کہ یہ چیز ہے..سردار صاحب خفا ہو کر کہنے لگے، یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ یہ ایک چیز ہے پر چیز ہے کیا..اس چیز شاپ میں پنیر کی اَن گنت اقسام کی تیز اور کٹیلی مہک ٹھہری ہوئی تھی..

گورنمنٹ کالج لاہور کی ''کشن گنگا مُہم'' میں شامل میں ایک ایسا ٹین ایج کوہ پیما تھا جو سرد اور برفیلی راتوں میں اٹھ اٹھ کر روتا تھا اور امّی کو یاد کرتا تھا کہ آخر میں نے اس مُہم میں شامل ہونے کی حماقت کیوں کی..رتّی گلی کی چوٹی سر کرنے سے پیشتر ہم نے ایک گلیشیئر پر ایستادہ پتھریلے جھونپڑے میں رات گزاری..ایک تو سردی کی ناقابل برداشت شدت..پھر دن بھر کی کوہ پیمائی نے بدن کے ہر پٹھے کو اکڑا کر پتھر کر دیا تھا اور پھر..جھونپڑے کے کچے فرش پر پنیر بچھا ہوا تھا..اور میرا سلیپنگ بیگ اُس پر بچھا ہوا تھا اور اُس کی ناگوار بُو نے مجھے رات بھر سونے نہ دیا..وہ بُو میرے تن بدن میں یُوں رچ گئی کہ لاہور واپسی پر جب صفدر میر ہمیں ''ہیملٹ'' پڑھا رہے ہوتے تو مجھے شک ہوتا کہ وہ کسی بھی لمحے میرے قریب آ کر مجھے سونگھنے لگیں گے اور کہیں گے..دیئر از سَم تھنگ راٹن اِن دے سٹیٹ آف ڈنمارک..اُنہیں بھی اُس پنیر کی بُو آ جائے گی..قابل فہم طور پر میں ایک مدت پنیر سے گریزاں رہا..یہاں تک کہ کوئی تصویر اُتر واتے ہوئے جب صاحبِ کیمرہ مجھے مسکرانے پر اُکسانے کے لیے کہتا کہ..چیز..اگر آپ چیز کہیں گے تو اس لفظ کی ادائیگی پر آپ کے دانت ظاہر ہو جائیں گے تو بھی مجھے ابکائی آ جاتی..پھر وقت گزرنے سے..رتّی گلی کے دامن میں واقع جھونپڑے کے بدبودار پنیر کی مہک زائل

اُس ہیرا منڈی میں داخل ہونے کے لیے ہمیں متعدد حفاظتی دروازوں میں سے گزرنا پڑا.. شوروم کے اندر سیاہ سُوٹوں میں ملبوس جیسے وہ ابھی ابھی کسی کو دفن کر کے آئے ہوں.. کُچھ بُت بنے کھڑے تھے.. ہمیں دیکھ کر اُن ساکت مجسّموں میں کچھ زندگی نمودار ہوئی.. اُن میں سے ایک متحرک ہو کر ہماری جانب چلا آیا ''میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

''ہم تو صرف.. یونہی.. کُچھ ہیرے وغیرہ دیکھنے کی خاطر.. یونہی۔''

''کس نوعیت کے اور حجم کے ہیرے'' اس دوران اُس کی مسکراہٹ سمٹ چکی تھی.. وہ اپنے برسوں کے تجربے کی روشنی میں جان چکا تھا کہ ان تلوں میں اتنا تیل نہیں ہے کہ یہ ایک ہیرا خرید لیں... ان کے لباس اور شکلوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ محض تجسس کی خاطر اِدھر آ نکلے ہیں۔

''کس نوعیت کے اور حجم کے ہیرے میڈم۔'' اُس نے پھر دہرایا۔

میمونہ اُس سے لاپروا ہو کر شوکیسوں میں قید ہیروں سے مزین زیورات اور گھڑیاں وغیرہ دیکھنے لگی۔

اور ان شوکیسوں میں زیورات اور گھڑیاں بلکہ انگوٹھیاں، چوڑیاں اور گلوبند وغیرہ اور سب کے سب ہیروں سے مزّین دمکتے تھے۔ میمونہ کو ایک ایسی انگوٹھی پسند آ گئی جس میں کبوتر کے انڈے جتنا تو نہیں دال کے دانے کے برابر ایک ہیرا جڑا تھا اور اس کی قیمت بہت مناسب تھی یعنی پاکستانی روپوں میں تقریباً گیارہ لاکھ..

یہ دال کے دانے جتنے ہیرے کی قیمت تھی..

اور کبوتر کے انڈے جتنے ہیرے کی قیمت...

ہم نے ڈھیٹ بن کر لیکن نہایت سنجیدگی سے شوکیسوں میں تانک جھانک کر کے چپکے سے وہ کان لپیٹے جو ہم نے اونی ٹوپیوں میں پوشیدہ کر رکھے تھے اور ٹھنڈے ٹھار اس ہیرا منڈی سے باہر آ گئے۔

ہماری جھولی میں ہیرے نہ تھے کھیرے تھے..

شنید ہے کہ ایک صاحبِ کرامت بزرگ کہیں پائے جاتے تھے جو ہر سوالی کی ایک خواہش پوری کرنے پر قادر تھے.. کوئی ہم جیسا مُرید اُن کے چرنوں میں حاضر ہوا اور سرگوشی کی کہ بابا جی... ہیرے.. بابا جی کرامت والے نے کہا، بچّہ جھولی پھیلا ہم بھر دیں گے.. بچّے نے جھولی پھیلائی تو اُس

جس میں بھنگ کے بُوٹے ہرے ہرے نمائش پر ہوتے..اوران کے ہمراہ ہدایات درج ہوتیں کہ.. آپ ہمارے ہاں سے دنیا کی بہترین بھنگ کے پودوں کی پنیری حاصل کر کے اپنے پائیں باغ میں کاشت کر کے بھنگ میں خودکفیل ہو سکتے ہیں۔ اگر آپ گانجا یا چنڈو کے شوقین ہیں تو ہمارے ہاں بہترین حقّے بھی مل سکتے ہیں...

میمونہ نے نوٹ کیا کہ اگر ''کیفے'' کا لفظ ''سی'' سے شروع ہوتا ہے تو وہ ایک معمول کا کیفے ہے اور اگر یہ ''کے'' سے شروع ہوتا ہے تو پھر وہ ایک دم مار دم چرسی کیفے ہے...ہم ان مقاماتِ چرس وفغاں کے قریب سے گزرتے ہوئے اپنا سانس روک لیتے کہ جیسے غالب کی ہوا میں شراب کی ہے تاثیر..تو ایسے ادھر بھی ہوا میں ہے چرس کے دھویں کی تاثیر..

ہم لوگ..یہی مشرق والے اپنے رواجوں اور اخلاقی پیمانوں میں یُوں مقید ہوتے ہیں کہ ہمیں ہر جانب سوائے گناہ اور ثواب کے اور کُچھ نظر نہیں آتا۔ اوراس کے باوجود ہم تصوف کا لبادہ اوڑھے ایک مدت سے بھنگ اور چرس سے لطف اندوز ہوتے رہے ہیں۔ اولیاء کرام کے ایک قدیم شہر میں نہایت رجعت پسند گھرانوں میں بھی صبح سویرے بھنگ کے بوٹوں سے کشید کیا جانے والا پانی بھر کر رکھا جاتا تھا تا کہ گرم دوپہروں میں وہ کُچھ ٹھنڈک عطا کر سکے..اور چرس..جیسے چمبیلی ہمارا قومی پُھول ہے..مارخور ہمارا قومی جانور ہے، ایسے ہی یہ بھی ہمارا قومی نشہ ہے..کیا آپ شاہ حسین، بھٹائی یا بلھے شاہ کے عُرس کے موقع پر چرس کے دھویں کے بغیر دھمال ڈال سکتے ہیں، ڈھول بجا سکتے ہیں..

یورپی خصلت بے حد پریکٹیکل ہے۔ ہالینڈ نے سب سے پہلے ہم جنس شادیوں کی اجازت دی کہ لوگ اس اجازت کے بغیر بھی ہم جنسی کے مرتکب ہو رہے ہیں تو انہیں قانونی تحفظ دینے میں کیا حرج ہے..اور اگر عوام الناس ہدایت پانے والوں میں سے نہیں ہیں انہوں نے ہر صورت میں نشہ بازی اختیار کرنی ہے تو ان لوگوں کو گرفتار کر کے جیلوں میں بھیجنے سے فائدہ..اُنہیں باز رکھنے کے لیے سرکاری خزانے میں جو چھید ہو جاتے ہیں تو کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے کیونکہ یہ تو باز آنے والوں میں سے نہیں ہیں..

دوپہر ڈھل رہی تھی..

ہمیں بہر طور شام سے پہلے پہلے بیگ واپس جانا تھا جہاں فردوسی صاحب کے ہاں ہمارے لیے ایک دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ چنانچہ میں نے میمونہ سے گزارش کی..جو ہر سُپر سٹور میں مٹرگشت

ہوگئی اور میں پنیر کا شیدائی ہوگیا.. پنیر کا آملیٹ.. پالک پنیر.. کوفتہ پنیر اور پھر ہر شے میں پنیر.. یہاں تک کہ آلو قیمے پر بھی پنیر سفوف کا چھڑکاؤ.. جو کوئی بھی یورپ کی جانب نکلتا میں اُس سے فرمائش کرتا کہ پلیز پنیر.. اُنہی دنوں میرا دوست نوازش علی اپنے نثار آرٹ پریس کے لیے جدید ترین پرنٹنگ مشینیں خریدنے کے لیے ہالینڈ گیا... واپسی پر اُس نے ہم دونوں کو رات کے کھانے پر مدعو کیا.. ہم ابھی ڈرائنگ رُوم میں کھانے سے پیشتر کی گپ شپ لگا رہے تھے کہ مجھے ایک تیز اور کٹیلی سی مہک آئی تو میں نے نوازش سے کہا ''کوئی بُو ہے'' تو وہ شرمندہ سا ہو کر کہنے لگا ''یار چودھری ہالینڈ میں پرنٹنگ مشینوں کے جو مینوفیکچرر ہیں اُنہوں نے تحفے کے طور پر مجھے وہاں کے کسی مشہور پنیر کے دو کیک پیش کیے تھے.. یہ اُن کی بُو ہے.. تمہاری بھابھی خورشید سارا دن ناک پر دوپٹہ جمائے ابکائیاں لیتی پھرتی ہے اور کہتی ہے کہ انہیں کسی ڈسٹ بن میں پھینکو، دفع کرو، میں یہ بدبو برداشت نہیں کر سکتی۔''

تب میں نے نوازش سے درخواست کی کہ وہ چیز کے تو دے مجھے عنایت کر دو۔ میں گلبرگ کے راستے میں جو سب سے پہلا کوڑا دان نظر آئے گا اُس میں پھینک دوں گا.. چنانچہ اگلا پورا برس میں نے پنیر کی جنت میں گزارا اور اُس کے زرد کٹیلے ذائقے سے لطف اندوزہ ہوتا رہا.. میں نے ایمسٹرڈیم کی اس ''چیز شاپ'' سے دل پر جبر کر کے کچھ شاپنگ نہ کی کہ یہاں پنیر کی جتنی بھی اقسام دل پذیر تھیں ان میں سے بیشتر لاہور میں میرے فریزر میں ٹھنڈی ہو رہی تھیں.. ماڈل ٹاؤن پارک کی سیر کا ایک ساتھی فرزند علی نام کا ہے جو ابوظہابی میں تیل کے کنوؤں کی کھدائی کرتا ہے اور وہ پنیر سے میری رغبت سے آگاہ ہے۔ چنانچہ وہ میرے لیے دنیا جہان کے پنیر مہیا کرتا رہتا ہے.. تو مجھے اس ''چیز شاپ'' سے پنیر خریدنے سے اجتناب کرنا پڑا..

کچھ ایسی ہی صورت حال تب درپیش ہوئی جب میں نے کہیں سے کچھ سگرٹ خریدنا چاہے اور وہاں بھی اجتناب کرنا پڑا کہ.. وہاں ایمسٹرڈیم کے کوچہ و بازار میں کہیں بھی سادہ سگرٹ میسر نہ تھے.. سب کے سب سگرٹ بھرے ہوئے تھے، لوڈڈ تھے.. چرسیلے اور بھنگی سگرٹ..

نصف صدی پیشتر کا ہالینڈ اپنے رنگ رُوپ اور تعمیراتی شکل میں آج بھی جُوں کا تُوں تھا صرف اس فرق کے ساتھ کہ اب یہاں ٹیولپ کے پھولوں کے علاوہ بھنگ کے پودوں اور چرس کے دھویں کی بہار بھی آئی ہوئی تھی کہ یہ معصوم اور صُوفی نشے ہالینڈ میں قابل تعزیر نہ رہے تھے۔ انہیں قانونی طور پر حلال قرار دے دیا گیا تھا.. ہر دو چار دکانوں کے بعد کوئی ایک شوکیس نظروں کے سامنے آجاتا

چھوڑ کر پادری بننے کا ارادہ کرلیا۔ یہ دور عارضی ثابت ہوا۔ پیرس میں قیام کے دوران میں اُسے اس وقت کے غیر معروف مصوروں ڈیگاس، مانے، مونے، سیزان، سیورت اور گوگین سے ملنے کا اتفاق ہوا جو مصوری کی سابقہ روایات سے بغاوت کر کے اپنی تصویروں کو شوخ و شنگ رنگوں سے سیراب کر رہے تھے۔ ان دنوں گہرے اور سیاہی مائل رنگ استعمال کیے جاتے تھے۔ تیز رنگ لگانے والے مصوّر نقادوں کی نظر میں صرف کھلنڈرے بچوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کھلنڈرے بچوں نے جن میں فان گوگ بھی شامل تھا، مصوری کی ایک نئی طرز اثر پرستی (Impressionism) کی بنیاد رکھی جس میں تصویر کے مجموعی تأثر پر زور دیا جاتا تھا۔ فان گوگ کی مصوری کا سنہری دور جنوبی فرانس کے قصبے آرلز میں شروع ہوا۔ وہ ہر صبح خالی کینوس اور رنگ لے کر باہر نکل جاتا اور آرلز کے چمکتے سورج کے تلے مکّی اور جَو کے لہلہاتے کھیتوں، سرو کے درختوں اور ٹیڑھی پگڈنڈیوں کی نقاشی کرتا۔ وہ کسانوں سے کہتا ''جیسے تم کنواری زمین میں ہل جوت کر خوراک پیدا کرتے ہو اسی طرح میں بھی اپنے خالی کینوس پر برش کا ہل چلا کر رنگوں کی فصلیں اُگاتا ہوں۔'' اس کی تصویریں گرمیوں کی تپتی ہوئی دوپہروں کے سورج کی دیوانگی سے بھرپور تھیں اور اسی سورج نے اسے سچ مچ دیوانہ کر دیا۔ جب ریشل نامی ایک طوائف نے تفریحاً اس کے کان کا تحفہ مانگا تو محبت کے بھوکے اور دیوانے فان گوگ نے اسی وقت استرے سے اپنا کان کاٹا اور یہ کہہ کر اپنی محبوبہ کے حوالے کر دیا ''دیوانگی میں بھی مسرت ہے جسے صرف دیوانے ہی جان سکتے ہیں۔''

اس کا بڑا بھائی لیو جو پیرس میں ایک تصویریں فروخت کرنے والی دکان پر ملازم تھا، اپنے بھائی کی یہ حالت نہ دیکھ سکا اور اسے سینٹ ریمے کے پاگل خانے میں داخل کروا دیا۔ فان گوگ پاگل خانے میں بھی مصوری کرتا رہا۔ میونسپل میوزیم کے متعدد کمروں میں فان گوگ کے پیرس، آرلز اور سینٹ ریمے دور کی کئی تصاویر رکھی ہیں۔ ان میں ایک حسّاس مصور کی آہستہ اور تکلیف دہ نشوونما کی پرچھائیاں ہیں۔ تخلیقی جدوجہد کی آگ کو جلائے رکھنے کی کوشش، پھر اظہار کی پختگی کی طرف ایک قدم، پیرس کا تغیر، آرلز کا جذباتی دھماکہ اور آخر میں سینٹ ریمے کا دردناک انجام جو اُس کی ایک تصویر میں ایک اندھی پگڈنڈی کی صورت میں دکھایا گیا ہے۔

یکا یک فان گوگ کو احساس ہوا کہ اس کے اندر تخلیق کی جو آگ بھڑک رہی تھی وہ سرد ہو رہی ہے۔ وہ پہروں ہاتھ میں برش تھامے خالی کینوس کو گھورتا رہتا مگر ایک ہلکا سا خط بھی نہ لگا پاتا۔ ایک تپتی دوپہر کو جلتے سورج کے نیچے اپنے پیارے سرو کے درختوں اور سنہری کھیتوں کے درمیان فان گوگ نے

کرتی ہمارے پوتے یا شار کے لیے سپائڈر مین کے بُوٹ تلاش کرتی، مشال کے لیے کوئی سویٹر ڈھونڈتی مُجھ سے بے خبر متلاشی پھرتی تھی کہ بیگم وقت کم ہے، ابھی ہم نے فان خوخ میوزیم بھی جانا ہے..میں تو کب کا دیکھ چکا لیکن میں تمہیں اُس کی وہ تصویریں دکھانا چاہتا ہوں جن کے رنگ اتنے تازہ ہیں کہ وہ گیلے لگتے ہیں..اگر تم نے فان خوخ کا ایک سورج مکھی کا پھول..ایک ستارہ یا ایک سرو کا درخت نہیں دیکھا تو اس زندگی میں کیا دیکھا..

میمونہ کے چہرے پر ایک عجیب مسکراہٹ آئی ''آج سے پچاس برس پیشتر جب تم نے فان خوخ کے میوزیم کی دیواروں پر آویزاں اُس کے شاہکار دیکھے تھے تو کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ تصویریں بدل گئی ہیں..میں تم پر اعتبار کرتی ہوں کہ وہ تصویریں کسی بھی جذباتی شخص کی زندگی کا حاصل ہیں..لیکن اُنہیں دوبارہ کیا دیکھنا کہ وہ تو وہی ہیں جو کہ وہ تھیں..جیسے کسی مبلغ نے ایک میراثی کو گھیر کر کہا تھا کہ..کلمہ سناؤ..اور اُس نے ہراساں ہو کر کہا تھا کہ..کیا بدل گیا ہے تو فان خوخ کی تصویریں بدل تو نہیں گئیں..اور ہمیں ہیگ پہنچنا ہے..آؤ سنٹرل سٹیشن کی جانب..گاہے بگاہے چلتے ہیں..''

''مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں تیز رنگوں کے ایک جنگل میں آ نکلا ہوں۔ رنگوں کی بوچھاڑ سے میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ سرو کے گہرے سبز درختوں نے میرا گھیراؤ کر لیا۔ میں جَو اور مکّی کے روپہلی کھیتوں کی باس سونگھ رہا تھا۔ میرے چاروں طرف سورج مکھی کے زرد چمکیلے پھول کھل رہے تھے۔ سامنے سورج ایک آتشیں سیال گولے کی مانند نیلگوں آسمان کو چھید رہا تھا۔ یہ مشہور مصور ونسنٹ فان گوگ کی تصاویر تھیں۔ میں اس سے پہلے یہ تصاویر مصوری کے رسالوں میں دیکھ چکا تھا مگر میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ اصل اور نقل میں اتنا حیران کن فرق ہوگا۔ فان گوگ کی تصاویر کو اصل روپ میں ہی دیکھ کر اس کی عظمت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

فان گوگ 1853ء میں پیدا ہوا۔ اس کی طبیعت میں شروع سے ہی لاابالی پن اور بے چینی کا عنصر نمایاں تھا۔ اسے مصوری سے جنون کی حد تک عشق تھا اور بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ وہ اپنے عشق میں ان حدوں کو بھی پھلانگ گیا۔ مزدوروں اور کسانوں کی تصاویر بناتے وقت اُسے احساس ہوا کہ تصاویر کو حقیقت سے قریب تر لانے کے لیے ذاتی طور ان تجربوں میں سے گزرنا لازمی ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ بیلجیم جا کر کچھ عرصہ کوئلے کی کانوں میں بطور مزدور کام کرتا رہا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اُس نے مصوری

خواتین کے بارے میں بھی جاپان دیدہ حضرات کا کہنا ہے کہ وہ بھی..مختصر! لیکن اس مختصر پن کا سب سے پُر جمال شاہکار بانسائی ہے..ایک مختصر درخت..جیسے جاپانی چائے کی رسم کے رموز جاننے کے لیے برسوں کی کاوش کرنی پڑتی ہے ایسے کسی درخت کے بیج کے پھوٹنے پر اُس کی جڑیں تراش کر اُس کی شاخیں خراش کر اُس کی بڑھوتی پر قابو پا کر اُسے کاملیت کی حدود میں رکھنا بھی ایک ہزاروں برس قدیم فن ہے..

لمحۂ موجود میں بانسائی کا سب سے پرانا شاہکار ایک ڈھائی سو برس کا برگد کا درخت ہے، مکمل ساخت، پتّوں اور داڑھیوں سمیت اُس کا قد ڈیڑھ فٹ سے زیادہ نہیں..صرف برگد کے ہی نہیں تقریباً ہر درخت کے بانسائی تخلیق کیے جاتے ہیں اور ان میں چیڑ اور پیپل.....بھی شامل ہیں..البتہ پھلدار درختوں کو جب ایک مسلسل کاوش سے مختصر کیا جاتا ہے تو بھی اُن کے پھل مختصر نہیں ہو پاتے وہ اپنا حجم برقرار رکھتے ہیں..

میں ایک مرتبہ کسی ٹیلی ویژن شو کی ریکارڈنگ کے سلسلے میں دبئی گیا تو وہاں کے ایک سپر سٹور کے فلاور سیکشن میں چند بانسائی نمائش پر تھے اور اُن کی قیمت سچ مچ کے نارمل درختوں کی نسبت بھی کچھ زیادہ تھی لیکن میرا دل اٹک گیا اور میں نے اُن میں سے ایک زرکثیر خرچ کر حاصل کیا اور اُسے سینے سے لگائے پاکستان آ گیا..لیکن وہ پنپ نہ سکا..دنوں میں مرجھا گیا، مر گیا..اور اس کے باوجود وہ جتنے روز بھی زندہ اور سرسبز رہا میں اُس کی رفاقت سے ایک جمالیاتی کیف کشید کرتا رہا..

بانسائی سے میری شیفتگی کا سبب شاید ایک ذرّے میں کُل کائنات کو تصوّر کرنے کا جنون ہے..جیسے آپ بہزاد کی کسی مختصر تصویر میں نقش جنگی مناظر اور قدرتی منظروں میں یوں کھو جاتے ہیں کہ گھوڑے، اونٹ اور غزال زندہ ہو کر ہنہنانے، بلبلانے اور چوکڑیاں بھرنے لگ جاتے ہیں..

میرے پاس بخاری صاحب کا عطا کردہ..اور وہ تو بانسائی کے بخار میں مبتلا ایک شخص ہیں، ایک برگد کا مختصر شجر ہے جسے میں کبھی کبھار اپنی سٹڈی ٹیبل پر رکھ کر..اُس پر ٹیبل لیمپ کی روشنی مرکوز کر کے اُس کی مختصر ہیئت اور کاملیت پر غور کرتا ہوں تو اُسے تکتے تکتے میں خود مختصر ہونے لگتا ہوں، اتنا کہ میں اُس کے سائے میں جا بیٹھتا ہوں اور اُس کی شاخوں سے لٹکتی داڑھیاں کسی فقیر کی جٹاؤں کی مانند مجھے گھیرے میں لے لیتی ہیں اور میں اُس مختصر برگد تلے ایک مختصر وجود کے ساتھ دھیان کی آنکھیں بند کر کے گیان کے جہان میں سفر کرتا جاتا ہوں..ایمسٹرڈیم کی اُس فلاور شاپ میں سجے اُس بانسائی درخت کو دیکھ کر جب میری نظریں ٹھہریں، میرے قدم رُکے تو میمونہ جان گئی کہ یہ میرا میاں جیسے کبھی گندھارا کے مجسموں کے سحر میں گرفتار ہوش کھو بیٹھتا ہے..کسی چہرے کو دیکھ کر حواس گم کر لیتا ہے

اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیا۔ اس کے بھائی سمیت جنازے میں صرف سات افراد شریک ہوئے۔ تدفین سے قبل لیو نے اپنے بھائی کی لاش کے گرد اس کی بنائی ہوئی خوبصورت تصاویر سجا دیں۔ کمرے میں رنگوں کا ایک سیلاب امڈ آیا جس کے درمیان فان گوگ کا بے جان جسم پڑا تھا۔ شاید میونسپل میوزیم کے ان کمروں میں وہی تصاویر ہیں جو فان گوگ کی لاش کے گرد سجی تھیں۔ فان گوگ آواز کے قبرستان میں سورج مکھی کے چمکیلے پھولوں کے سائے میں دفن ہے۔ ''نکلے تری تلاش میں''

تو ہم نے مُنہ موڑا، اس شہر کی آبی شریانوں سے، اُن کے کناروں پر غُل کرتے آبی پرندوں اور اُن کے پانیوں میں گرتے زرد آنسو خزاں آلود پتّوں سے.. پنیر کی مہک والے ایک سٹور سے.. بھنگ کے بُوٹوں اور چرسی کیفوں سے اور خاص طور پر ایمسٹرڈیم ڈائمنڈز سے اور یہ مُنہ اور مسور کی دال ہیروں سے اور یہی مُنہ موڑ کر ہم واپس سنٹرل سٹیشن کی مانند رنجیدہ چل دیئے کہ ہم فان خوخ کے لیے بھی کچھ وقت نکال نہ سکے تھے۔

راستے میں ایک رکاوٹ آ گئی..

ایک فلاور شاپ میں جس کے پھول ہی پھول فٹ پاتھ تک آتے تھے اور جن کے رنگ مستعار لیے گئے تھے، فان خوخ کی تصویروں سے وہاں میں نے ایک جاپانی بونسائی مختصر درخت دیکھ لیا.. نیلے رنگ کی ایک مستطیل تھالی میں.. ایک ایسا درخت جسے اگر بڑھنے دیا جاتا اور اُس کی جڑیں اور شاخیں ایک خالص جاپانی تکنیک سے باقاعدگی سے تراشی نہ جاتیں تو وہ مجھ سے قد میں کہیں بڑا ہو چکا ہوتا.. وہ میرے دل میں فان خوخ کی ستاروں بھری رات کی مانند اتر گیا اور مجھے شائبہ ہے کہ جب اُس کے مختصر مگر کامل سراپے پر میری آنکھیں ٹھہریں تو میں بھی اُس کے دل میں اتر گیا.. وہ میرا ہی منتظر تھا..

جاپان بھی ایک مختصر سراپے کا ملک ہے.. ایک مُغل منی ایچر تصویر ہے..

امریکہ۔ روس۔ چین۔ کینیڈا اور ہندوستان وغیرہ وسیع کائناتیں ہیں اور جاپان.. ایک مختصر تصویر ہے.. جیسے چاول کے ایک دانے پر قرآن کی ایک آیت کی خطاطی.. ایک ناخن پر مونالیزا کی مکمل تصویر.. جاپان کی ہر شے اُس کے مختصر وجود کی مانند مختصر ہے.. اگرچہ مختصر لیکن مکمل کاملیت کی حامل.. جاپانی گارڈن میں بھی ہر پتھر حجم میں مختصر لیکن تصور کی آنکھ اُسے ایک چٹان کی صورت دیکھ سکتی ہے.. ہر بُوٹا، تمام جھاڑیاں، درمیان میں بہتے جھرنے اور اُن پر کمان ہوتے پُل سب کے سب مختصر.. یہاں تک کہ وہاں کی

''آئینے میں جو کُچھ دیکھ رہا ہوں''

اکثر محفلوں میں، کسی رات کے کھانے کے بعد یا کسی محفل کے اختتام پر.. کبھی ہیگ، برسلز یا کوپن ہیگن میں، کسی ریڈیو یا ٹیلی ویژن انٹرویو کے دوران لامحالہ یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ آپ نے آج کے پچاس برس پیشتر کے..اور آج کے یورپ میں کیا فرق پایا...

میں نے تو کُچھ فرق نہ پایا کہ میرے وجود کے اندر جو سرزمینیں یادکی آبادتھیں اُن کی شادابی اور ہریاول اور اُن کے دیکھنے سے لہو میں جو اضطراب تلاطم میں آیا کرتا تھا جُوں کا تُوں تھا۔ اگرچہ رگوں میں دوڑتے پھرتے خون کے ہم قائل تو نہیں پر کیا کیجیے کہ اب یہ خون رُک رُک کر گردش میں آتا ہے اور خدشہ رہتا ہے کہ کسی بھی لمحے اس میں کوئی رکاوٹ آجائے گی جس کے نتیجے میں اس خانہ بدوش بنجارے کا سب سامان پڑا رہ جائے گا..

میں نے کُچھ فرق نہ پایا..

جن منظروں کو میں نصف صدی پیشتر دیکھ چکا تھا انہیں دوبارہ دیکھا تو جیسے شدید حبس میں گرم لُو کا ایک جھونکا بے شک رخساروں کو جھلسا دے تو بھی بدن ایک کیف آور انبساط سے بھر جاتا ہے.. چنانچہ دل کی آشفتگی، دیوانگی اور وحشت میں کچھ فرق نہ آیا تھا..وحشت اور دیوانگی وہی تھی جو کبھی تھی.. اور حیرت بھی وہی تھی..فرق آیا تو صرف زمانے اور عُمر میں آیا تھا..نصف صدی کا فرق آیا تھا..

نومبر کے اُن آخری دنوں میں ہیگ میں یخ بڑھتی جاتی تھی، درختوں کی گھناوٹ میں سفید سرد دُھند اُلجھتی پھرتی، ابر آلود آسمان میں سے ایک ایسی ٹھنڈک اترنے لگی جیسے چالیس برس پیشتر تُرکی کے ارض روم میں جہاں میں بے آسرا اور قلاش ایک روز ناشتے کے بغیر اُس کی ویران قدامت میں بھٹکتا پھرتا تھا تب ایسی ہی ٹھنڈک ارض روم کی پتھریلی گلیوں اور لکڑی کے خستہ مکانوں پر اترنے لگی تھی اور میں جان گیا کہ اب چند روز میں ہی برف باری شروع ہو جائے گی.... ہیگ کی ہوا میں جو سرد سناٹا تھا، وہ بھی مجھے خبر

ایسے یہ اب اس بانسائی کے عشق میں مبتلا ہو گیا ہے تو اُس کے قدم بھی رُک گئے..

ہم دونوں ایک مرتبہ پھر گاہے بگاہے چلتے سنٹرل سٹیشن کی جانب چلتے جا رہے تھے اور شام ڈھل رہی تھی اور ہمارے ہاتھوں میں چند شاپنگ بیگ تھے، ایمسٹرڈیم یاترا کی یادگار کچھ سوینئر تھے اور ایک ڈبے میں پیک شدہ ایک بانسائی تھا..

''سوہنا شہر ہے..'' میمونہ نے کہا..

''ہمارے پاس شنگین سٹیٹس کا ایک برس کا ویزہ ہے..ہم دوبارہ آئیں گے..''

''نہیں۔'' میمونہ نے یوں سر ہلایا کہ اُس کی ٹوپی کا پھندنا تادیر جھولتا رہا..

''کیوں نہیں..''

''یہ شہر ایک نقش بر آب ہے..اسے آج کے خواب وخیال میں ہی رہنے دو..دوبارہ آئیں گے تو آج کے دن کے نقش اس کے پانیوں پر نہ ہوں گے..یہ پانیوں کے ساتھ بہہ چکے ہوں گے..سوہنا شہر ہے۔''

♦♦.....♦♦.....♦♦

میری عمر کو پہنچی ہوئی مرغابیاں اس حقیقت سے خوفزدہ بھی اور مجبوراً قبول کرتے ہوئے بھی یہ جان چکی ہوتی ہیں کہ کوئی دن جاتا ہے جب پھڑ پھڑانے کی سکت کم ہوتی چلی جائے گی اور بالآخر یہ پانی منجمد ہو جائیں گے..

میں بھی ایک ایسی ہی عمر رسیدہ مُرغابی تھا..

ویسے ہرگز یہ گمان نہ کیجیے گا کہ میں نے پھڑ پھڑانا اور تگ و دو کرنا ترک کر دیا ہے..بے شک سانس نقارہ کوچ کا باجت ہے دن رین..بے شک اس نقارے کی دھمک اس عمر میں بلند ہوتی چلی جاتی ہے لیکن میں کان نہیں دھرتا، پھڑ پھڑاتا رہتا ہوں..

تو نہ تو دل کی آشفتگی، وحشت اور حیرت میں کُچھ فرق آیا تھا اور نہ ہی اجنبی منظروں اور بستیوں کو دیکھنے کا سحر زائل ہوا تھا..عُمر کے زوال کے سوا میں جُوں کا تُوں اگلے زمانوں کا وہی آوارہ گرد تھا جو قدم قدم پر جنوں اختیار کرتا تھا..درست کہ شباب تھا تو ستارے شکار کرتا تھا اور اُس جنوں خیزی میں اب بھی کُچھ کمی واقع نہ ہوئی تھی اگرچہ ستارے شکار کرنے کے جو دام تھے وہ ڈھیلے پڑ گئے تھے...

خواب میں جو کُچھ دیکھ رہا ہوں اُس کا دکھانا مُشکل ہے
آئینے میں پُھول کھلا ہے ہاتھ لگانا مُشکل ہے

تو میں نے آشفتہ سری، دیوانگی، آوارگی اور خانہ بدوشی کے جتنے بھی خواب دیکھے..اُنہیں اپنے سفرناموں اور ناولوں میں دکھانے کی سعیٔ لاحاصل کرتا ہی رہا..اور وہ پُھول جو وحشت اور سفر کا مذہب، قومیت اور رواجوں سے ماورا..کبھی کسی دشتِ مرگ میں، کبھی بلیک فارسٹ، ایک فیئری میڈو میں، الحمرا کے ایوانوں یا الاسکا کے برف زاروں میں کھلا اُسے دکھانے کی تخلیقی اذیت میں مبتلا رہا پھر دکھا نہ سکا کہ وہ ایک آئینے میں کھلا تھا..

تو نصف صدی کے کل اور آج میں کُچھ فرق نہ تھا..وہ جنوں اور تحیر جو تب تھا، اب بھی ہے..

سوائے آئینے میں دِکھتی شکل کے...جس میں کبھی یونانی دیوتاؤں کے مجسّمے دکھائی دیتے تھے اور اب موہنجوڈارو کے کھنڈروں کی اینٹیں نظر آتی ہیں..

بس یہی فرق ہے تب میں اور اب میں..

♦♦.....♦♦.....♦♦

کرتا تھا کہ آج نہیں تو کل برف گرنے لگے گی..تو ایسے موسموں میں ایک سویر جب سکول جانے والے بچّے اونی سویٹروں اور جیکٹوں میں بکتر بند فٹ پاتھوں پر دھیان سے قدم دھرتے کہ اُن کے پتھروں پر انجماد کی ہلکی تہہ تھی اور میں سویر کی سیر کے لیے ایک نہر کنارے ہولے ہولے چلتا جا رہا تھا اور نہر کے پانی جیسے بہاؤ سے گریزاں ٹھہرے ہوئے لگتے تھے تو میں نے ایک ایسا منظر دیکھا جس نے لمحۂ موجود میں میری زوال پذیر حیات کی ترجمانی کر دی..

نہر کے پانیوں کی سطح پر برف کی ایک باریک شیشہ چادر بچھی ہوئی تھی جس پر کہیں کہیں خزاں رسیدہ پتّے گیلے ہو رہے تھے پر ساکت تھے..ایک مقام پر جہاں نہر کے پانیوں کے کنارے گھنی گھاس اور جھاڑیوں سے اٹے ہوئے تھے، وہاں چار مرغابیاں (حالانکہ چار مرغابیوں کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں) ایک عجیب اضطراب میں مبتلا اپنے پَر پھڑ پھڑاتی تیرتی پھرتی تھیں لیکن صرف ایک مختصر حصّے میں..کہ اُس حصّے کے گرد برف کی چادر قائم تھی اور وہ اُس سے گریز کرتی تھیں..دراصل وہ چار مرغابیاں جان گئی تھیں کہ موسم سرما نے بالآخر اِن پانیوں کو یُوں منجمد کر دینا ہے کہ ہم اس میں تیر نہ سکیں گی، ہمارے بدن ٹھٹھر کر حنوط ہونے کو ہوں گے اور ہمیں یہاں سے کُوچ کر جانا پڑے گا..تو اُس کُوچ کے لمحے کو ہم عارضی طور پر یُوں مؤخر کر سکتی ہیں کہ ہم ان پانیوں میں مسلسل تگ و دو کرتی رہیں، پھڑ پھڑاتی رہیں تا کہ ہمارے بدن اور پروں کی ہلچل سے نہر کے پانیوں کا یہ حصّہ بقیہ پانیوں کی مانند منجمد نہ ہو جائے..اگر ہم نے تغافل برتا..اپنے پھڑ پھڑانے اور مسلسل تیرتے جانے کے عمل سے غفلت برتی تو جن پانیوں میں ہم تیرتی پھرتی ہیں یہ بھی منجمد ہو جائیں گے..مسلسل حرکت ہی ہماری عارضی بقاء کی ضامن ہے..پوری نہر پر برف کی شیشہ گری جمی تھی اور یہ سرد شیشے صرف وہاں وہاں سے تڑختے تھے جہاں اُن چار مرغابیوں کے پَر مسلسل پھڑ پھڑاتے تھے..یوں جانئے کہ وہ انسانی حیات کو نہ کسی فلسفے اور نہ ہی کسی عقیدے کی رُو سے بیان کر رہی تھی بلکہ نہایت سادگی سے ان تھک پھڑ پھڑاہٹ اور اضطراب سے آشکار کر رہی تھیں..کہ اس حیات میں بھی ایک انسان اس حقیقت سے خوفزدہ اور کبھی قبول کرتے ہوئے کہ بالآخر آس پاس کے پانیوں نے منجمد ہو کر مجھے فنا کی تاریکی میں حنوط کر دینا ہے وہ ہاتھ پاؤں چلاتا رہتا ہے، اپنی بقاء کی خاطر پھڑ پھڑاتا رہتا ہے۔اس کاوش میں کہ یہ پانی..یہ دنیا جو میرا عارضی گھر ہے، منجمد نہ ہو جائے..سعی کرتا رہتا ہے کہ میں اُس سرد فنا کو جہاں تک ہو سکے مؤخر کرتا رہوں..جان لیجیے کہ ہم سب وہی مرغابیاں ہیں اگرچہ

بھی وہ تخلیق کرتے ہیں اپنے وطن کی موہوم یادوں کی دُھند میں مبتلا ہو کر کرتے ہیں... ماضی کی یادوں میں گُم تخلیق کرتے ہیں.. اگرچہ ان میں سے بہت سے پاکستان آتے جاتے رہتے ہیں۔ اگرچہ سرسری آتے جاتے رہتے ہیں لیکن وہ یہاں اتنی مُدت قیام نہیں کرتے کہ دوبارہ جڑیں پکڑ سکیں..

اور وہ کُچھ لوگ جن میں تخلیق کی آگ بجھتی نہیں وہ ان حنوط شدہ لوگوں کے جزیروں میں بھٹکتے پھرتے ہیں..

ایک پُرتکلف دعوت کی واپسی کی شب میمونہ نے کہا ''یہاں تو کوئی بھی ہماری بات نہیں سمجھتا..''

تو میں نے اُسے دلاسہ دیا کہ یہ لوگ حنوط ہو چکے.. اگر اُن کی گفتگو بھی حنوط شدہ ہے.. بیس تیس برس پہلے کے زبانوں کی گفتگو ہے تو یہ بے قصور ہیں..

اور اس کے باوجود ہالینڈ اور ڈنمارک میں وہی معمولی لیاقت اور تعلیم کے لوگ پاکستان کے بیشتر سیاست دانوں اور فوجیوں کی نسبت کہیں بڑھ کر پاکستان کے تصور کو درخشاں کر رہے ہیں.. اُن کی جبینوں پر عرقِ انفعال نہیں حق حلال کے رزق کی مشقت کے پسینے ہیں اور پسینے کے ہر قطرے کے دل میں اُن کا اپنا پاکستان جھلملاتا ہے جیسے ایک دُلہن کے ماتھے کا وہ جُھومر جو کیمرے کی تیز سپاٹ لائٹ کی زد میں آتا ہے تو جگمگانے لگتا ہے.. وہاں اُن دیاروں میں ایسے جُھومر بھی دمکتے ہیں..

♦♦.....♦♦.....♦♦

''حنوط شدہ لوگ''

میں جہاں کہیں بھی گیا..امریکہ۔انگلستان یا یورپ میں وہاں مُجھے سب تو نہیں کُچھ حنوط شدہ لوگ ملے..اگرچہ وہ چلتے پھرتے تھے،اعلیٰ مقامات پر فائز تھے،متمول کاروباری تھے.. پر وہ ایک خاص زمانے میں حنوط ہو چکے تھے..

میرا ناقص مشاہدہ ہے..کسی حد تک یقین ہے کہ جب کوئی انسان معاشی یا سیاسی مجبوریوں کے زیر اثر اپنی آبائی سرزمین کو خیر باد کہتا ہے تو وہ نہ صرف اُس سرزمین سے جُدا ہوتا ہے بلکہ اُس کی مٹی میں سے پھوٹنے والی کونپل،اُس کے خس وخاشاک،دریاؤں،شجروں،گُل بُوٹوں،روزمرہ کی گفتگو میں جو تبدیلیاں تغیر پذیر ہوتی ہیں،رسوم رواجوں اور رویّوں میں جو ارتقاء ظہور پذیر ہوتا رہتا ہے،اُن سے بھی منقطع ہو جاتا ہے..

وہ اُن زمانوں میں حنوط ہو چکا ہوتا ہے جب وہ اپنے ملک کی دھرتی سے منقطع ہوتا ہے..

اور اگر وہ معمولی پڑھا لکھا ہو..محدود لیاقت کا ہو تو اُس کی حنوط شدگی میں شدت آ جاتی ہے..

ایک صاحب،عرصہ تیس سال سے یورپ میں مقیم ہیں اور اپنے بال وحید مُراد سٹائل میں سنوارتے ہیں کہ جن دنوں اُنہوں نے پاکستان چھوڑا..وحید مُراد ہی آخری اور دل پسند چاکلیٹ ہیرو تھا..

کسی محفل میں ایک خاتون بنی سنوری بیٹھی ہیں اور اُنہوں نے فلم سٹار زیبا کے سٹائل میں بالوں کا ایک گھونسلا سا بنا رکھا ہے کہ جب اُنہوں نے وطن چھوڑا تب فیشن یہی تھا..

صرف یہی نہیں بلکہ سیاسی نظریات اور نفسیاتی رویئے بھی جُوں کے تُوں حنوط ہیں..

تخلیق کے سارے سرچشمے اپنی زمین سے جُڑے رہنے سے پھوٹتے ہیں اور اپنی مٹی سے من مرضی یا مجبوری سے بچھڑنے والے لوگ تخلیقی طور پر بڑا ادب تصوّر کرنے سے قاصر ہوتے ہیں...اور جو کُچھ

ہوٹل کے کرائے بھی بچ جاتے ہیں، انہیں کسی پاکستانی گھر میں فروکش کر دیا جاتا ہے..سیفی نے پاکستان میں ہی مجھے مطلع کر دیا تھا کہ تارڑ صاحب..تو میں نے اُس چھوٹی سی تلوار کہ سیف کو اگر سیفی کر دیا جائے تو ظاہر ہے یہ ایک نسبتاً مختصر تلوار ہوگی، اُسے بصد ادب گزارش کی تھی کہ میں ذاتی طور پر صرف ہالینڈ آ کر پھر واپس چلے جانے میں ہی خوش ہو جاؤں گا، ویسے اگر آپ مجھے کہیں اور فروخت کرنا چاہتے ہیں تو ارزاں فروخت نہ کیجیے گا..خریدار ذرا صاحبِ ذوق اور با کردار ہو..اپنے اعزاز میں محفلیں برپا کروانے کو میرا بھی جی چاہتا ہے لیکن اس کا فیصلہ آپ نے کرنا ہے کہ کونسی پارٹی میری عزت افزائی اور پذیرائی کے لیے مناسب اور قابل اعتبار ہے..سیفی نے کُھلے دل سے سند یسے بھیجے کہ ایک تو برسلز والے عمران ثاقب اور دوسرے بی بی صدف مرزا ڈنمارک والی..ان دونوں کو میں رکمینڈ کرتا ہوں..کھرے لوگ ہیں..

تو ہم دونوں سیفی کی سفارش پر یونہی مُنہ اٹھا کر ڈنمارک چلے آئے تھے..اور یہاں پچھلے دو روز سے برفباری کی شدت اس ننھی جل پری کے ملک پر اترتی اُسے کپاس کے ایک جوبن پر آئے ہوئے کھیت کی مانند سفید کرتی تھی..

اگرچہ ہم نے اپنے تئیں یورپ کی سردی کو برداشت کرنے کی خاطر مناسب ملبوسات کا بندوبست کر رکھا تھا لیکن ہمیں یقین دلایا گیا تھا کہ ہالینڈ اور دیگر یورپی ممالک میں برفباری کا آغاز کہیں دسمبر کے آخر میں جا کر کرسمس کے آس پاس ہوتا ہے..تو ہم سردی جھیلنے کے لیے تو تیار تھے لیکن برفباری کی اذیت سہنے کے لیے نہ تو ذہنی طور پر اور نہ ہی ملبوساتی طور پر کمربستہ تھے..

ہالینڈ میں وارد ہونے کے دوسرے دن ہی جب سیفی مُجھے ہیگ کے کوچۂ و بازار میں لیے پھرتا تھا اُس نے سردی کے باعث میری کپکپاتی ٹانگوں کی لرزش محسوس کر لی اور کہنے لگا ''تارڑ صاحب آپ کو اس کارڈرائے کی پتلون میں سردی نہیں لگتی؟''

''لگتی ہے..''

''آپ نے پتلون کے نیچے کوئی اونی زیر جامہ نہیں پہن رکھا؟''

''نہیں پہن رکھا..''

''کیوں؟''

''کوپن ہیگن میں.. برف گرتی ہے، ساز بجتے ہیں''

جہاز اپنی بُلندی کم کرتا ایک ایسے عاشق کے دل کی مانند بیٹھتا چلا گیا جو اپنی محبوبہ کا منتظر کیا دیکھتا ہے کہ محبوبہ اُس کے رقیب کے ساتھ چُہلیں کرتی چلی آ رہی ہے.. اور اُس لمحے کوپن ہیگن ایئرپورٹ پر اترنے سے پیشتر جب جہاز نیچے ہوتا جا رہا تھا میں کھڑکی میں سے نظروں کے سامنے ظاہر ہوتے سفید منظر پر یقین نہ کر سکا کہ نیچے سمندر کی بے کراں نیلاہٹوں کے ساحلوں کی جتنی ریت تھی وہ سب سفید تھی.. اور میں نے میمونہ سے مخاطب ہو کر کہا، میں اتنی مدت بعد ڈنمارک میں اترنے کو ہوں کہ مُجھے قطعی طور پر یاد نہ تھا کہ اس کے سمندروں کے کنارے ریت کے ٹیلے اتنے سفید ہیں کہ اُن پر برف کا گمان ہوتا ہے.. اور اُسی لمحے جب میری آنکھوں میں حیرت کی وہ سفید ریت اترتی تھی تب جہاز کے کپتان کی آواز کیبن میں گونجی.. خواتین و حضرات ہم تھوڑی دیر میں کوپن ہیگن ایئرپورٹ پر اترنے والے ہیں جہاں پچھلے دو روز سے شدید برفباری جاری ہے اور زمین پر درجہ حرارت منفی گیارہ سے بھی گر چکا ہے.. ڈنمارک میں خوش آمدید..

تو یہ ریت نہ تھی جو سفید تھی، برف کے انبار تھے جو ساحلوں کو ڈھانپتے تھے.. جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ یورپ یا امریکہ میں جب کبھی کوئی ادیب، شاعر یا ٹیلی ویژن شخصیت کسی تنظیم یا پاکستانیوں کی کسی انجمن کی جانب سے امپورٹ کی جاتی ہے تو اُس کی آمد کی خبر بقول کسے جنگل کی آگ کی مانند پھیل جاتی ہے.. امریکہ کے حوالے سے دوسرے شہروں اور یورپ کے معاملے میں دیگر ملکوں کی ادبی اور ثقافتی تنظیموں کو معاشی طور پر یہ سہولت حاصل ہو جاتی ہے کہ اُس شخص کے پاکستان سے درآمد کرنے کے اخراجات تو وہ ''ماں'' تنظیم برداشت کر چکی ہوتی ہے تو اُس ادیب، شاعر یا ٹیلی ویژن شخصیت کو اپنے ہاں مدعو کرنے میں کُچھ زیادہ خرچہ نہیں اٹھتا.. ایک مقامی ایئرٹکٹ اور ایک دو روز کسی ہوٹل میں قیام کے اخراجات آسانی سے سہے جا سکتے ہیں... بلکہ اکثر اوقات

اُنہوں نے اپنے ہاتھوں میں ایک بُوکے..ایک گل دستہ تھام رکھا ہے جس کے پُھولوں کو وہ سونگھتے خود ہی خوش ہوتے ہماری جانب لپکتے چلتے آتے ہیں اور یہ کوئی زبیر صاحب تھے..میرے چھوٹے بھائی کے ہم نام..میں نے فرض کرلیا کہ یہ جو گل دستہ اُنہوں نے تھام رکھا ہے میرے لیے ہے تو میں نے اُنہیں تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھتے اُسے وصول کرنے کی خاطر اپنا ہاتھ بڑھایا جسے اُنہوں نے یکسر نظر انداز کر دیا، ہمیں خوش آمدید کہہ کر گلدستے کو بدستور سینے سے لگائے رکھا اور پھر اپنا سیل فون کان سے چپکائے، ایئرپورٹ لاؤنج کے طول و عرض میں ٹہلتے ہمیں یکسر فراموش کر کے کبھی سرگوشیوں میں باتیں کرتے اور کبھی یکبار ایک قہقہہ لگاتے ٹہلتے گئے..ہم دو یتیم بچوں کی مانند پلاسٹک کی سخت اور بے آرام نشستوں پر براجمان اُنہیں تکتے رہے..ایک تو اُس گلدستے کے حصول میں ناکامی نے میرا مُوڈ اجاڑ دیا تھا اور پھر ہم تھکے ہوئے بھی تھے اور زبیر صاحب ہماری موجودگی سے سراسر غافل کبھی ہمارے پاس سے گزر جاتے ہیں اور کبھی ایئرپورٹ سے باہر جانے والے دروازے کے شیشے سے ناک لگا کر باہر گرتی برف کا مشاہدہ کرتے ہیں اور پھر قہقہہ لگانے لگتے ہیں..سچی بات ہے ہمیں اس نوعیت کے تغافلانہ استقبال کی عادت نہ تھی..تقریباً نصف گھنٹے کے پہلو بدلتے، دل میں پیچ و تاب کھاتے اکتا دینے والے انتظار کے بعد میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا اور پھر چھلک گیا..میں اپنی نشست سے اٹھا اور اُنہیں جالیا..

''صدف مرزا کہاں ہیں؟'' میں نے درشتگی سے پُوچھا..

اب یہ صدف تھیں جو مرزا تھیں ان کے بارے میں اطلاع تھی کہ وہ حسب توقع شاعرہ تھیں، ایک مدت سے ڈنمارک میں قیام پذیر تھیں، کہیں پڑھتی تھیں یا شاید پڑھاتی تھیں..اپنے بچوں کو بھی پڑھاتی تھیں، خود نہیں چند اعلیٰ تعلیمی اداروں میں پڑھاتی تھیں اور اردو ادب گھول کر پی رکھا تھا..اُنہوں نے پاکستان میں مجھے متعدد بار فون کر کے اپنی اُلفت کا اظہار کیا، چشم براہ وغیرہ ہونے کا تذکرہ کیا اور خصوصی طور پر فرمائش کی کہ آتے ہوئے میرے لیے اپنا نیا ناول ''خس و خاشاک زمانے'' ضرور لیتے آیئے گا..اور یہ ناول میں دل پر پتھر رکھ کر لے آیا تھا کہ ضخامت کے باعث یہ اتنا مہنگا تھا کہ میں خود بھی اسے خریدنا افورڈ نہ کرسکتا تھا..

چنانچہ زبیر صاحب کی توجہ بمشکل حاصل کر کے جب میں نے پُوچھا کہ صدف مرزا کہاں ہیں تو وہ اُس گلدستے کو بدستور سینے سے لگائے کہنے لگے، تارڑ صاحب آپ کو خوش آمدید

''اس لیے کہ مُجھے الجھن ہوتی ہے..میں اپنی جلد کی قربت میں کوئی نسوانی لمس بھی برداشت نہیں کرسکتا تو اونی زیر جامہ کیسے پہن سکتا ہوں..''

''نہیں پہنیں گے تو اس سردی میں ہیگ کی گلیوں میں یونہی کپکپاتی ٹانگوں کے ساتھ ڈسکو ڈانسر بنے پھریں گے..میں لادوں گا۔''

سیفی نے فوری طور پر مجھے دو عدد اونی زیر جامہ..ایک سیاہ اور ایک سفید مہیا کر دیئے..وہ جو سیاہ زیر جامہ تھا ایک چُست پاجامہ تھا اُسے کھینچ کھانچ کر جب پتلون کے نیچے زیب تن کیا تو ایک عجیب سی سنسنی محسوس کی اور میں سارا دن کُچھ نسوانی سا محسوس کرتا رہا..تحقیق پر کُھلا کہ دونوں اُونی پاجامے لیڈیز کے تھے یہاں تکہ اُن کے پائنچوں پر نہایت جنسی قسم کی سیاہ جھالریں بھی جھلکتی تھیں..میں نے سوچا کہ مُجھ میں عُمر کے زوال کے باعث ویسے بھی مردانگی کے آثار قدرے مدھم ہو چلے ہیں تو یہ پاجامے پہننے سے..وہ مدھم سی عزت سادات بھی گئی..ایسا نہ ہو کہ اُس واجبی سی مردانگی کے کافور ہونے پر ان زنانہ پاجاموں کے زیر اثر ہم ذرا مٹک مٹک کے تالیاں بجانے لگیں..چنانچہ سردی منظور لیکن یہ پاجامے پہن کر ہیجڑا ہو جانا قطعی طور پر نامنظور..

اور میں صرف ایک کارڈرائے کی ٹھنڈی پتلون میں ہوں اور جہاز کا کپتان ہمیں مژدہ سناتا ہے کہ کوپن ہیگن میں پچھلے دو روز سے برفباری ہو رہی ہے اور درجہ حرارت منفی گیارہ سے بھی گر چکا ہے..

کوپن ہیگن کا ایئرپورٹ دنیا کے دیگر بڑے اور مصروف ایئرپورٹوں کی مانند شیطان کی آنت کی مانند طویل اور بے انت تھا..بلکہ مُجھے کہہ لینے دیجیے کہ کسی بھی شیطان کی آنت اتنی لمبی نہیں ہو سکتی۔ان ایئرپورٹوں پر انسان جب اترتا ہے تو اُس کے سامنے ایک طویل مسافت ہوتی ہے...اور جب وہ اپنی پرواز پکڑنے کے لیے آتا ہے تو اُس کے جوگر چل چل کر گھس جاتے ہیں اور تب بھی وہ ٹرمینل نہیں آتا جہاں سے اُس کی فلائٹ نے اڑنا ہوتا ہے..

کوپن ہیگن ایئرپورٹ پر اترے ہیں تو پھر چلتے ہی گئے ہیں..اس سے اچھا تھا کہ ہم ایمسٹرڈیم سے یہاں تک پیدل ہی چلے آتے..ہم اپنا مختصر سامان دھکیلتے جب بالآخر لاؤنج میں آ نکلے ہیں اور ہماری آنکھیں متلاشی ہیں کہ کہاں ہے وہ صدف اور مرزا بھی جس کے ہم مہمان ہیں تو ایک صاحب مسافروں کے منتظر ہجوم میں سے الگ ہو کر ہماری جانب لپکتے ہوئے آتے ہیں اور

''ہاں وہ صدف..'' زبیر صاحب کا چہرہ مسلسل ایک مسکراہٹ سے سجا رہا ''اُسے تو میگرین کا اٹیک ہو گیا ہے اور وہ سر باندھے اوندھی پڑی ہے..''

تب میں نے لاچار ہو کر گزارش کی کہ قبلہ زبیر صاحب ہم دونوں قدرے عمر رسیدہ ہو چکے ہیں اور تھکاوٹ سے ڈھیر ہونے کو ہیں تو پلیز چلیں.. زبیر صاحب پھر سے سیل فون سے جُڑ گئے کہ چلیے اور کسی کا انتظار نہیں کرتے لیکن چوہدری صاحب ٹرین میں سوار ہو چکے ہیں، وہ آ جائیں تو چل دیں گے..

اب میمونہ کا پارہ چڑھ گیا اور جب میمونہ کا پارہ چڑھتا ہے تو وہ صد پارہ جھیل ہو جاتا ہے.. ہمارے پاس واپسی کے ٹکٹ موجود ہیں، کاؤنٹر سے پتہ کرو کہ ایمسٹرڈیم کے لیے اگلی پرواز کب روانہ ہو رہی ہے.. واپس چلتے ہیں..

چنانچہ میں نے یہ واپسی کا منصوبہ زبیر صاحب کے گوش گزار کر دیا کہ اگر ہمیں کہیں لے جانا ہے تو لے جائیں ورنہ خوش رہو اہلِ ڈنمارک ہم تو واپسی کا سفر کرتے ہیں..

زبیر صاحب اس اطلاع سے بھی قطعی طور پر ہراساں نہ ہوئے اور قہقہہ لگا کر بولے ''تو پھر چلتے ہیں۔''

میں نے پوچھا ''کہاں؟''

تو نہایت خوشگوار لہجے میں بولے ''لو جی چوہدری صاحب نے اپنے گھر میں خاص طور پر آپ کے لیے ایک نیا قالین ڈلوایا ہے.. وہاں..''

میں نے پھر بصد ادب گزارش کی کہ حضور میں کسی ذاتی رہائش گاہ میں قیام کرنا مناسب نہیں سمجھتا.. وہ بی بی جو لمحۂ موجود میں میگرین کی اذیت میں مبتلا بقول آپ کے سر باندھے اوندھی پڑی ہے، اُس نے مجھے کسی ہوٹل میں قیام کا سندیسہ دیا تھا..

ایئرپورٹ کے باہر ماسکو کی سفید راتوں ایسا ایک سفید دن تھا.. ہر شے، شجر.. گھر.. شاہراہ پر رینگتی کاریں، عمارتیں، پٹرول پمپ سب کے سب برف کی سفید بُکل میں روپوش ٹھٹھرتے تھے.. اپنی شناخت برف کی سفیدی میں گُم کر چکے تھے.. اور برف تھی کہ گرتی چلی جاتی تھی.. مجھے گمان ہے کہ اگر اُس گدلے آسمان تلے کچھ پرندے اڑان میں تھے تو وہ بھی سب کے سب برف کے پرندے تھے..

کہنے کے لیے بہت سے لوگ ایئرپورٹ آ رہے تھے لیکن برفباری کی شدت اتنی ہے کہ فلاں صاحب کی کار فلاں شاہراہ پر برف میں پھنس چکی ہے، ابھی اُنہی سے بات ہو رہی تھی.. وہ کہہ رہے ہیں کہ میں نے ایمرجنسی والوں کو فون کر کے کرین منگایا ہے.. جونہی وہ کرین آتا ہے اور میری کار کو برف میں سے نکالتا ہے اور وہ سٹارٹ ہو جاتی ہے تو میں سیدھا ایئرپورٹ کے لیے روانہ ہو جاؤں گا..

''لیکن..صدف مرزا..''

''اب میں کیا عرض کروں۔ آپ کے ایک اور مداح کشاں کشاں چلے آ رہے تھے لیکن راستے میں جو طویل پُل تھا وہ برفباری کے باعث ٹریفک کے لیے بند کر دیا گیا ہے..ابھی اُن سے رابطہ ہوا ہے اُن کا کہنا ہے کہ تارڑ صاحب کو کہیں جانے نہ دیں، میں کسی نہ کسی طرح ایئرپورٹ پہنچ کر اُن کا استقبال ضرور کروں گا۔ وہ تو ہمارے ملک کا سرمایہ ہیں..''

اور یہاں ایک مرتبہ پھر مجھے وہ قصہ یاد آ گیا جب میں نے کے ٹو کے دامن سے سکردو میں تعینات ایک اعلیٰ فوجی افسر سے درخواست کی تھی کہ جناب عالی آپ کے ہیلی کاپٹر ادھر آتے جاتے رہتے ہیں تو کسی جاتے ہوئے ہیلی کاپٹر سے کہیے کہ مجھے بھی یہاں سے اٹھا لے اور سکردو پہنچا دے تو اُنہوں نے کمال محبت سے کہا تھا کہ کیوں نہیں تارڑ صاحب، آپ تو ہمارے ملک کا سرمایہ ہیں۔ تو میں نے کہا تھا کہ جناب اگر ہیلی کاپٹر نہ آیا تو یہ سرمایہ منجمد ہو جائے گا.. کہ میں اُس لمحے دنیا کے عظیم ترین برفانی تودوں میں بیٹھا ٹھٹھرتا تھا.. یہاں ڈنمارک میں بھی برفباری ہو رہی تھی اور اس سرمائے کے منجمد ہونے کے قوی امکان تھے..

''زبیر صاحب..وہ صدف بی بی..'' زبیر صاحب اس دوران پھر سے سیل فون کے ساتھ شُغل فرمانے لگے تھے..بمشکل متوجہ ہوئے اور کہنے لگے ''اوہو..سرور چوہدری صاحب کی کار نے تو گیرج میں ہی سٹارٹ ہونے سے انکار کر دیا ہے اور اب وہ بے چارے صرف آپ کا استقبال کرنے کی خاطر ٹرین پر آ رہے ہیں..بڑے شاندار شخص ہیں....وہ آ جائیں تو پھر چلتے ہیں..''

میرا خونی انتشار یا خلفشار جو بھی تھا، وہ ابلنے لگا اور میں اپنے غصے کو قابو رکھنے کی کوشش میں تقریباً آبدیدہ ہو گیا کہ..وہ..صدف..

اور جب ہم ''ہوٹل سکینڈک'' کے ایک مختصر اگرچہ جامع کمرے کی ہر سہولت سے آراستہ کمرے میں پہنچے تو ساری تھکن اور بوریت یکسر زائل ہوگئی۔ دل خوش خوش ہوگیا..اس کی نفاست اور صفائی ستھرائی ایسی تھی کہ دُھول کا ایک ذرہ بھی کہیں ہوتا تو نظر میں آجاتا...اور ہاں اس دوران میں نے وہ گلدستہ جوز بیر صاحب سینے سے لگائے رکھتے تھے،تقریباً زبردستی اُن سے حاصل کیا اور ایک گل دان میں سجادیا... مستطیل کھڑکی کے آگے تنے پردے واکیے تو اُن کے پیچھے کھڑکی تو نہ تھی ایک سفیدی میں ڈوبی ہوئی پینٹنگ تھی جیسی کہ کرسمس کارڈ پر نقش ہوتی ہے..ڈھلواں چھتوں کی رہائش گاہیں سب کی سب برف سے ڈھکی ہوئی ایک عجیب الوہی سفیدی سے روشن ہوتی ہوئیں..چھتوں پر برف کی دبیز تہیں معلّق تھیں..ان گڑیا گھروں کے پس منظر میں بلند درختوں کا ایک ذخیرہ تھا اور اُن کی ہر شاخ ہر ٹہنی برف کے بوجھ سے دوہری ہوتی تھی..لگتا تھا کہ ابھی برف سے اٹے ان شجروں میں سے سُرخ لبادے اوڑھے، سر پر پُھندنے والی سرخ ٹوپی جمائے فادر کرسمس اپنی ہوائی رتھ پر سوار اُس کے آگے جُتے متعدد رینڈیئرز کو شٹاکار تا نمودار ہوگا اور ہر سُو ''جنگل بیل، جنگل بیل، جنگل آل دے وے'' کی دُھن کی گھنٹیاں بجنے لگیں گی..اور برف میں روپوش ان گھروں کے آتش دانوں کے قریب فادر کرسمس کی آمد کے منتظر بچوں کے چہرے مسکراہٹوں سے کِھل اٹھیں گے کہ اُنہوں نے اپنے بستروں کے ساتھ وہ لامبی جرابیں لٹکا رکھی ہیں جنہیں فادر کرسمس نے تحفوں سے بھر دینا ہے..ایک برفانی سکوت اُس پینٹنگ پر ایک سحر کی مانند طاری تھا لیکن..یہ تو ممکن نہیں کہ ایک پینٹنگ چاہے وہ کتنی ہی کامل ہو اُس میں سچ مچ کی برف گرتی چلی جاتی ہو..آسمانوں سے برف کی سفید مائی بوڑھیاں اتر رہی ہوں..یہاں تک کہ ایک شجر کی شاخ برف کے بوجھ سے یوں دوہری ہو کہ برف کا سفوف اُس سے جھڑنے لگے..ایک پینٹنگ متحرک تو نہیں ہوسکتی اس لیے کہ یہ ایک پینٹنگ نہ تھی مستطیل کھڑکی کے پار ایک ایسا برف آلود الوہی سکوت سے بھرا سفید منظر تھا جس نے ہم دونوں کو مبہوت کر دیا..ہم دونوں کو چُپ لگ گئی، ہم دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا کہ کیا تم بھی وہی دیکھ رہی ہو جو مجھے دکھائی دے رہا ہے اور ہماری آنکھوں میں وہ برف منظر دکھائی دیا تو ہم جان گئے کہ ہاں ہم دونوں ایک ہی سفید خواب دیکھ رہے ہیں..

اُس سفید سکوت میں ٹھہرے ہوئے منظر میں برف گرتی چلی جاتی تھی..صرف اس ''ہوٹل سکینڈک'' کی مستطیل کھڑکی سے نظر آنے والے کرسمس کارڈ منظر کو اپنی آنکھوں میں

کار کے وائپر ونڈ سکرین پر گرتی برف کے انباروں کو سمیٹتے ہانپ رہے تھے..کوپن ہیگن کے نواح برف کے سفید کفن میں دفن ہوتے لگتے تھے جب ہم ''ہوٹل سکینڈک'' کے صدر دروازے تک پہنچے..میں نے کار سے باہر قدم رکھا تو برف سفید ستاروں کی مانند آسمان سے اترتی تھی..برف کا پہلا سفید روئی گالا جب میری گردن پر گرا تو اُس کی ٹھنڈک کی یخ اُنگلیاں میرے ابھی تک کسی حد تک گرم بدن کے لمس سے آشنا ہوئیں اور پگھل گئیں..وہ پانی ہو کر ایک نمناک گیلے آنسو کی مانند میری گردن کی سرد ہو چکی رگوں کے راستے میری جیکٹ کے اندر تک سرایت کر گئیں..ایک رینگتی ہوئی گیلی ٹھنڈک میرے رگ وپے میں اترتی گئی..

وہ بھی تو زمانے تھے..اور کیا ماضی کے اتھاہ سمندروں میں ڈوب چکے ایسے زمانے تھے..اور اُن زمانوں کی گزران میں یہی کوئی پچپن برس بیت چکے تھے جب ڈرائیڈن ہوسٹل نوٹنگھم کے باہر کرسمس کی شام پہلی برفباری ہوئی تھی اور ہم سب غیر ملکی طالب علم اپنے کالج کے پرنسپل کے گھر پیدل چلے جاتے تھے تب میری اسی گردن پر برف کا پہلا گالا گرا تھا اور وہ گرتے ہوئے جوانی کی مُنہ زور آتش کی زد میں آ کر پانی پانی ہو گیا تھا..اور آج کوپن ہیگن میں میری گردن پر برف کا جو پہلا گالا گرا تھا تو فوری طور پر نہ پگھلا تھا، کُچھ دیر بعد پانی ہوا تھا کہ پچپن برس بہت سے برس ہوتے ہیں..

صرف نوٹنگھم میں ہی نہیں..مانچسٹر میں بھی برف گرا کرتی تھی لیکن تب برف گرتی تھی تو تن بدن میں دو چار نہیں سینکڑوں سازوں کی ایک سمفنی ایک آتش فشاں کی مانند بھڑک کر رُوح کے نہاں خانوں میں گونجنے لگتی تھی..

اور اب تو یہ ہے..کہ برف گرتی ہے تو شائبہ سا ہوتا ہے کہ کہیں کسی خزاں رسیدہ وائلن کے بین کرتے ہوئے مغموم تارفنا کے سُروں میں ماتم کرتے ہیں..

زبیر صاحب نے ''ہوٹل سکینڈک'' کے کاؤنٹر پر پہنچ کر اپنے تمام تر کریڈٹ کارڈ پیش کرتے ہوئے ہمارے لیے ایک کمرے کا بندوبست کر دیا..وہ اگرچہ لاپرواہ تھے لیکن مکمل طور پر بے پرواہ نہ تھے..بعد میں کُھلا کہ ایک نفیس اور عُمدہ رُوح تھے۔اگرچہ یہ رُوح اکثر غفلت میں اِدھر اُدھر پرواز کرتی رہتی تھی..

''برف میں دفن شہر میں، دو محبت کرنے والے''

ہم دونوں.. میمونہ اور میں.. مستطیل کھڑکی میں فریم شدہ اُس کرسمس کارڈ کے برف سحر میں تقریباً حنوط ہو چکے تھے جب ایک دستک ہوئی اور صدف مرزا نازل ہوگئی.. اور اُس کی آمد کے بعد چراغوں میں روشنی کہاں رہنی تھی کہ وہ ہم کلام ہوتی تھی تو اللہ اللہ ہوتی ہی چلی جاتی تھی، کسی اور کو ہم کلامی کی گنجائش ملنا محال ہو جاتا تھا۔ چنانچہ نہ شکائتیں، نہ حکائتیں، نہ عرضِ غم اور سوالِ وصل کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تیرے عہد میں.. اُس کی آمد سے سبھی اختیار چلے گئے.. وہ ایسی صدف تھی.. اُس کے خوش آثار چہرے پر کُچھ محرومیاں، کُچھ تلخیاں نقش تھیں.. اور وہ معذرت کر رہی تھی کہ میگرین کی اذیت کے باعث وہ ڈرائیو کر کے ایئرپورٹ پر ہمیں خوش آمدید کہنے کے لیے نہ آ سکی تھی اور اب وہ ہم دونوں کو دل و جان سے خوش آمدید کہتی چلی جا رہی تھی... یہ سیماب صفت خاتون آئندہ دنوں میں مجھے اس لیے بھی عزیز ہوئی کہ اُس نے یرغمال بنا کر دیگر شعراء کی مانند ہمیں ایک بھی شعر نہ سنایا حالانکہ ہم اُس کی شاعری کے بارے میں کُچھ توصیف آمیز تذکرے سُن چکے تھے.. اگر وہ اپنی شاعری سنانے پر اتر آتی، دیوان کے دیوان ہم پر بوجھ کرتی تو کیا ہم اپنی میزبان پر مجبور اُداد کے ڈونگرے نہ برساتے.. یقیناً برساتے کہ ایک اچھے اور احسان مند مہمان کا یہی تو طُرّہ امتیاز ہے..

اندر صدف باتیں کرتی تھی اور باہر.. برف گرتی تھی اور ساز بجتے تھے..

اور وہ ہمیں بتا رہی تھی کہ پچھلے دنوں نظم کے باکمال شاعر ستیہ پال آنند اُس کے گھر مہمان ہوئے تھے اور کیسے جرمنی میں مقیم کسی پاکستانی حضرت نے اُنہیں بصد اصرار اپنے ہاں مدعو کیا تھا اور اپنے ہاں ٹھہرالیا تھا.. بقیہ مہمانوں نے تو محض دُھلی ہوئی چادروں کا مطالبہ کیا تھا اور وہ اُس سے کسی ہوٹل میں شفٹ بھی نہ کر سکتے تھے کہ وقت آدھی رات کا تھا لیکن بزرگ ستیہ پال اس لیے آنند سے سو نہ سکتے تھے کہ اُنہیں ایک بچے کا بیڈ تفویض کر دیا گیا تھا اور اُن کی ٹانگیں اُس بے بی کاٹ سے اتر کر فرش پر دراز

سمونے کے لیے ہی کوپن ہیگن آنا اور پھر فوری طور پر واپس چلے جانا بھی جائز ٹھہرتا تھا..اور دنیا بھر میں جہاں کہیں بھی برف گرتی ہے تو وہاں ساہیوال کے مجید امجد کی شاعری کے ساز بجتے ہیں..

برف گرتی ہے ساز بجتے ہیں
فاصلوں کی کمند سے آزاد
میرا دل ہے کہ شہر میونخ ہے
چار سُو، جس طرف کوئی دیکھے
برف گرتی ہے، ساز بجتے ہیں..

♦♦.....♦♦.....♦♦

ایک سفید تاج کی مانند سجی تھی..اب یہ جوزبیر صاحب تھے، ہولے ہولے کُھلا کہ نہایت کاریگر اور کارآمد آدمی تھے..ٹیکسی چلاتے تھے..فوٹوگرافر بھی تھے اور بہ وقت ضرورت ٹیلی ویژن کیمرے بھی آپریٹ کر لیتے تھے..اور جانے کیا کیا کر لیتے تھے..کام کے آدمی تھے..سب سے پہلے تو اُنہوں نے ہوٹل سے کُچھ فاصلے پر واقع ہمیں برف میں ڈوبا ہوا اپنا گھر دکھایا، یعنی باہر سے..اور پھر شہر کے مرکز کی جانب روانہ ہو گئے..آسانی سے نہیں شاہراہ پر ڈھیر ہو چکی برف میں سے سُرنگیں لگاتے، سٹیئرنگ پر بمشکل قابو پاتے کہ وہ بھی برف پر سے پھسلتا خواہ مخواہ گھومنے کو ہوتا تھا..کہیں کہیں وہ کاریں تھمی ہوئی تھیں جنہیں برف نے گھیر کر اُن کے ٹائروں کو منجمد کر دیا تھا اور زبیر صاحب کبھی کسی ایسی کار کو دیکھتے تو مسرت سے لبریز ہو جاتے..دیکھا تارڑ صاحب..یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے برف پر ڈرائیو کرنے والے ٹائر نہیں بدلے..کیسے بیوقوف لوگ ہیں..وہ ہمہ وقت ایسے بے وقوف لوگوں کی پھنس چکی کاروں کی نشاندہی کرتے رہے اور وہ جو چند کاریں حرکت میں تھیں اُن میں سے کسی ایک کو دیکھ کر نعرہ لگاتے ''تارڑ صاحب اس شخص نے بھی موسم سرما کے لیے اپنے ٹائر تبدیل نہیں کیے..آپ دیکھتے رہیے گا یہ ابھی برف میں پھنس جائے گی..'' میں نے یونہی پوچھا کہ زبیر صاحب..آپ نے تو اس کار کے ٹائر تبدیل کر لیے ہوں گے، کہنے لگے ''ابھی تو نہیں کیے، کل کر لوں گا..''

اور جب میں پوچھتا کہ زبیر صاحب یہ شُکلا صاحب کا ریستوران کتنی دور ہے تو وہ کہتے، مجھے یقین ہے اُس ہندو نے بھی اپنی کار کے ٹائر نہیں بدلے ہوں گے..ہندو جو ہے..

راستہ طویل ہوتا جاتا تھا اور ہم ابھی تک ہالینڈ سے کوپن ہیگن تک کے سفر کی تھکاوٹ میں تھے..

آس پاس برف میں مدفون بستیاں ایک سفید سناٹے میں گُم گزرتی جاتی تھیں اور برف کے گالے بھٹکتی ہوئی سفید روحوں کی مانند ایک تواتر کے ساتھ آسمان سے ڈولتے اترتے جاتے تھے اور کار کے وائپر اُنہیں سمیٹتے ہانپ رہے تھے..

میری زندگی کی پہلی برفباری تقریباً باون برس پیشتر نومبر کی کرسمس کی شام میں اتری تھی اور پچاس برس پیشتر مانچسٹر کے نواح میں واقع ایک جنگل پر سفید ہوئی تھی جب میں اپنی لینڈ لیڈی مسز چیپ مین کے سکاٹش ٹیریئر کُتے کو اس جنگل میں سیر کروانے کے لیے لے کر گیا تھا اور واپسی پر اُس مختصر کُتے کو ہیٹر کے سامنے رکھ دیا تھا کہ اُس کے سیاہ بالوں سے برف کے گولے لپٹ چکے تھے جو ہولے

ہوتی تھیں..اسی لیے تو میں پرائیویٹ گھروں میں قیام پذیر ہونے سے معذرت کرتا تھا..

ہم سویرے سویرے ہی کوپن ہیگن میں وارد ہو گئے تھے کہ ایمسٹرڈیم سے بھی تو مُنہ اندھیرے چلے تھے..چنانچہ ہمارے پاس ابھی ایک سالم دن پڑا تھا..اور یہاں ہم دونوں وہ اپاہج تھے جو صدف مرزا کی بیساکھیوں کے سہارے ہی کہیں باہر جا سکتے تھے، ہم اُس کے رحم وکرم پر تھے کہ جہاں جی چاہے ہمیں اٹھا کر لے جائے..تو وہ کہہ رہی تھی کہ تارڑ صاحب اب آپ کو ایک مرتبہ پھر زبیر صاحب لے جائیں گے..کہاں لے جائیں گے، کسی شُکلا صاحب کے ریستوران میں جہاں دوپہر کے کھانے کے علاوہ کُچھ لوگ آپ کے منتظر ہیں..

اور شُکلا صاحب کیا شکل ہیں، کون ہیں اور ہم کس سلسلے میں اس برفباری کی رُت میں اُن کے ریستوران چلے جائیں تو صدف بی بی نے یہ کہہ کر ہمیں فارغ کر دیا کہ بس وہ شُکلا صاحب ہیں اور شکل سے ہندو لگتے ہیں اور ہیں بھی..ہندوستانی ہیں اور آپ کے چاہنے والوں میں سے ہیں اور جب سے آپ کی آمد کی خبر آئی ہے اُنہوں نے میری جان کھا ماری ہے کہ تارڑ صاحب کو کوپن ہیگن میں پہلا کھانا میں اپنے ہاتھوں سے اپنے ریستوران میں کھلاؤں گا..اب یہ ایک عجیب معمہ تھا کہ اگر یہ ہندو سے ہیں اور ہندوستانی سے بھی ہیں تو میرے چاہنے والے کیسے ہو گئے کہ میری مخدوش کردار کی حامل شہرت اتنی عالمگیر بھی نہیں ہوئی کہ کوپن ہیگن کے شُکلوں تک بھی پہنچ گئی ہو..اس پر صدف نے صرف اتنا کہا کہ یہ آپ ان سے پوچھ لیجیے گا، میں فارغ البال نہیں ہوں، میرے کُچھ بال ہیں اور میں اُنہیں لینے کے لیے جا رہی ہوں..اور زبیر صاحب آپ کو لے کر جا رہے ہیں..

اور زبیر صاحب اس دوران نہایت خوش اخلاقی سے ایک کونے میں ایستادہ گلدان میں سجے اُس گُل دستے کو حسرت سے تکتے جسے تقریباً زبردستی اُن کے سینے سے جُدا کر دیا گیا تھا، مسکرائے چلے جا رہے تھے..

باہر ''ہوٹل سکینڈک'' کے باہر برف گرتی تھی اور ساز بجتے تھے، پارکنگ لاٹ میں متعدد کاریں برف کی سفید ردا میں روپوش دفن ہو چکی تھیں..ایک ملگجی آسمان سے برف کے گالے سفید سرو ستاروں کی مانند گرتے چلے جاتے تھے..زبیر صاحب اپنی کار میں جا بیٹھے اور پھر ہم نے دیکھا کہ کار نے ایک جھرجھری سی لی اور اُس پر جمع شدہ برف ایک انتشار شدہ حالت میں اُس کے آس پاس ایک آبشار کی مانند گری اور وہ دھچکے کھاتی ہمارے پاس آ رُکی..اُس کی چھت پر اب بھی برف کی ایک دبیز تہہ

شُکلا صاحب کے ریستوران کے شیشہ در و دیوار پر میرے نام کے خوش آمدیدی پوسٹر آویزاں تھے.. میری وہاں آمد کی اطلاع کے کُچھ اشتہار تھے، کُچھ خصوصی آرائشیں تھیں اور کُچھ دیئے میرے اعزاز میں روشن تھے.. اور اس کے اندر کچھ اجنبی لوگ ملاقات کے منتظر تھے.. یہ کتاب کے، ٹیلی ویژن سکرین کے رشتے بھی عجیب رشتے ہوتے ہیں... یہ رشتہ دار نہ صرف آپ کو بلکہ آپ کے بچوں کو بھی جانتے ہیں لیکن آپ انہیں نہیں جانتے.. ایسے رشتے داروں سے ملتے ہوئے اُن کے لیے ایک تشکر کا جذبہ ابھرتا ہے.. آپ اُن کے چہروں سے شناسا نہیں اور اُن کی آنکھوں میں آپ کے لیے محبت کے چراغ روشن ہوتے ہیں.. ریستوران میں منتظر کُچھ ایسے ہی رشتے دار تھے جو کسی نہ کسی حوالے سے مجھ سے ملاقات کے متمنی تھے اور.. ان میں ایک وجیہہ اور کھلنڈرے سے سردار صاحب بھی تھے جنہوں نے جھٹ مار مار کر میرے ہمراہ تصویریں اتروائیں.. اور پھر یہ میرے میزبان شُکلا صاحب تھے، تھیٹر کے کوئی قدیمی اداکار لگتے تھے.. کہ اُن کی چال ڈھال میں ایک ڈرامائی لچکدار کیفیت تھی.. نہ صرف یہ کہ وہ کسی حد تک میرے سفر ناموں سے واقفیت رکھتے تھے بلکہ میری اداکاری کے دنوں کے حوالے بھی دیتے تھے.. میں آج تک اس بھید کو نہیں جان سکا کہ آخر ایک ہندوستانی ہونے کے باوجود اور ایک مدت سے کوپن ہیگن میں حیات کرنے کے باوجود وہ میرے بارے میں اتنا کُچھ کیسے جانتے تھے کہ مُجھے اپنے ریستوران میں ڈنمارک کا پہلا کھانا پیش کرنا چاہتے تھے..

البتہ یہاں ایک معمولی سی بدمزگی ہوگئی.. میمونہ اگرچہ شُکلا کی میزبانی کی معترف ہوئی لیکن یکدم اُس کا مُوڈ آف ہوگیا اور وہ اٹھ کر ایک کونے میں جا بیٹھی.. اُسے توقع تھی کہ وہاں کُچھ خواتین بھی موجود ہوں گی جو کہ نہ تھیں، وہاں سب کے سب موئے مرد تھے اور اُس نے اپنے آپ کو بے آرام سا محسوس کیا، اس صورتِ حال کو پسند نہ کیا.. بلکہ بعد میں اُس نے صدف مرزا کی بھی خُوب خبر لی کہ تم وہاں کیوں نہیں تھیں..

میرا گمان تھا کہ شُکلا کے ریستوران کا کھانا کُچھ بے رُوح دال بھات سبزی جات نوعیت کا ہندوانہ سا ہوگا لیکن صاحب یہ ہندو بابا ذائقے کی پہچان رکھتا تھا.. اور کیا ہی لاہوری اور گرم مزاج کے کھانے تیار کرتا تھا.. شُکلا ایک غلام کی مانند ہماری خدمت کرتا تھا، گرم روٹیاں لاتا تھا، سلاد کے پیالے پیش کرتا تھا، اور اُس کا سٹاف بھی ہمارے آگے پیچھے پھرتا ڈش پر ڈش سجاتا چلا جاتا تھا.. تو اے شُکلا، تم جہاں کہیں بھی ہو خوش رہو، میں یہاں لاہور میں تمہاری الفت اور میزبانی کو یاد کرتا ہوں.. شکریہ اے

ہولے پگھلنے لگے اور وہ ہوش میں آنے لگا..ازاں بعد پاکستانی شمال میں متعدد بار کبھی سنولیک پر اور کبھی کے ٹو کے دامن میں آسمانوں سے برف اُتری لیکن اتنے برسوں بعد میں ایک آباد بستی میں، ایک یورپی شہر پر گرتی برف کے نظاروں میں تھا اور یہ کیفیت مجھے ایک عجیب پُرمسرت ہیجان سے آشنا کرتی تھی..

دائیں جانب برف میں دفن ایک ایسا وسیع پارک نظر میں آیا جس کے سارے شجر برف کے سفید پیراہنوں میں حنوط تھے، جتنے بھی گُل بوٹے تھے سب کے سب اپنے رنگ رُوپ برف کی سفیدی کے سُپرد کر چکے تھے اور اُن کے درمیان میں اُس پارک کا ایک مرکزی راستہ تھا اور وہ بھی برف میں ڈھکا ہوا..اور اُس راستے پر..جس پر جتنے بھی شجر برف میں گُم ساکت تھے اُس پر میں نے دیکھا کہ اُس سفید تنہائی میں ایک جوڑا ہے جو سر جوڑے ایک سفید سلطنت میں اپنے آپ میں گُم چلا آتا ہے اور وہ دونوں غالباً کوئی نوخیز جوڑا..لیکن کیا پتہ کہ ادھیڑ عمر کا بھی کوئی جوڑا..میری یادداشت پر ثبت ہو گیا..اور میں نے زبیر صاحب سے درخواست کی کہ آپ نے مجھے پلیز اس پارک میں لے کر آنا ہے کہ میں نے اس کی سفید سلطنت میں کُچھ دیر کے لیے ظاہر ہے میمونہ کے ساتھ برف آلود شجروں میں گھرے اس برف راستے پر چلنا ہے..زبیر صاحب کی مسلسل مسکراہٹ سمٹ گئی..ہاں جی کیوں نہیں..پر کیوں..

ہم شہر کے مرکز یعنی کوپن ہیگن کے ٹاؤن ہال کے نواح میں واقع بالآخر شُکلا صاحب کے اُس ریستوران تک پہنچ گئے اور وہ بھی برف میں ٹھٹھرتا تھا..

اور ہاں ٹاؤن ہال کے قریب سے گزرتے ہوئے اُس کی قدیم عمارت پر نظر کرتے جب مجھے اُس کے سامنے ایستادہ ایک فوارہ اگرچہ برف سے منجمد نظر میں آیا تو گویا ماضی کی داستانوں کا ایک ورق سامنے آ گیا اور میں نے باقاعدہ اُس فوارے کو ایک سلام پیش کیا، ایک سیلوٹ کیا کہ جب صدیوں پہلے ایک سُرخ بالوں والی امریکی خاتون نے مجھے عین اس مقام پر ڈراپ کیا تھا اور میں اتنا کچّا اور بیوقوف تھا کہ اُس کی پیشکش کو رد کر کے اُس کی سپورٹس کار سے اتر گیا تھا تو..صُبح ہونے میں ابھی کُچھ دیر تھی اور میں اسی فوارے کے پہلو میں اپنا سلیپنگ بیگ بچھا کر خوابیدہ ہو گیا تھا اور جب میری آنکھ کُھلی تھی تو فوارے کے پانیوں کی پھوار میرے چہرے کو بھگوتی تھی اور دُھوپ تھی اور سکول کے بچوں کا ایک گروہ میرے اردگرد کھڑا مجھے حیرت سے تک رہا تھا کہ میں اُن کا پہلا پاکستانی تھا..کوپن ہیگن پر ابھی گجرات اور کھاریاں کی جاٹ یلغار نہ ہوئی تھی...

چاندنی راتیں..

ہم بھی اُس شب جب کوپن ہیگن کا جگ سوتا تھا، سوتے تھے لیکن کبھی کبھار جاگتے تھے، تاروں سے باتیں کرنے کے لیے نہیں، چوری چھپے اٹھ کر مستطیل کھڑکی میں فریم شدہ برف کے سحر میں گُم ایک شہر کو دیکھنے کے لیے..

شب بھر رہا چرچا تیرا..

کم از کم ایک بار میں نے میمونہ کی چوری پکڑ لی..ذرا سی آہٹ ہوئی اور میری آنکھ کُھل گئی اور وہ مستطیل کھڑکی کے سامنے کھڑی چوری چُھپے سکوت میں آئے ہوئے اُس سفید منظر کے سحر میں گُم تھی..

ہم راتوں کو اٹھ اٹھ کر روتے ہیں..

جب سارا عالم سوتا ہے..

راتوں کو اٹھ اٹھ کر ہم اُس کھڑکی میں جڑے سفید منظر کو تکتے تھے..

فوارے کے پانی منجمد ہو چکے تھے اور اُس کے مجسمے، مچھلیوں اور چہروں کے برف کے لبادے اوڑھے ہوئے تھے..

ہم دونوں اپنے مہربان میزبانوں سے گزارش کر کے کوپن ہیگن کے ٹاؤن ہال کے قریب پہنچ کر تنہا ہو گئے تھے..

میں اس فوارے کو سلیوٹ کر چکا تھا..

تو میں نے بیتے دنوں کی یاد میں اُس فوارے کے ساتھ لگ کر تصویریں اتروائیں..میمونہ کو بتایا کہ ہاں یہی ہے وہ مقام جہاں آپ کے تاجدار کسی زمانے میں ڈنمارک کی پہلی شب میں انہی پتھروں پر اپنا سلیپنگ بیگ بچھا کر خوابیدہ ہو گئے تھے..ٹاؤن ہال کے پہلو میں ہانز کرسچن اینڈرسن سٹریٹ میں اُس کا بھدا سا مجسمہ برف کی ویرانی میں ویران تھا..اُس کی موٹی ناک اور ہیٹ پر برف کی ایک تہہ سفید ہوتی تھی..ایک بدشکل داستان گو جس نے نہ صرف بدشکل بطخ کی کہانی تخلیق کی بلکہ ننھی جل پری کو بھی جنم دیا..میمونہ نے اُس کی پتھریلی آغوش میں بیٹھ کر ایک تصویر اتروائی..شاید اس لیے بھی کہ اُس کا خاوند بھی ایک معمولی درجے کا داستان گو تھا..

شُکلا کہ مُجھے وہ دن بھی یاد ہیں جب میں اس شہر کوپن ہیگن میں ایک خیراتی گھر میں سستا اور بدمزہ کھانا کھانے کے لیے چلا جایا کرتا تھا..اور ایک گمنام آوارہ گرد تھا..

واپسی پر مجھے کوپن ہیگن کی مشہور سیر گاہ ٹوالی کے گُنبد اور روشن بام و در نظر آئے..ٹوالی ایک مختصر رقبے پر مُشتمل کھیل تماشوں، شراب خانوں، ریستورانوں، رقص گاہوں اور بچوں کی تفریح کے سامان کا ایک خوشیوں کا باغ ہے جو اہل ڈنمارک کو بے حد عزیز ہے..کیوں عزیز ہے یہ میں آج تک نہیں جان سکا، شاید یہ ایک روایت ہے یا حُب الوطنی کا کرشمہ ہے اور ٹوالی کا حُسن بھی کُچھ ایسا کرشمہ ساز نہیں..گزر چکے زمانوں میں اس کی ایک ویران سی رقص گاہ میں ایک بلند قامت سنہری بالوں والی لڑکی ایک ملاح کے ساتھ بے دلی سے ناچتی تھی..اور جب میں نے اُسے رقص کے لیے مدعو کیا تو وہ اُس ملاح کو ترک کر کے میرے ساتھ چلی آئی..اور ایک شب اس شہر کی گلیوں میں وہ اپنے قصبے راسکلے جانے والی آخری ٹرین میں سوار ہونے کی خاطر اپنی لامبی ٹانگوں سے بھاگتی چلی جاتی تھی اور میں ہانپتا ہوا اُس کے پیچھے چلا جاتا تھا...راسکلے، جہاں ڈنمارک کا سب سے قدیم کلیسا وہاں کے باشندوں کے لیے ایک روحانی سرخوشی تھا...اور وہاں ایک وسیع جھیل تھی جس کے ڈھلواں کناروں پر میں نے اپنا خیمہ نصب کیا تھا اور وہ چلی آئی تھی..کیا جانئے اب وہ کس حال میں تھی۔اگر کہیں تھی اور میں ٹوالی کے قریب سے گزرتا تھا جہاں کبھی وہ ایک رقص گاہ میں ایک ملاح کے ساتھ اپنی لامبی ٹانگوں کے ساتھ رقص کرتی تھی..میں وہاں سے پل بھر میں گزر گیا جہاں کئی زمانے گزر چکے تھے..

''ہوٹل سیکنڈک'' کی مستطیل کھڑکی میں فریم شدہ کرسمس کارڈ میں مسلسل برف گرتی تھی..ہم دونوں اس سفید منظر کو اپنی آنکھوں میں سموتے اُنہیں بھی سفید کرتے تھے جب میمونہ نے مجھے متوجہ کر کے کہا..''ذرا دیکھو اس کھڑکی کے عین دامن میں کچھ شجر ہیں جن کی برف ٹہنیوں پر دو پرندے اترنے کی کوشش کرتے ہیں، اترتے ہیں تو اُن کے بوجھ سے ٹہنیوں پر بوجھ ہوتی کُچھ برف گرتی ہے اور مجھے اُن کے چہکنے کی مدھم سی آواز آتی ہے..''

برف گرتی ہے اور نہ صرف ساز بجتے ہیں بلکہ دو پرندے چہکتے ہیں..

سب جگ سوئے ہم جاگیں
تاروں سے کریں باتیں

''برف کے عذاب میں..خس وخاشاک کے زمانے''

مجھے نہیں معلوم کہ اُس عمارت کی نوعیت کیا تھی، کوئی درس گاہ تھی، کمپیوٹر ورکشاپ تھی یا کسی جدید قید خانے کی کینٹین کا ایک حصّہ تھا..کہیں کہیں کچھ سائنسی قسم کے آلات میزوں پر رکھے تھے شاید کوئی تجربہ گاہ تھی..جو کُچھ بھی تھی ایک محفوظ پناہ گاہ تھی، جو کوئی بھی اس میں داخل ہوتا برف سے اٹا ہوتا، اپنا لبادہ جھاڑتا اور رب کا شکر ادا کرتا کہ باہر جو برف کا عذاب اتر رہا تھا، اُس سے نجات ملی..یہ ایسی پناہ گاہ تھی جس میں مجھ پر کچھ ادبی تجربے کیے جانے تھے یعنی مجھے اُن لوگوں کے روبہ رو ہونا تھا جو تعداد میں قلیل تھے پر جتنے بھی تھے جانے کہاں کہاں سے برف کی اذیتیں جھیلتے اُس شب صرف میری خاطر اپنے آسودہ گھروں سے نکل کر جانے کتنی کٹھنائیوں سے یہاں تک پہنچے تھے..بیشتر شاہراہیں جو کوپن ہیگن کو ڈنمارک کے بقیہ حصّوں سے ملاتی تھیں برف سے بلاک ہو چکی تھیں..وہ طویل پُل جو ڈنمارک کے جزیروں کو آپس میں جوڑتے تھے اُن میں سے چند ایک نا قابل عبور ہو چکے تھے اور اس کے باوجود کُچھ لوگ پہنچ گئے تھے...ہر نئے شخص کی آمد مجھے مزید شرمندگی سے دوچار کرتی اور وہ جس والہانہ اُلفت اور چمکتی آنکھوں سے میری جانب بڑھتا میں اُس کے التفات کے بوجھ تلے دبتا جاتا..اُن بُرے موسموں اور یخ بستہ ہواؤں میں جن کے دوش پر برف کے گالے سرد تھپیڑوں کی مانند آپ کے بدن کے اندر اتر کر اُسے منجمد کرتے تھے اگر کسی مان جانے والی مِس یونیورس کے ساتھ میری ڈیٹ ہوتی تو بھی میں اپنے گھر سے باہر قدم نہ رکھتا اور اُسے زیادہ سے ایک ایس ایم ایس بھیج دیتا کہ..جوزفین آج کی شب نہیں..

اور صدف ایک پھرکی کی مانند گھومتی چلی جاتی تھی، محفل کے انتظامات کرتی جھلّی ہوئی جاتی تھی اور وہ تھی بھی ایک جھلّی ایک سودائن جس کے سر میں ادب کا سودا سما گیا تھا، اس دوران کوپن ہیگن سے خاصے فاصلے پر رہائش پذیر ایک بزرگ لرزتے کانپتے اپنی گرتی ہوئی صحت کے باوجود چلے آئے

ہم دونوں تنہا پھرتے تھے..برف باری رُک چکی تھی..

شام اتری تو اُس کے ساتھ ہی برف بھی اترنے لگی..

ہولے ہولے آسمانوں سے گرنے لگی..

اور یہ شام جب گہری ہوتی ہے تو آج شب میں تو نہیں صدف جانتی تھی کہ کہاں کُچھ لوگ میرے منتظر ہوں گے..ایک ایسی محفل جس کے لیے صدف نے مجھے مدعو کرنے کے بکھیڑے پالے تھے..

اور برف تھی کہ کُچھ لحاظ نہ کرتی تھی، گرتی جاتی تھی..

♦♦.....♦♦.....♦♦

اِن زمانوں میں ہم آئینہ کم کم ہی دیکھتے تھے، اُن کے برادرِ کوچک اسد ملک بھی کیا ہی شاندار شاعری کرتے تھے اور ڈنیش ادب کے ایک موثر مترجم کی حیثیت سے بخوبی پہچانے جاتے ہیں، نصر ملک نے نہایت تھیٹریکل انداز میں میرے حوالے سے ایک ڈرامائی مضمون پڑھا..اپنے کٹیلے فقروں کی جانب سامعین کو متوجہ کرتے رہے اور مجھے ڈنمارک کو دریافت کرنے والا پہلا پاکستانی ٹھہرایا..یعنی تحریر کے حوالے سے..اور انہوں نے ''نکلے تری تلاش میں'' کے کُچھ ایسے حصے اس مضمون میں درج کیے جو میں بھی فراموش کر چکا تھا۔

ویسے آپس کی بات ہے کہ صدف مرزا اور نصر ملک لگتا تھا کہ متحارب ادبی مبارزتیں ہیں..

نصر ملک کے بعد جیسا کہ روایتی طور پر ہمیشہ کہا جاتا ہے..مجھے دعوتِ کلام دی گئی..میں نے حسب مقدور کچھ کلام کیا..ہوئے وہ ہم سے ہم کلام اللہ اللہ..یعنی ہم نے جب کلام کیا کہ تو اُس کی اثر انگیزی ایسی تھی کہ حاضرین توبہ توبہ کرتے اللہ اللہ کرنے لگے..ایسا بے رنگ اور بے اثر کلام تھا..میں نے نصف صدی پیشتر کے ڈنمارک کی کچھ پرچھائیاں حاضرین کے ذہنوں کی سکرین پر عکس کیں اور پھر ایک دو ہلکے پھلکے نیم مزاحیہ کالم پڑھ کر سنائے..اور آخر میں اپنے ناول ''خس و خاشاک زمانے'' کا وہ باب ان دور کے شہروں سے آنے والے لوگوں کی خدمت میں پیش کیا جس میں اسی شہر کوپن ہیگن کے ایک اخبار میں شائع ہونے والے مسلمانوں کے لیے دل آزار کارٹونوں کے احتجاج میں لاہور شہر کی چند تاریخی عمارتوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا تھا..میں نے آج ہی کوپن ہیگن میں اُس عمارت کو دیکھا تھا جس کے ماتھے پر اُس اخبار کا نام آویزاں تھا اور وہ ابھی تک جُوں کی تُوں تھی جب کہ ہم نے اپنا آدھا شہر احتجاج کے طور پر خود ہی جلا ڈالا تھا..ہم خود سوزی میں کمال رکھتے ہیں..اس ناول کا ایک کردار روشن بخش ایک اجتماعی غضب کا شکار ہو کر ایک سڑک پر اپنے آخری سانس لے رہا ہے..اُس کا خُون مُردہ ہوتے پرندوں کی صورت میں تارکول کی سطح پر موت سے ہمکنار ہو رہا ہے..اور تب..مجھے احساس ہوا کہ برابر میں تشریف فرما صابر صاحب کی بوڑھی آنکھوں میں ایک ہلکی سی نمی ہے اور وہ کسی ایک آنسو کو روکنے کی کوشش میں اپنے آپ پر جبر کر رہے ہیں..اور وہ بار بار سر ہلاتے تھے..یہ میری تحریر کی اثر انگیزی تو ہرگز نہ تھی..وطن سے بچھڑ جانے کی کسک اور لاچاری اور اپنے علم اور تدبر کی بے قدری اور گمنامی تھی جو اُنہیں رُلاتی تھی..جب وہ قدرے سنبھلے تو اُنہوں نے ایک قدیم لَے میں علامہ اقبال کے کچھ شعر ایک تھرتھراتی اگرچہ مترنم آواز میں پڑھے اور اُن کی لرزش زدہ آواز میں ایک تیقّن اور تمکنت تھی..

اور یہ صابر صاحب تھے، ان کی جتنی بھی گزری شاعری اور اقبال کے جنوں میں گزری تھی۔ ڈنمارک میں علامہ کے نام کی ایک انجمن قائم کیے اُن کی شاعری کی ترویج کر رہے تھے، متعدد کتابوں کے مصنف تھے.. ابھی حال ہی میں انہوں نے سہیل عُمر کو یہاں مدعو کیا جو بلاشبہ اقبال کی سوچ اور فکر کی نمائندگی ازحد مؤثر انداز میں کرتے ہیں.. صابر صاحب کے سوا وہاں اور کون تھا جو اس محفل کی صدارت کر سکتا..

مجھے طمانیت ہوئی کہ وہاں خواتین کی ایک معقول تعداد موجود تھی اور میمونہ اُن کے درمیان اطمینان آور کیفیت میں بیٹھی تھی، اُس کے ساتھ یہاں شُکلا کے ریستوران والا سانحہ نہ ہوا تھا..

کچھ شمعیں بھی روشن تھیں جن کی جھلملاہٹ کھڑکیوں کے اُن شفاف شیشوں میں عکس ہوتی تھی جن کے پار برف کی سفیدی ہنوز آسمانوں سے اترتی تھی.. سب سے پہلے صدف مرزا نے پچھلی صدی کی اُن ڈینش خواتین کے بارے میں ایک خاصا دقیق تحقیقی مقالہ پیش کیا جنہوں نے معاشرے کی اُن زمانوں میں مروجہ اقدار سے روگردانی کر کے اپنے آپ کو ادب اور شاعری کے سُپرد کر دیا... مجھے حیرت ہوئی کہ اُن میں سے بیشتر نے ایک نارسائی کے عالم میں تنگ نظری اور بے قدری کے اُس معاشرے میں اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالا.. یہ کُچھ زیادہ زمانے نہیں ہو گزرے جب ڈنمارک میں خواتین تخلیق کاروں پر اُس معاشرے کے عتاب نازل ہوتے تھے کہ وہاں عورت ایک باندی اور ہاتھ جوڑ غلام تو ہو سکتی تھی لیکن قلم سے رشتہ استوار کرتی تھی تو قابل گردن زدنی ہو جاتی تھی.. مجھے خیال آیا کہ ایک انگریزی محاورے کے مطابق کیسے میزیں الٹ جاتی ہیں، محض سو ڈیڑھ سو برس میں.. کہ یہ مشرق تھا جو ہزاروں برسوں سے اُن خواتین کا معترف اور گرویدہ تھا، اُن کے گیت گاتا تھا جنہوں نے شاعری کو اپنے دل کے قریب کیا.. کہیں میرا کے بھجن رُوپ تھے، کہیں قرۃ العین طاہرہ اپنے محبوب کے دیدار کے لیے سرگرداں چہرہ بہ چہرہ اور کو بہ کُو.. رو بہ رو اور گلیوں گلیوں پھرتی تھی.. اور کبھی اورنگ زیب کی بیٹی مہر النساء اپنے دل کا حال کہتی دیوان مرتب کرتی تھی..

صدف کے مقالے کے بعد ہدف میں ہوا..

وہاں نصر ملک بھی موجود تھے جو اگرچہ باسی گوجرانوالا کے تھے لیکن اُن کی رُوح ازل سے ڈنمارک میں بھٹکتی پھرتی تھی.. یہ براڈ کاسٹر اور شاعر جب میں نے انہیں دیکھا تھا تو ایک مناسب نوعیت کے جوانِ رعنا ہوا کرتے تھے لیکن اُس شب وہ مُجھ سے پہچانے نہ گئے۔ وقت نے اُن پر کیسا ستم کیا تھا کہ وہ، وہ نہ رہے تھے.. اور دور کیا جانا ہم بھی تو وہ، وہ نہ رہے تھے.. کبھی آئینہ دیکھتے تو پتہ چلتا اس لیے

اور پھر فوراً ہی موضوع بدل کر بولی ''تارڑ صاحب آپ کو مچھلیاں پسند ہیں؟''

مجھے شاعری سننے کے بعد یکدم جو مچھلی کا جھٹکا لگا تو میں نے بوکھلا کر کہا ''بی بی.. بے شک..''

''کس قسم کی مچھلیاں؟''

''جو بھی دامِ خیال میں پھنس جائیں..'' میں نے ہنس کر کہا ''لیکن تم کیوں پوچھتی ہو؟''

''یہاں کوپن ہیگن کی سب سے لذیذ تلی ہوئی مچھلی ایک پاکستانی ریستوران میں ملتی ہے۔ یہاں تک کہ ڈینش مرد و زن بھی اُس کے منفرد ذائقے کے اسیر چلے آتے ہیں تو اُس ریستوران کے پاکستانی مالک نے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ تارڑ صاحب کو یہاں لائیے.. اُنہیں ہماری مچھلی کھلائیے۔''

مجھ میں رات کے اس پہر اتنی سکت نہ رہی تھی کہ میں نئے لوگوں سے ملتا.. اُن کے ساتھ مناسب گفتگو کرتا، لمحۂ موجود میں میری سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ باہر گرتی برف کے عذاب سے فرار ہو کر اپنے ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر بستر پر دراز ہو جاؤں۔ چنانچہ میں نے معذرت کر لی.. اور اس کے باوجود ہم کچھ لمحوں کے لیے اُس ریستوران کے باہر رُکے اور وہ تلی ہوئی مچھلی جس کے ہمراہ آلو کے قتلے، سلاد کے ڈھیر اور پُر لذت ساس تھے، پیک شدہ حالت میں ہمارے ساتھ چلے آئے.. ہوٹل کے کمرے کی عافیت میں پہنچ کر جب ہم دونوں نے اُس نامعلوم پاکستانی مداح کی تیار کردہ مچھلی کھائی تو اُن کے معترف ہو گئے.. بے شک اپنی گوالمنڈی کے سردار مچھلی والے اور مزنگ کے دارالماہی کے ہاں خصوصی لاہوری ذائقے تھے لیکن ڈنمارک کے یہ ذائقے بھی اُن سے کسی طور کم نہ تھے بلکہ اُن کی نسبت صاف سُتھرے تھے..

ایک قنوطی لاہوریئے کا کہنا ہے کہ آج سے ایک ہزار برس پیشتر کسی شخص نے راوی کی ایک مچھلی کو ایک کڑاہی میں ڈال کر ابلتے تیل میں فرائی کیا اور اُس کے بعد مجال ہے کسی نے یہ سوچا ہو کہ مچھلی کو یُوں فرائی کرنے کے علاوہ اسے کسی اور ترکیب سے بھی تیار کیا جا سکتا ہے... فرانسیسی اسے سو طرح سے تیار کرتے ہیں.. انڈونیشیا اور چین والے اور جاپانی صرف مچھلی کے پکوان میں کیسی کیسی اختراعیں کرتے ہیں.. یہاں تک کہ جاپانی دسترخوان پر ایک ایسی زہر آلود مچھلی سجائی جاتی ہے جس کا زہر نکال کر اُسے بنانے پکانے کے لیے ایک برس کی ماہرانہ تربیت درکار ہوتی ہے.. اور ہم ہیں کہ مخدوش گدلے تیل میں پچھلے ایک ہزار برس سے مچھلی تلے جا رہے ہیں اور یاد رہے کہ اس مصنف نے ایک عرصہ

اگر وہ پاکستان میں ہوتے تو اُنہیں اقبال کے تفکر کے ایک ترجمان کے طور پر.. یقیناً پذیرائی نصیب ہوتی..نامور ہوتے..اور یہاں..وہ مکمل گمنامی میں اپنی زندگی کے آخری ایام بسر کر رہے تھے..اُن کی کوئی نہ کوئی مجبوری تو ہوگی کہ انہیں ڈنمارک میں ہی قیام کرنا پڑا..وطن سے دوری نے انہیں یقیناً ایک آسودہ اور سہولت آمیز حیات تو عطا کی ہوگی لیکن اس کے صلے میں اُن کے تخلیقی تموج کے آگے بے قدری اور گمنامی کا بند بندھ گیا تھا..وہ رخصت ہونے لگے تو میں اُنہیں باہر گرتی برف میں اُن کی کار تک چھوڑنے گیا..وہ بہت اصرار کرتے رہے کہ میں کم از کم ایک دن تو اُن کے ہاں آ کر اُن سے کچھ باتیں کروں، ممکن ہو تو ایک شب گزاروں اور یہ میرے بس میں نہ تھا، میری واپسی کے راستے اور دن متعین ہو چکے تھے..جب اُن کا بیٹا انہیں سہارا دے کر گاڑی میں بٹھا رہا تھا اور مجھے بتا رہا تھا کہ تارڑ صاحب! ابو آپ سے ملاقات کرنے کے اتنے تمنائی تھے کہ جب انہیں خبر ملی کہ آپ کوپن ہیگن آ رہے ہیں تو ان کی مسرت دیدنی تھی اور بس آپ کی باتیں کرتے رہتے تھے..

''بیٹے اپنے باپ کا خیال رکھنا..یہ ایک بڑا آدمی ہے..'' رخصت ہوتے ہوئے میں نے اُس سے کہا..

اور برف کمینی ایسی رُوسفید تھی کہ گرتی چلی جاتی تھی..

اس جذباتی تقریب سے واپسی پر برف اور صدف کی باتوں کا تسلسل جاری تھا..میں نے سوچا کہ یہ کیسی شاعرہ ہے کہ اس نے ابھی تک حرام ہے کسی نہ کسی بہانے مجھے اپنا ایک مصرع بھی سنایا ہو..کہ تارڑ صاحب کیا خوب یاد آیا کہ ناچیز نے ان موسموں کے حوالے سے ایک ایسا شعر کہا تھا بلکہ کہا کہاں تھا سرزد ہو گیا تھا...اس کی شان نزول کے بارے میں کیا عرض کروں کہ بس میں کہاں اور میری شعری کائنات کہاں..یہ شعر ایک الہام کے طور پر مجھ سے اترا تھا..اگر اجازت ہو تو سمع خراشی کرتے ہوئے گوش گزار کر دوں... یا پھر..تارڑ صاحب آپ کی تقریر دل پذیر سنتے ہوئے ایک شعر آپ کی عظمت کے حوالے سے نازل ہو گیا..عرض کرتی ہوں..شاعر خواتین وحضرات کے بارے میں میرا ذاتی تجربہ ہے کہ اگر کسی محفل میں وہ تادیر شعر نہ سنا سکیں تو انہیں اپھار ہو جاتا ہے اور یہ کیسی شاعرہ تھی کہ دنیا جہان کی باتیں کیے جاتی تھی، ہر بڑے شاعر کی شناس اور رسیا تھی اور اس کے باوجود مجال ہے کہ..یہاں تک کہ مجھے تشویش سی ہونے لگی کہ یہ وہ والی صدف نہیں جس کی شاعری کے چرچے میں نے سُن رکھے تھے..چنانچہ جب میں نے بہت ہی اصرار کیا تو اُس نے ایک قطعہ سنایا جو واقعی عمدہ شاعری کا مظہر تھا

''ریڈیو، ٹیلی ویژن اور پھر ایک یادگار انٹرویو''

اس دوران کچھ اخباری، ریڈیائی اور ٹیلی ویژنی انٹرویو بھی ظہور پذیر ہوئے جن کی نگرانی صدف بی بی کرتی تھی.. براہ کرم یہ مت سمجھ بیٹھئے گا کہ یہ کوئی انہونی پذیرائی تھی اور میں کوئی ایسا نامور ادیب اور میڈیا پرسن تھا کہ مجھے اس قابل سمجھا گیا..

یورپ کے دیگر ملکوں کی مانند ڈنمارک میں بھی یہاں کے پاکستانی نژاد لوگ منتظر رہتے ہیں کہ کوئی تو ہمارے وطن سے آئے.. بے شک کوئی تین نمبر سیاستدان.. دو نمبر عالم دین، کوئی مسخرہ شاعر یا ٹیلی ویژن سکرین پر نمودار ہونے والا کوئی بھی بیہودہ اگرچہ شناسا شخص آئے تو ہم اپنے وطن کی چاہت میں اُسے سر آنکھوں پر بٹھالیں.. اور وہ یوں اُس اداسی اور بے گھری کا مداوا کرتے ہیں جو پاکستان سے دُوری کی کسک میں اُن کے رگ و پے میں اترتی ہے..

ڈنمارک کا اولین اردو ریڈیو سٹیشن ایک ایسے تہہ خانے میں پوشیدہ تھا جس میں اترنے والی آہنی سیڑھیاں برف آلود تھیں.. ہم اُن پر احتیاط سے پاؤں دھرتے تھے، پھر بھی پھسلتے تھے..

ظہور ملک ایک مؤثر ریڈیائی میزبان تھا کہ تارڑ صاحب.. اس وقت ڈنمارک کے طول و عرض میں جتنے بھی پاکستانی قیام پذیر ہیں، وہ ہماری نشریات سے کان لگائے بیٹھے ہیں وغیرہ..

انٹرویو پینل میں ظہور کے محترم والد صاحب.. ایک حاجی صاحب بھی تشریف فرما تھے.. بہت برس پہلے انہی حاجی صاحب نے اس اردو ریڈیو سروس کا آغاز کیا تھا کہ.. بقول اُن کے کلچرل منسٹری ایسے پاکستانی اور ڈینش رابطوں کے لیے مالی تعاون کیا کرتی تھی..

انٹرویو کے دوران حاجی صاحب یکدم مجھ سے فرمائش کر دیتے کہ ابھی تک آپ نے کوئی شعر نہیں سنایا تو سنا دیجیے.. تو میں عرض کرتا ہوں کہ حاجی صاحب میں شاعر نہیں ہوں تو وہ اپنی معصومیت میں کہتے.. اچھا..! تھوڑی دیر بعد شاید پھر بھول جاتے اور کہتے تارڑ صاحب! کوئی شعر تو سنا دیجیے.. میں

گوالمنڈی میں واقع اپنی بیجوں کی دکان پر گزارا ہے اور یہ جو معروف سردار صاحب تھے، ایک موٹے، میلی کچیلی بنیان میں ملبوس جس نوعیت کے تیل میں اپنے پسینے کے علاوہ مچھلی فرائی کیا کرتے تھے، اُس میں اگر ایک کاکروچ بھی فرائی کیا جاتا تو وہ بھی ایک مچھلی کے ذائقے والا ہو جاتا.. دارالماہی کی کڑاہی پر جو صاحب براجمان ہوتے تھے، مچھلی تلتے تھے اُن کے گال ہمیشہ پھولے ہوئے ہوتے تھے کہ وہ کوکین کی شیدائی اپنے کلّے میں ایک بیڑا پوشیدہ رکھتے تھے..

چنانچہ مچھلی فرائی کرنے کی اس لاہوری روایت کے بعد جب اس ڈنمارکی تلی ہوئی مچھلی کو چکھا تو تالو میں ذائقے کی جتنی بھی کونپلیں تھی سب کھل گئیں..

اُس شب میں.. کبھی میمونہ دبے پاؤں اٹھتی اور مستطیل کھڑکی کے سامنے جا کھڑی ہوتی اور کبھی میں چوری چوری کہ آہٹ سے اُس کی نیند نہ کھل جائے اپنے بستر سے الگ ہو کر اُس کھڑکی کے باہر جو سفید سکوت میں آیا ہوا برف کا منظر تھا اُسے اپنی آنکھوں میں جذب کرتا.. مسکراتا جاتا..

ہم دونوں ہی دماغ کے خلل کے عارضے میں مبتلا ہو چکے تھے..

♦♦.....♦♦.....♦♦

یہ دونوں انٹرویوز اپنی جگہ لیکن سب سے ''یادگار'' جو بُھلانے سے نہیں بُھولتا ایک اور انٹرویو تھا..

جس ''یادگار'' انٹرویو کو میں بھلانے سے نہیں بھولتا یہ کوپن ہیگن میں مقبول بھٹی جنہیں دیکھ کر اکثر لوگ کہتے ہیں کہ قبول ہے قبول ہے کے مقدس دفتر میں ظہور پذیر ہوا جہاں وہ مقامی مومنین کے لیے حج اور عمرے کے بندوبست کرتے ہیں اور دفتر کی دیواروں پر آویزاں اُن کی تصاویر اس امر کی غمازی کرتی ہیں کہ وہ مقامات مقدسہ کی زیارت ذاتی طور پر بھی کرتے رہتے ہیں.. بھٹی صاحب نے ازراہ خلوص مجھے اپنی آپ بیتی بھی مرحمت فرمائی جسے پڑھتے ہوئے میرے چودہ طبق اُن کی شعلہ بیانی سے روشن ہو گئے.. بھٹی صاحب جانے کہاں کہاں بھٹکتے مدتوں پہلے ڈنمارک میں وارد ہو گئے، کتاب کے سرورق پر بھٹی صاحب ٹاؤن ہال کے قریب ہانز کرسچن اینڈرسن کے مجسمے کے ساتھ نہایت فاتحانہ انداز میں کھڑے ہیں اور یوں لگتا ہے کہ اینڈرسن اُن کی بھاری بھرکم شخصیت کے دبدبے میں آ کر ابھی اپنے پیڈسٹل سے اتر کر راہِ فرار اختیار کر لے گا.. بھٹی صاحب نے اپنی آپ بیتی کے آغاز میں یہ بھی لکھا ہے کہ اُن کی آبائی حویلی کئی میلوں میں محیط تھی.. یقیناً یہ برصغیر کی بڑی حویلیوں میں شمار ہوتی ہوگی اور یہ کتنا عظیم المیہ ہے کہ انسان میلوں میں محیط ایک حویلی کو ترک کر کے ڈاک کے ٹکٹ جتنے ایک ڈنمارک نامی ملک میں رہائش پذیر ہونے پر مجبور ہو جائے.. میری تمام تر ہمدردیاں بھٹی صاحب کے ساتھ ہیں کہ وہ ایک معصوم اور ہمدرد خصلت کے انسان تھے..

اُن کے دفتر میں یہ ''یادگار'' انٹرویو تاریخ کے صفحات میں رقم ہوا... میں ''سحار اٹائمز'' کا ایک زرق برق شمارہ دیکھ چکا تھا اور یہ ایک مناسب کمرشل پاکستانی خصلت کا قدرے بھڑکیلا میگزین لگتا تھا جس کے لیے انٹرویو دینے میں کُچھ ایسا حرج بھی نہ تھا اور یوں بھی یہ صدف تھی جو میرے راستے متعیّن کرتی تھی..

بھٹی صاحب کے دفتر کا دروازہ یکدم چوپٹ کر کے ایک صاحب اندر آئے۔ اُن کی صورت شکل کُچھ غیر واضح سی تھی.. وہ کُچھ بھی ہو سکتے تھے.. واش رُوم کا ٹپکتا ہوا کموڈ ٹھیک کرنے والے.. دفتر کے قالین کو صاف کرنے والے.. کسی مدرسے کے لیے چندہ جمع کرنے والے.. لیکن وہ یہ سب کچھ بھی تو نہ تھے.. میرے سامنے کرسی کھینچ کر یوں بیٹھے جیسے ایک مجرم کے سامنے گستاپو کا ایک افسر بیٹھتا ہے اور سب سے پہلے یعنی سلام دعا کے بعد انہوں نے مجھ پر ایک نظر حقارت ڈالتے ہوئے بیان دیا کہ دراصل میں

پھر وہی توجیہہ پیش کرتا تو وہ اُسی معصومیت سے کہتے...اچھا! بہر طور ظہور ملک ایک براڈ کاسٹر کے طور پر مجھے بھلا لگا، مناسب الفاظ اور بیان میں مناسب روانی..

ایک دوپہر مجھے مطلع کیا گیا کہ اردو ٹیلیویژن کے لیے آپ کا ایک طویل انٹرویو ریکارڈ کیا جائے گا..ہم یعنی ڈرائیور کی نشست پر اپنے گلدستے والے زبیر صاحب اور صدف بی بی..میمونہ ہوٹل میں رہ گئی تھی اور اُس مستطیل کھڑکی کے برف منظر سے چپکی ہوئی رہ گئی تھی..ہم بقول کسے گاہے بگاہے چلتے..چلتے چلے گئے..ایک بے آباد سا علاقہ آیا اور ہماری کار عمارتوں کے پچھواڑے میں چلتی ایک اور پچھواڑے میں جا رُکی..کوئی مخدوش سا مقام تھا..دوسری منزل تک جانے والی آہنی سیڑھیاں ایک تو برف کے جماؤ کی وجہ سے کیلے کے چھلکے ہو رہی تھیں اور اُن میں جھکاؤ نام کو نہ تھا تقریباً عمودی حالت میں تھیں چنانچہ اُن پر چڑھنے والا شخص اگر میری عمر کا ہو تو وہ براہ راست سیدھا اوپر سدھار سکتا تھا..جس کمرے میں ہمارا ورود ہوا وہ اپنی ابتری اور بے ترتیبی میں بے مثال تھا، اک بھانت بھانت کی اشیاء کا عجائب خانہ تھا..بڑے بڑے ضخیم صوفے تھے جن پر چوہدری سرور اور ایک باریش شخص استراحت فرماتے تھے اور اُن کے سامنے غالباً ایک میز تھی جو دیگر اشیاء کے علاوہ ایک جہازی سائز کے پیزے سے ڈھکی ہوئی تھی..ہر دو حضرات نے ہمیں داخل ہوتے دیکھ کر ہماری پل دو پل پذیرائی کی اور پھر سے پیزے کا سائز کم کرنے کی جدوجہد میں مشغول ہو گئے..ایک جانب اوپر تلے کچھ ٹیلی ویژن، کمپیوٹر اور عجیب سی مشینری پڑی تھی جو کہ اردو ٹیلیویژن کا ریکارڈنگ سٹوڈیو تھا..اور...دیواروں پر کُچھ مذہبی پوسٹر تھے..طُغرے اور مولانا طاہر القادری کی مختلف لوگوں کے ہمراہ بصیرت افروز نورانی تصاویر سجی تھیں..یہ عجیب سا کمبی نیشن تھا یعنی ٹیلی ویژن سٹوڈیو..ایک جہازی سائز کا پیزا اور مولانا..معلوم ہوا کہ یہ عمارت مولانا کی ذاتی ملکیت ہے اور یورپ کے دیگر ممالک میں بھی اس نوعیت کی نورانی جائیدادیں مولانا کے زیر سایہ پنپتی ہیں..کینیڈا میں تو شنید ہے کہ ایسے سلسلے بہت وسیع و عریض ہیں..

ریکارڈنگ رُوم میں صدف بی بی خاصی پاؤڈر شدہ میرے سامنے یوں براجمان ہوئیں کہ اُن کے ڈیسک پر میری درجنوں کتابیں بکھری ہوئی تھیں..ایک سفید کوٹ میں وہ خاصی پُرکشش لگ رہی تھیں لیکن..قدرے بے چین سی تھیں اور ہم دونوں کے سامنے ایک کیمرہ تو اپنے پاؤں پر کھڑا ساکت تھا اور دوسرے کیمرے کو زبیر صاحب سنبھال رہے تھے..کیسا ہر فن مولا ہی مولا شخص تھا..

یہ صاحب ''سحار اٹائمز'' کے ایڈیٹر اِن چیف تھے..

میں قطعی طور پر مبالغہ نہیں کر رہا لیکن میرا سبزی والا اللہ رکھا ان عدیم الفرصت صاحب کی نسبت ایک ژاں پال سارتر تھا.. بلکہ حکیم افلاطون تھا۔ کاش وہ بھی کسی نہ کسی طرح ڈنمارک سمگل ہو جائے اور ان صاحب کے مقابلے میں آ کر ایک میگزین کا ایڈیٹر اِن چیف ہو جائے اور چار نہیں بلکہ آٹھ آٹھ گھنٹے کے انٹرویو کرے..

یورپ کے بیشتر ملکوں اور کینیڈا وغیرہ میں حکومت غیر ملکی آبادکاروں کی ثقافت اور ادب کی ترویج کے لیے مناسب رقوم مہیا کرتی ہے تا کہ یہ لوگ اپنے نئے ملک میں اپنی تہذیب کو متعارف کروا کے بہتر شہری ثابت ہوں.. ظاہر ہے وہ خواہش کرتے ہیں کہ اُن کی تہذیب اور ادب سے بھی یہ نئے شہری آگاہ ہو کر اُن کے تہذیبی دھارے میں شامل ہو جائیں.. ہالینڈ میں خالد فاروق نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ڈچ ادب کے اردو تراجم کرتا ہے اور اگر ایک برس وہ صرف ایک ناول کا ترجمہ کرتا رہے تو اس کا معاوضہ اُس کی تمام تر ضرورتیں پوری کرنے پر قادر ہوتا ہے.. ڈنمارک میں بھی ادبی مزاج رکھنے والے پاکستانیوں کو اسی نوعیت کی سہولت ہے.. ڈینش حکومت اُن پاکستانیوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے جو ڈینش ناولوں کو اردو میں ڈھال کر انہیں پاکستانی عوام سے روشناس کروا سکیں اور اس کام کے لیے اُنہیں بہت مناسب سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں.. چنانچہ جہاں کینیڈا، ہالینڈ یا ڈنمارک میں تخلیقی ذہن رکھنے والے ادیب اور صحافی گراں قدر خدمات سرانجام دیتے ہیں وہاں صرف آسان کمائی کرنے کی غرض سے اس شعبے میں کُچھ گُھس بیٹھیے بھی گُھس آتے ہیں اور ان سہولتوں سے باآسانی لطف اندوز ہوتے ہیں اور ایسے ''ادیب'' اور ''صحافی'' کثرت سے ادبی اور تحقیقی کاموں میں مستغرق ہوتے ہیں.. ٹورنٹو میں مجھے کسی صاحب نے فون پر رابطہ کیا کہ جناب عالی میں فلاں امریکہ سے شائع ہونے والے اردو ویکلی اخبار کا ٹورنٹو میں بیورو چیف ہوں تو کچھ وقت دیجیے میں اپنے فوٹو گرافر کے ہمراہ آپ کا انٹرویو کرنا چاہتا ہوں.. اُن صاحب کے لب و لہجے سے قطعی طور پر اندازہ نہ ہوتا تھا کہ لکھنے پڑھنے سے اُن کا کچھ شغف ہے تو میں نے اپنے دوست اشفاق حسین سے تذکرہ کیا کہ یہ کیا معاملہ ہے تو اشفاق کہنے لگا.. بے شک شمالی امریکہ سے شائع ہونے والے دو تین اخبار خاصے معتبر ہیں اور کثیر تعداد میں چھپتے ہیں لیکن.. سب تو نہیں امریکہ اور کینیڈا میں اکثر ایسے حضرات کو بیورو چیف مقرر کیا جاتا ہے جن کی واحد کوالی فیکیشن

ایک بے حد مصروف شخص ہوں، میرے پاس وقت کم ہے.. مجھے یہاں سے فارغ ہو کر پتہ نہیں کہاں جانا ہے تو سوال مختصر کروں گا.. ویسے تو میں چار چار گھنٹے انٹرویو کر سکتا ہوں لیکن میرے پاس وقت کم ہے تو آپ پیدا کہاں ہوئے تھے..

میں نے اُنہیں بتایا کہ میں کہاں پیدا ہوا تھا یعنی مجھے تو ہرگز نہیں پتہ کہ میں کہاں پیدا ہوا تھا، بہت بعد میں مجھے بتایا گیا کہ میں کہاں پیدا ہوا تھا اور بزرگوں کی باتوں کا اعتبار کرنا پڑتا ہے..

ازاں بعد سوال ہوا کہ کیا آپ نے وہ محاورہ سُنا ہے کہ ہر چمکتی ہوئی چیز سونا نہیں ہوتی..

میں نے عرض کیا کہ... جی سُنا تو ہے..

تو وہ مسکراتے ہوئے بولے.. تو پھر..

تو پھر کیا.. میں چکرا گیا..

تو پھر یہی.. اور اُنہوں نے بھٹی صاحب کے دفتر میں موجود اُن کی آل اولاد اور دیگر حضرات کی جانب ایک فاتحانہ انداز میں دیکھا اور اُن سے مخاطب ہو کر کہنے لگے.. کیسا سوال پوچھا ہے.. دوبارہ میری جانب متوجہ ہوئے، اگر آپ نے یہ محاورہ سُنا ہے تو آپ کا کیا خیال ہے.. میں نے نہایت تحمل سے عرض کیا کہ ویسے تو ہر چمکتی ہوئی چیز سونا نہیں ہوتی لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ وہ چمکتی ہوئی چیز سونا ہی ہو.. انہوں نے ذرا ناگواری کا اظہار کیا کہ یہ کیا جواب ہے اور پھر اُنہوں نے ایک نہایت فلسفیانہ سوال کیا کہ میں خوب جانتا ہوں کہ آپ پاکستان کی ایک مشہور شخصیت ہیں لیکن آپ کرتے کیا ہیں؟ جلدی سے بتائیں، اگر آپ کے پاس وقت کم ہے تو میں بھی ایک فارغ شخص نہیں ہوں.. عام حالات میں چار چار گھنٹے کے انٹرویو کرتا ہوں.. اچھا یہ بتایئے کہ پاکستان کے سارے سیاستدان کرپٹ اور بے ایمان ہیں تو کیوں ہیں.. میرا بلڈ پریشر خطرناک حد تک بلند ہو رہا تھا، لیکن میں نے ضبط کیا کہ نہیں بابا نہیں تم دیارِ غیر میں ہو۔ یہاں صبر کا دامن نہیں چھوڑنا، ہرگز اشتعال میں نہیں آنا تو میں نے عرض کیا کہ قبلہ ہمارے سب سیاستدان ہرگز کرپٹ نہیں تو وہ صاحب قدرے طیش میں آ کر کہنے لگے، بحث کرنی ہے؟ میں چپ رہا تو حاضرین کو متوجہ کرتے ہوئے بولے.. کیوں کیسا سوال پوچھا ہے..

اس ''یادگار'' انٹرویو کے خاتمہ بالخیر کے بعد رخصت ہوتے ہوئے انہوں نے مجھ پر ایک اور نظر حقارت ڈالتے ہوئے کہا.. آپ کے پاس وقت کم ہے تو میں بھی فارغ نہیں ہوں.. چار چار گھنٹے انٹرویو کر سکتا ہوں..

برداشت کرتے چلے جاتے ہو ورنہ.. پُرانے زمانوں میں کم از کم تم واک آؤٹ کر جاتے یا زیادہ سے زیادہ اُس موصوف کو ایک جھانپڑ رسید کر دیتے..

ویسے مجھے شک ہوا کہ بیگم میری ایسی درگت بننے پر قدرے پر مسرت ہے لیکن وہ نادان عورت نہیں جانتی تھی کہ پاکستان واپسی پر دیگر ادیبوں کو حسد میں مبتلا کرنے کے لیے میں ڈینگیں ماروں گا کہ میں تو وہ ہوں جس کا تفصیلی انٹرویو اور وہ بھی ایک ایڈیٹر اِن چیف کے ساتھ، ڈنمارک کے ایک مؤقر جریدے میں شائع ہوا ہے.. اگرچہ یہ انٹرویو چار گھنٹے کا نہ تھا..

♦♦.....♦♦.....♦♦

پاکستانی یا ہندوستانی کاروباروں کے اشتہارات حاصل کرنا ہوتا ہے..اگر آپ مناسب تعداد میں اخبار کے لیے اشتہار..بے شک منت سماجت کر کے..چرب زبانی سے یا رابطوں سے حاصل کر سکتے ہیں تو آپ کی نوکری پکّی ہے..اور یہ اشتہار..سبزیوں کے سٹور..حلال گوشت کی دکانیں..خواتین کے ملبوسات تیار کرنے والے درزی..حجام حضرات جو اپنے آپ کو ڈائریکٹر آپریشنز کا نام دیتے ہیں..حلوے پُوری شاپس کے..حلوائیوں اور پہلوانوں کے..پاکستان سے آنے والے تعویذ گنڈا کرنے والوں..کالے علم کے جادوگروں اور قوت مردی کو خاندانی نسخوں سے بحال کرنے والے حکیموں وغیرہ کے ہوتے ہیں..یقین کیجیے تو اہم پرستی اور ہولناک جہالت کے مرکز ایسے تو پاکستان کے کسی گاؤں یا قصبے میں نہیں ہیں جیسے ماشاءاللہ..بریڈفورڈ، اوسلو، نیویارک، لنڈن یا کوپن ہیگن میں ہیں..

علاوہ ازیں اس ''صحافی'' بیورو چیف کے فرضِ منصبی میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ اپنے اخبار کا تازہ ترین شمارے کا بنڈل ایئرپورٹ سے وصول کر کے اپنی ویگن کے پچھلے حصے میں ڈال کر شہر کے تمام پاکستانی سٹوروں اور دکانوں اور ریستورانوں کے باہر اُنہیں عوام الناس کی سہولت کے لیے تہہ در تہہ ڈھیر کرتا چلا جائے کہ ان اخبارات کو مفت میں تقسیم کیا جاتا ہے..ایسے اخباروں میں جہاں پاکستان اور اُن ملکوں میں مقیم مؤقر کالم نگاروں کے کالم اشاعت پذیر ہوتے ہیں، وہاں اخبار کا پیٹ بھرنے کے لیے جنسی طور پر ناآسودہ ہاؤس وائفوں اور ہماشما مقامی دانشوروں کے ارشادات بھی کہ یہ سب بلا معاوضہ حاصل ہو جاتے ہیں، شائع کیے جاتے ہیں..ادبی محفلوں میں جب ان نابغۂ روزگار ہستیوں کا تعارف کروایا جاتا ہے کہ یہ ہیں وہ صاحب..یا ان سے ملیے..یہ وہ ہیں تو میرے جیسے کم علم لوگ شرمندہ ہو جاتے ہیں کہ یہ حیات کیسی رائیگاں گئی کہ کبھی ان صاحبہ یا صاحب کا نام بھی نہیں سنا..اور جب آپ بصد خجلت معذرت کرتے ہیں کہ سوری..تو ازاں بعد وہ اپنے آئندہ کالم میں آپ کی شخصیت اور ادب کے پرخچے اڑا دیتے ہیں..اور میں ایسے لوگوں سے بے حد ہمدردی رکھتا ہوں کہ اُنہیں جینے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ تو درکار ہے..کہ جنسی طور پر ناآسودہ گھریلو خواتین اخباروں میں کالم نہ لکھیں تو اور کیا کریں..

تو ہم پلٹتے ہیں اُس ''یادگار'' انٹرویو کی طرف جس کے دوران میمونہ بھٹی صاحب کے دفتر کے عقبی کمرے میں ایک خاتون کی رفاقت میں چائے سے لطف اندوز ہو رہی تھی..وہ باہر آئی تو اُس کی مسکراہٹ قابو میں نہ آتی تھی..کہنے لگی، جہالت کے ساتھ اگر خود اعتمادی شامل ہو جائے تو یہی کچھ ہوتا ہے۔میں سب کچھ سُن رہی تھی اور آج میں تمہارے صبر کی قائل ہو گئی ہوں...شاید یہ تمہارے حج کا کرشمہ ہے کہ تم

اُس ''تاریخی'' انٹرویو کے بعد یہ طے ہو چکا تھا کہ ہم ہلنسور کی جانب سفر کریں گے جہاں میں نے ''نکلے تری تلاش میں'' کے زمانوں میں ایک شب بسر کی تھی اور اُس قدیم قلعے کی دیوار پر قدم رکھا تھا جہاں گئے زمانوں میں راتوں کو اپنے باپ کے قتل پر پشیماں پرنس ہیملٹ ٹہلتا تھا.. جہاں ایک روایت کے مطابق ولیم شیکسپیئر نام کا ایک معمولی اداکار قلعے کی سٹیج پر نمودار ہو کر مکالمے ادا کرتا تھا اور پھر بہت بعد میں یہ قلعہ اور اس کا ماحول اُس کے ڈرامے ''ہیملٹ'' کا پس منظر ہوا..اور شیکسپیئر کے ہزاروں مکالموں میں سے سب سے زیادہ زبان زدِ عام..ایک کھوپڑی سے مخاطب ہوتے..ٹُو بی آر ناٹ ٹُو بی.. ہوا اور یہی وہ سٹیٹ آف ڈنمارک تھی جس کے بارے میں شیکسپیئر نے ایک لازوال ڈائیلاگ تخلیق کیا جو آج کے پاکستان پر کیسا منطبق ہوتا ہے کہ..دیئر از سَم تھنگ راٹن ان دے سٹیٹ آف ڈنمارک.. ڈنمارک کی ریاست میں کُچھ ایسا ہے جو گل سڑ چکا ہے..بدبودار ہو چکا ہے..چنانچہ دیئر از سم تھنگ راٹن اِن دے سٹیٹ آف پاکستان..اور سیاستدان..جنرل..بیوروکریٹ..صنعت کار..مذہبی لبادوں میں روپوش مذہب کے سوداگر..سب کے سب..اس سٹیٹ آف پاکستان میں بدبودار ہو رہے ہیں.. لیکن..صدف اور دیگر احباب نے صدق دل سے مجھے ڈرایا کہ تارڑ صاحب..برفباری میں شدت آ گئی ہے..کیا جانئے کہ ہلنسور کے قلعے سے واپسی پر تمام راستے برف میں دفن ہو جائیں، ہم کوپن ہیگن واپس نہ آ سکیں، وہیں ''ٹُو بی آر ناٹ ٹُو بی'' کا ورد کرتے ٹھٹھر کر مر جائیں..ہمیں تو عادت ہو چکی ہے ان موسموں کی لیکن آپ اتنے بوڑھے ہو چکے ہیں کہ اگر آپ ہمارے مُنہ میں خاک خدانخواستہ سردی سے فوت ہو جائیں تو ہم کیا کریں گے..آپ ہمارے ملک کا سرمایہ ہیں، آپ منجمد ہو گئے تو ہم کسی کو مُنہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے..غرض کہ اُنہوں نے مجھے خوب ڈرایا اور میں اُن کا دل رکھنے کی خاطر ڈر گیا..واقعی اس سٹیٹ آف ڈنمارک میں کچھ نہ کچھ ہو رہا تھا..کوئی بھید تھا جو میری سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ یہ میرے مہربان، قدردان میزبان آخر کیوں مجھے ہلنسور لے جانے سے ہچکچا رہے ہیں، مجھے بے وجہ ڈرا رہے ہیں..کہیں نہ کوئی پردہ داری تھی..تب میں نے بے بس ہو کر فریاد کی کہ ظالمو اگر تم مجھے ہیملٹ کی رُوح سے نہیں ملا سکتے تو پھر مجھے سویڈن ہی لے چلو..اُس سرزمین پر دو چار ٹھنڈے سانس لے کر ہی واپس آ جائیں گے جہاں میرا یار قدیم ریاض چیمہ اور ماگریتا اگر وہ اب تک فوت نہیں ہو گئی، رہتے ہیں۔ چلتے ہو تو سویڈن ہی کو چلیے چاہے ہاتھ لگانے کے لیے ہی چلئے..صدف اور ملک میری آہ وزاری کی تاب نہ لا کر قدرے آبدیدہ ہونے کو آئے اور ہم سویڈن کے مسافر ہو گئے..

''دیئر از سم تھنگ راٹن اِن دے سٹیٹ آف ڈنمارک''

''ہلسنور (ڈنمارک) کی کیمپنگ سمندر کے کنارے کرون برگ قلعے کے پہلو میں تھی۔ میں اپنا خیمہ نصب کر کے اِس قدیم شہر کی سیر کو نکل گیا۔ رات واپس آیا تو ساحل کے ساتھ کرون برگ قلعہ کی کائی زدہ دیواریں، تانبے کی چھت، گُنبد اور مینار آسیب زدہ لگ رہے تھے۔ قلعے کی پوری عمارت دُھند میں لپٹی ہوئی تھی۔ کسی زمانے میں یہاں ایک خونیں ڈرامہ کھیلا گیا تھا۔ سلطنت کے لیے ایک قتل ہوا اور پھر مقتول بادشاہ کی رُوح سرِ شام اسی قلعہ کی دیوار پر نمودار ہوتی اور اپنے بیٹے ہیملٹ کو انتقام پر ابھارتی۔ ہیملٹ جو ڈنمارک کا شہزادہ تھا اور جسے شیکسپیئر نے لازوال کر دیا۔ بہر حال یہ سارا واقعہ ایک ادبی اختراع ہے۔ اصلی ہیملٹ شاید ہیلنسور کے نام سے بھی ناواقف تھا۔ جب فریڈرک دوم نے کرون برگ قلعہ تعمیر کروایا ہیملٹ اُس سے سات سو برس پیشتر مورس کے جزیرے میں دفن ہو چکا تھا۔ اس کا نام آملتھ تھا۔ ایک قبائلی سردار کا اکلوتا بیٹا۔ سرداری کے لالچ میں آملتھ کے چچا نے اُس کے باپ کو قتل کر ڈالا۔ اس گھناؤنے جرم میں اس کی ماں بھی شامل تھی۔ انیس سالہ آملتھ سارا دن قلعہ کے آتشدان کی ٹھنڈی راکھ کریدتا رہتا اور ہر سوال کا جواب ایسے دیتا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔ ایک شب اُس نے اپنے چچا کے محافظ کو شراب پلا کر مدہوش کر دیا اور چچا کو قتل کر کے سردار بن بیٹھا۔ 1200ء میں ساکسو گراماٹیکس نامی ایک ڈنیش نے اس واقعے کو کہانی کا روپ دیا۔ 1601ء میں لنڈن کے گلوب پلیئرز کرون برگ قلعہ میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے آئے۔ ان میں ایک گمنام ایکٹر شیکسپیئر نام کا تھا۔ شیکسپیئر نے اس ڈنیش کہانی کو ڈرامے کی صورت میں لکھا مگر جائے واقع مورس کے جزیرے سے ہیلنسور کے کرون برگ قلعہ میں تبدیل کر دی۔ حقائق سے قطع نظر رومان پسندی اب بھی قلعہ کی دیواروں پر ہیملٹ کے باپ کی روح دیکھ لیتی ہے بلکہ شہر والوں نے سیاحوں کی تسلی کے لیے یہاں ہیملٹ کی قبر بھی بنوا رکھی ہے۔'' (''نکلے تری تلاش میں'')

باعث گزرتی ہی چلی گئی..سویڈن کی سرزمین میں داخل ہوئے تو محسوس ہوا کہ یہاں ڈنمارک کی نسبت برفباری کچھ زیادہ ہی شدید ہوئی تھی کہ سوائے شاہراہ کے آس پاس سارے کا سارا برف کی سفیدی میں روپوش تھا..میمونہ کا مشاہدہ تھا کہ کار کے اندر بیٹھے ہوئے برف کو دیکھ دیکھ کر ٹھٹھرتے ہوئے جتنا بھی سویڈن نظروں کے سامنے سے گزرا تھا، وہ ڈنمارک کی نسبت زیادہ کشادہ، خوش نظر اور سٹائلش تھا...

♦♦.....♦♦.....♦♦

کار میں صدف بی بی کی مسلسل باتوں کی گرمی تھی جو شاہراہ کے آس پاس برف میں ملفوف گھروں اور گھنے جنگلوں میں سرایت کرتی اُنہیں پگھلاتی تھی..

''گویا اب ہم ڈنمارک کے ساحل سے ایک فیری پر سوار ہو کر سویڈن کے شہر مالمو میں جا اتریں گے.. کتنی مسافت ہوگی؟'' میں نے صدف سے دریافت کیا۔

''تارڑ صاحب آپ تو زمانہ قبل از مسیح کی باتیں کرتے ہیں، اتنی قدیم رُوح ہیں ماشاءاللہ.. وہ فیری میں سوار ہو کر مالمو جانا تو کب کا متروک ہو چکا.. اب تو ڈنمارک اور سویڈن کے درمیان سمندر کے نیچے ایک شاہراہ سُرنگ ہے، پھر ایک طویل پُل ہے اور ہم ڈرائیو کرتے ہوئے اُس پار مالمو میں چلے جائیں گے..''

میں ان کفار کی حرکتوں سے بے حد عاجز آ چکا تھا، بھلا یہ چین سے کیوں نہیں بیٹھتے.. ڈوور کی سفید چٹانوں کے سائے میں ایک سٹیمر پر سوار ہو کر رود بار انگلستان عبور کرنا کبھی فرانس کے شہر کیلے میں جا اترنا اور کبھی بیلجیم کی بندرگاہ آسٹنڈ پر قدم رنجہ فرمانا کیسا رومان کی گیلی دھند میں ملفوف ایک ہیجان خیز تجربہ ہوا کرتا تھا۔ کم بختوں نے رود بار انگلستان کی تہہ میں ایک حیرت انگیز سُرنگ تعمیر کر کے اس رومان کا ستیاناس کر دیا.. پاسکل سے ملاقات تو ڈوور سے رواں ہونے والے سٹیمر پر ہی ممکن تھی.. اور اب انہوں نے ڈنمارک سے مالموتک جانے والی فیری کو بھی اپنی تکنیکی مہارت سے ڈبو کو ایک سرنگ اور ایک پُل تعمیر کر دیا ہے تو یہ کفار کبھی بخشے نہیں جائیں گے کہ انہوں نے میرے ماضی کے سٹیمروں اور فیریز کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا ہے.. چنانچہ ہم براہ راست ایک ایسی طویل سرنگ میں داخل ہو گئے جس کے اوپر سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور اُس سمندر میں جانے کیسے کیسے آبی جانور وغیرہ سوئمنگ کر رہے ہوں گے اور وہ نہیں جانتے تھے کہ اُن کے اجسام کے نیچے تہہ کے نیچے ایک ایسا جانور چلا جاتا ہے جس کے پیٹ میں ایک عدد باتیں کرتی صدف موتی ہے.. ایک عمر رسیدہ مگر مچھ ہے جس کے جبڑے ڈھیلے پڑ چکے ہیں، دانت کچھ بھی چبانے کے قابل نہیں اور اُس کی اہلیہ ہے اور ایک باریش ملک ہے جو اُنہیں سویڈن لے جا رہا ہے..

اُس زیر آب سُرنگ سے باہر آئے تو اُس سمندر پر محیط ایک تا حد نظر پُل چلا جاتا تھا.. جیسے ایک بچّے سے استاد نے کہا کہ لفظ کارگزاری کو فقرے میں استعمال کرو تو اُس نے فوراً کہا کہ.. ہم نے راوی کے پُل پر سے اپنی کارگزاری.. تو ہم نے بھی اُس پُل پر سے کارگزاری جو اُس کی طوالت کے

ہوتے تھے..

ہم فٹ پاتھ پر جمی ہوئی برف پر احتیاط سے پاؤں رکھتے چلتے ایک وسیع پارک کے پہلو میں سے گزرتے تھے اور وہ کیا ہی برف سناٹے میں روپوش ایک اور کرسمس کارڈ تھا... بلند قامت شجر سراسر برف کے لبادے اوڑھے.. پارک کے درمیان میں جو گزرگاہیں تھیں سب کی سب برف میں ڈوبی ہوئیں.. ذرا غور کیا تو وہاں قطار اندر قطار قبریں بھی برف کے سکوت میں تھیں.. یہ پارک نہ تھا ایک قبرستان تھا اور اس کے باوجود برفباری نے اسے اتنا دلکش کر دیا تھا کہ جی میں آتا تھا کہ یہیں مر جایئے.. بے شک روز حشر تک ٹھہرتے جایئے..

مالمو شہر کے مرکزی چوک میں پہنچے تو وہاں پھر سے معنک مجید امجد اپنی سائیکل پر چلا آتا تھا.. کہ برف گرتی تھی اور ساز بجتے تھے.. شہر میونخ میں نہیں شہر مالمو میں آج کرسمس تھی.. بے شک کرسمس میں ابھی پورے چھبیس روز باقی تھے لیکن یہاں اس تہوار کی تقریبات اور سرخوشی کا آغاز ہو چکا تھا.. اور یہاں اتنی رونق اور ہجوم تھا کہ بقول کسے کھوے سے کھوے چھلتا تھا.. چوک کے فرش پر ہزاروں دیئے روشن تھے جو برف کی سفیدی میں جھلملاتے تھے اور اُن کی لَو سے منوّر ہونے والے سویڈش چہرے کیسے اپنی دلکشی سے دل دریا میں اپنے حُسن کی کُنڈیاں ڈالتے تھے.. میں ایک مرتبہ پھر اُن سویڈش لڑکیوں کا گرویدہ ہو گیا جن کی خوش آثارگی اُن کی بھاری جیکٹوں اور اونی ٹوپیوں میں سے زور کرتی ظاہر ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ میمونہ بھی اُن کے حسن کی سحر انگیزی کی قائل ہو گئی....

سٹی سنٹر کے عین وسط میں واقع ایک فوارہ اور صد حیرت کہ اُس میں سے چھوٹتے پانیوں کے جھرنے سردی کی شدت میں برف کی آبشاروں میں کیوں نہ بدل جاتے تھے.. فوارے کے گرد چند سجے سجائے اور کرسمس کے سجاوٹوں سے بنے ٹھنے پستہ قد خچروں پر سوار چھوٹے چھوٹے بچے اور وہ بھی خوب ڈھکے ہوئے، فر کی ٹوپیوں میں سے اُن کے بھولے سفید گول مٹول چہرے، ناکیں اور گال سردی سے سُرخ ہوتے.. اُس فوارے کے گرد ہولے ہولے چکّر لگا رہے تھے، خچروں کے رکھوالے اپنے ننھے سواروں پر نظر رکھتے برابر میں چلتے ہوئے کہ کہیں وہ لڑھک ہی نہ جائیں اور اُنہیں دیکھ کر میرے دل کے اندر ایک ہُوک سی اٹھی کہ کاش سویڈن کی اس برف آلود رات میں جب کہ برف کی سفیدی اس رات میں دن کی ہلکی روشنی پھیلاتی تھی، میرے بچوں کے بچے یہاں ہوتے تو میں انہیں بھی ان پستہ قامت خچروں پر بٹھا کر اس فوارے کے گرد چکر لگاتا اور اُن کے برابر میں چلتا اُن کا خیال رکھتا.. نوفل

''سویڈن کی شب میں، میمونہ اور میں برف میں حنوط ہوتے ہیں''

مالمو کا ساحلی شہر شروع ہو گیا.. صرف شہر کی عمارتیں اور کوچہ و بازار دکھائی دیتے تھے، شہری کہیں دکھائی نہ دے رہے تھے.. مالمو کے سٹی سنٹر یا مرکز میں پہنچے، برف کے گالے پھر سے آسمانوں سے سفید ستاروں کی صورت میں گرنے لگے.. ہم دیکھ سکتے تھے کہ اگر سارا شہر ویران تھا تو اس لیے کہ ساری رونقیں یہاں امڈ امڈ کر آ رہی تھیں.. اور وہاں کسی فٹ پاتھ کے کنارے.. کسی پارکنگ لاٹ میں ایک کار تو کیا برف کا ایک گالا بھی پارک نہ ہو سکتا تھا، کچھ گنجائش نہ تھی.. ہم برف پوش گلیوں میں گھومتے پھرے.. چکر لگاتے رہے.. اور بالآخر کار پارک کرنے کے لیے دو گز زمین مل ہی گئی.. باہر نکلے تو سردی کے تیکھے برفیلے برچھے ہماری جیکٹوں، سویٹروں، ٹوپیوں، اونی زیر جامہ جات اور جرابوں کے آر پار ہو گئے.. درجہ حرارت ایک گنہگار کے اخلاق کی پستیوں سے بھی نیچے گر چکا تھا.. تب میمونہ کے دانت کٹکٹاتے جل ترنگ بجانے لگے اور اُس نے ہُو ہُو اللہ ہُو کرتے سرگوشی کی کہ میں نے سویڈن بہت دیکھ لیا ہے، میں تو کار میں بیٹھتی ہوں آپ دیکھ آیئے اپنا سویڈن، واپس آ کر بتا دیجئے گا کہ کیسا تھا.. میں آپ کے بیان پر یقین کر لوں گی.. میں نے اُسے بمشکل راضی کیا، اگرچہ وہ تو جوانی میں بھی راضی نہ ہوتی تھی پر آج راضی ہو گئی.. کار سے نکل کر ہم دو چار قدم چلے تو اُس قہر انگیز سردی کے باوجود ہمارے دل ایک ٹھٹھرتے ہوئے کنول کی مانند کھل گئے.. مسرت سے بھر گئے.. مالمو بھی ایک نہروں کی روانی سے لبریز شہر تھا اور ان نہروں کے کناروں پر جتنے بھی شجر اور نمائشی جھاڑیاں تھیں اور برف پوش تھیں، وہ اُن نہروں میں یُوں عکس ہوتی تھیں کہ اُن کے پانی بھی سفید ہوتے تھے.. نہروں پر کُبڑے ہوتے پُل سویڈن کی سنہری بالوں والی خوش بدن اور خوش لباس نازنینوں کے بدنوں کے بوجھ سے مزید کُبڑے

ایک ایسے ملک سے آیا تھا جہاں ہمارے بدن تنگ نظری اور عقیدے کے تعصّب کے زہر سے نیلے پڑ جاتے تھے.. جہاں کسی بھی تقریب یا تہوار پر پُرمسرت ہونا حرام قرار دیا جا چکا تھا.. ہم اگر وہاں خوش ہوتے تھے تو بھی احتیاط کرتے تھے کہ کہیں واعظ کو خبر نہ ہو جائے.. ہم نہ صرف کسی دائرے سے خارج کر دیئے جائیں بلکہ ہم پر کوئی تعذیر بھی لگ جائے.. کوئی فتویٰ نہ آ جائے..

یہ جو مسرت انگیز موسم ہمارے اردگرد پُر بہار ہوتے کھلتے تھے.. یہ جو کیف آور خوشی کی شرابیں ہر سُو چھلکتی تھیں، کرسمس کے رنگ جھلملاتے تھے اور ایک فوارے کے گرد پستہ قامت خچروں پر سوار بچوں کے چہروں کی کلیاں کھلتی تھیں، یہ سب موسم زندگی کی پُھولی ہوئی زرد سرسوں کی مسکراہٹوں کے اپنی جگہ.. لیکن دھیرے دھیرے ہم سردی کی شدت اور ابھی تک گرتی برف کے عذاب کے ہاتھوں لاچار ہونے لگے.. انشاء جی اب اٹھنا چاہتے تھے اس سے پیشتر کہ منجمد ہو کر اُس قبرستان کا ایک برف پوش شجر ہو جائیں، کُوچ کر جانا چاہتے تھے.. چنانچہ ہم نے ظہور ملک سے گزارش کی کہ سویڈن بھی بہت ہو چکا.. اگر شب اتنی برف آثار اور رگوں میں دوڑنے والے خُون کو بھی منجمد کرنے والی نہ ہوتی تو شاید ہم کچھ قیام کر لیتے پر اب ہم کُوچ کرنا چاہتے تھے.. وہ سٹیٹ آف ڈنمارک جو بے شک بوسیدہ ہو چکی تھی وہاں لوٹ کر اپنے ہوٹل کے کمرے میں بسرام کرنا چاہتے تھے.. تو نہ صرف ملک نے بلکہ صدف نے بھی یک زبان ہو کر کہا ''پہلے سویڈن میں ڈنر کریں گے پھر ڈنمارک واپس جائیں گے۔''

''ڈنر کی حاجت ہرگز نہیں لیکن اگر ناگزیر ہے تو ڈنمارک پہنچ کر یہ فریضہ سرانجام دے لیں گے۔'' میں نے نہایت مسکین ہو کر کہا..

''نہیں جی..'' صدف نے فیصلہ صادر فرما دیا ''اگر سویڈن آئے ہیں تو ڈنر یہیں کریں گے۔''

ہم بحث کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے، مہمان تھے۔ اپنے میزبانوں کو ڈرا دھمکا نہیں سکتے تھے.. محتاج لوگ تھے، سردی سے لاچار لوگ تھے.. چنانچہ مالمو میں کسی مناسب مسلمان ریستوران کی تلاش میں ہم سرگرداں ہوئے کہ ہمارے میزبان رزق حلال پر یقین رکھتے تھے.. ایسی شرعی خوراک کی تلاش میں ہم جس طور خجل خوار ہوئے اور اس دوران مجھ پر اور میمونہ پر جو گزری اُسے کیا بیان کرنا.. میمونہ ایک معذور کی مانند برف سے پھسلواں ہوتے فٹ پاتھوں پر لڑکھڑاتی پھرتی تھی.. اُس کے امریکہ سے خرید کردہ کلارک کے جوگرز پتھروں پر آئینہ ہوتی برف پر پھسلتے تھے.. ہم دونوں سردی سے اپاہج ہو چکے چلتے جاتے تھے.. یہ جانتے تھے کہ اگر کہیں پھسل گئے تو کوئی نہ کوئی بوڑھی ہڈی تڑخ جائے گی جو بعد میں ہرگز

اپنی عینک میں ایک بچہ فلسفی..مشال کی سیاہ آنکھیں جو اُس نے اپنی دادی سے چُرالی تھیں.. یاشار کے اگلے دانت اُس کے چہرے کے بھولپن میں مسرت سے نمایاں ہوتے اور طلحہ کے چہرے کی چاند گولائی جس میں بڑی بڑی آنکھیں حیرت سے کُھلی ہوئی..اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی کیسے کیسے انمول اور بے بہا خزانوں سے نوازا تھا..

میں نے میمونہ کو اپنی اس ہُوک میں شریک کیا تو وہ بھی ان کے لیے اداس ہونے لگی..ایک سائبان تلے مقامی موسیقاروں کا ایک گروپ سازوں پر سر جھکائے نہایت انہماک سے کرسمس کے گیتوں کی دُھنیں بجا رہا تھا جو اس پر کیف شام میں گونجتی تھی..ایک نہایت ادھیڑ عمر دراز قامت عورت فادر کرسمس کا سُرخ روپ دھارے پُر اشتیاق بچوں کو پیار کرتی تھی اور اُنہیں چھوٹے چھوٹے تحفے پیش کر رہی تھی....وہ اتنی مہربان اور محبت بھری خاتون تھی کہ کچھ لوگ اپنے کتوں کو بھی اُس کے پاس لے آتے اور وہ اُنہیں بھی پیار سے تھپکتی اُن سے جانے کیا باتیں کرتی تھی..

یورپ سے اس مختصر ملاقات کے دوران شاید یہ ہماری سب سے یادگار اگرچہ برفیلی شام تھی..اُس شام کی ہواؤں میں بے شک برف کی کرچیاں تھیں جو ہمارے نیم منجمد ہو چکے چہروں میں چبھتی تھیں لیکن ہمارے بدنوں میں ایک سفید سحر سرایت کرتا اُنہیں ایک گہری خوشی سے ہمکنار کرتا تھا اور ہمارے چہروں پر وہی معصوم مسرت دمکتی تھی جو پستہ قد خچروں پر سوار بچوں کے چہروں سے پھوٹتی تھی...نہ صرف ہم بلکہ وہ ہزاروں سویڈش لوگ جو اُس شام شہر کے مرکز میں ہجوم کرتے تھے، کرسمس کے رنگوں میں رنگے ہوئے یہ جو زندگی ہے جو صرف ایک بار ملتی ہے اس سے یوں لُطف اندوز ہو رہے تھے جیسے واقعی جانتے ہوں کہ یہ زندگی ایک بار ہی ملے گی..اس لیے کسی ایک لمحے کا بھی ضیاع ایک جُرم ہے..اور وہاں اُن ہزاروں جوانوں، بوڑھوں اور بچوں میں کوئی ایک چہرہ بھی نہ تھا جو مُنہ بنائے، بیزار اور غصیلا ہو..یہ نہیں کہ اُن کی زندگی میں کسی بھی غم یا دُکھ کا عمل دخل نہ تھا..دُکھ تو سارے جگ کو ہوتے ہیں، یہ سنسار دکھوں کا گھر ہے اور اگر کوٹھے چڑھ کر دیکھا جائے تو گھر گھر یہی آگ ہے لیکن اس کے باوجود زندگی میں ہمہ وقت ہی اُن دکھوں میں مبتلا کیوں رہنا..دُکھوں کی آگ میں جلتے ہی کیوں رہنا..کیوں نہ تلخیٔ ایام میں سے خوشیوں کی مئے لالہ خام کشید کر لی جائے..

میں کسی حد تک اُس شام کی برف سفیدی میں مالمو کے مرکز میں اُن ہزاروں لوگوں کے چہروں کو یُوں زندگی کی حرارت سے زندہ اور پر مسرت دیکھتے ہوئے..ایک حسد میں مبتلا ہوا..کہ میں

پھینک دیتے اور وہ ایک مناسب گالی دے کر اپنے پتّے میز پر پٹخ دیتا کہ یار کلر کی راؤنڈ تھی کسی بہن... نے ایک چال بھی نہیں ڈالی.. اُس نے تنگ آ کر اپنی مونچھیں صاف کر ڈالیں.. شنید ہے کہ مصر کے رنگیلے بادشاہ فاروق کے ہاتھوں میں فلاش کھیلتے ہوئے جب تین پتّوں میں سے دو بادشاہ آ جاتے تو وہ اسے ایک ٹریل قرار دیتا کہ دو تاش کے بادشاہ اور تیسرا میں ہوں.. جیت میری ہے.. اسی طور جب کبھی چیمہ صاحب کے ہاتھوں میں دو جوکر آ جاتے تو یار لوگ اسے ٹریل مان لیتے کہ جناب تیسرے آپ ہیں.. ہم ہار گئے.. ریاض کو سویڈن میں سیٹل کرنے میں کُچھ میرا عمل دخل بھی تھا، میں نے اُسے لاگن اور سٹاک ہوم کے سویڈش دوستوں سے متعارف کروایا جنہوں نے نہ صرف اُس کی میزبانی کی بلکہ اُس کی اس اجنبی ملک میں رہائش اختیار کرنے کے سلسلے میں معاونت بھی کی.. ہالینڈ پہنچتے ہی میں اُس سے رابطہ کرنے کی کوششوں میں جُت گیا لیکن اُس کے دونوں فون مسلسل کھنکتے جاتے تھے پر انہیں کوئی اٹینڈ نہ کرتا تھا.. پاکستان واپسی پر جب اُسے یہ علم ہوا کہ میں سویڈن کو ہاتھ لگا کر آیا ہوں تو اُس کی مایوسی کی کوئی حد نہ تھی ''یار میں انہی دنوں اپنی بیوی کے ہمراہ چھٹیاں گزارنے افریقہ گیا ہوا تھا.. ہمارا گھر بند تھا تو ظاہر ہے فون کس نے اٹینڈ کرنے تھے..''

اور پھر اسی سویڈن کے شہر سٹاک ہوم میں ماگریتا ہوا کرتی تھی۔

''بالآخر سٹاک ہوم میں میرے قیام کا آخری دن آ پہنچا۔ اُس روز ماگریتا کو روم گئے ہوئے ایک ہفتہ بیت چکا تھا۔ سرِ شام میں بس پر سوار ہو کر گنگز کلپان پہنچ گیا۔ ایک خوشنما پہاڑی پر گھنے درختوں کے درمیان جدید عمارتوں کا ایک جُھنڈ جو ایک ہفتہ قبل مجھے شہزادہ یوجین کے محل سے نظر آیا تھا۔ میں خود کار لفٹ سے آٹھویں منزل پر پہنچا تو ماگریتا فلیٹ سے باہر برآمدے میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ آج اس کی مسکراہٹ میں حزن کا پہلو نمایاں تھا۔

''میں دوپہر سے بالکونی پر کھڑی تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے تمہیں نیچے فٹ پاتھ پر آتے دیکھ کر ہاتھ بھی ہلایا تھا مگر تم نے میری جانب دیکھا ہی نہیں۔'' وہ سیاہ رنگ کے ایک دیدہ زیب لباس میں ملبوس تھی جس کا گلا گول شیشوں کے بلوچی کام سے مزین تھا..

''تم اس لباس میں ایک بلوچی خانہ بدوش لڑکی لگتی ہو۔''

''تمہیں پسند ہے نا؟'' اس نے مچل کر کہا ''میں نے آج ہی یہ فاروق کی دکان سے خریدا

نہیں جڑے گی، اور جب ہم مالمو کے کوچۂ و بازار میں بہت بھٹکے..اور جو کچھ بھی وہاں تھا سب کا سب برف سے اٹا ہوا تھا..فٹ پاتھ کے کناروں پر جو سائیکلیں آرام کرتی تھیں تو وہ سب کی سب برف سے تراشیدہ برف صورت تھیں تو میں نے ان دونوں میزبانوں سے جو ہماری حالت زار سے آگاہ تو تھے پر اس کی مرگ سنگینی سے ہرگز آگاہ نہ تھے، گزارش کی..کہ دیکھیں حلال خوراک کی تلاش میں ایک شرعی مجبوری ہے لیکن شرعی طور پر ہی حالتِ اضطراری میں ہر شے حلال ہوتی ہے اور ہماری موجودہ ٹھٹھرتی ہوئی حالت سے بڑھ کر بھلا کوئی اور حالتِ اضطراری کیا ہوگی..اگر ہم دونوں میں سے کوئی ایک پھسل پڑا اور کوئی منکا وغیرہ کھسک گیا یا پھر ہم جو چلتے ہیں تو برف کے ہاتھوں اندھے ہو کر چلتے ہوئے کسی کھمبے سے جا ٹکرائے یا کوئی کار ہم سے آ ٹکرائی، سڑک پار کرتے ہوئے تو کیا تب آپ مانیں گے کہ ہاں یہ ایک مناسب حالتِ اضطراری ہے تو یہ سامنے والے میکڈونلڈ سے کوئی برگر وغیرہ زہر مار کر لیتے ہیں یا اُس سویڈش کیفے کے گرم ماحول میں داخل ہو کر کوئی سینڈوچ وغیرہ کھا لیتے ہیں اور ہم سوال نہیں کریں گے، یہ معاملہ اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں کہ اُس سینڈوچ میں گوشت کس نوعیت کا ہے..لیکن ہمارے میزبان نہ صرف ہمارے جان و مال بلکہ ایمان کے بھی رکھوالے تھے، اُنہوں نے محض خوراک کے لیے ہمارے ایمان کو داؤ پر لگانا مناسب نہ جانا ہماری جان کو داؤ پر لگا دیا اور بدستور کسی مسلمان ریستوران کی تلاش میں سرگرداں رہے..فٹ پاتھوں پر برف سخت ہو کر ایسا پھسلواں شیشہ ہو چکی تھی جس پر ہمارے شوزیوں پھسلتے تھے جیسے ہم سکیٹنگ کر رہے ہوں..گھٹنوں اور ہڈیوں میں جو تھوڑا بہت گودا تھا وہ برف ہو چکا تھا..

جیسے موت کی قربت میں بچھڑے ہوئے عزیزوں اور دوستوں کے چہرے دکھائی دینے لگتے ہیں ایسے اُس قہرناک برفیلی رات میں جب کہ میرا بدن سردی کی کرچیوں سے چھلنی ہو رہا تھا، میں اُس کوہ نورد کی مانند بہکنے لگا جس کا دماغ بلندیوں پر آکسیجن کی کمی کے باعث غتر بود ہونے لگتا ہے..اُس کٹیلی سرد ہوا میں، اُس کے نیم منجمد جھونکوں میں مجھے ان دوستوں کی مہک آنے لگی جو کبھی سویڈن میں میرے یار اور دلدار ہوئے تھے..از کُجا مے آید ایں آوازِ دوست..اتنے زمانے بیت چکے تھے لیکن ان یاریوں اور دلداریوں کی مہک ابھی تک بوسیدہ نہ ہوئی تھی..اپنی تازگی کے تیراب بھی میرے دل میں اتارتی تھی..ریاض چیمہ جس کی مونچھیں جو کب کی صفاچٹ ہو چکی تھیں، فلاش کھیلتے ہوئے جب کبھی اُس کے ہاتھوں میں جیت جانے والے پتّے آتے تو وہ پھڑکنے لگتیں اور ہم سب فی الفور اپنے پتّے

اُس نے میری بات کا جواب دیئے بغیر کار سٹارٹ کی اور شہر جانے والی سڑک پر مڑ گئی۔

مارگریتا کی ننھی منی بیل کار کارل ستاد جاتی ہوئی شاہراہ پر بالکل بچوں کا کھلونا لگ رہی تھی۔

''ہم سٹاک ہوم سے پچاس میل دور تو آ گئے ہیں۔ اب تم واپس چلی جاؤ۔''

''بس تھوڑی دور اور..'' اُس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ کارل ستاد آیا تو میں زبردستی اُتر گیا۔

''اگر میں نے آج پرواز پر نہ جانا ہوتا تو میں ناروے کی سرحد تک تمہارے ساتھ جاتی۔'' اس نے کار کی چابی سے کھیلتے ہوئے کہا ''یاد ہے جب ہم مڈسمر نائٹ کے جشن پر گئے تھے تو آرڈرے نے کہا تھا، مارگریتا تم مستنصر کے ساتھ اپنے ہوائی مسافروں ایسا سلوک کر رہی ہو، میں نے تو اسی شام اپنے آپ کو بدل لیا لیکن تم تو مسافر ہی رہے نا؟''

مارگریتا کی کار سٹاک ہوم کی شاہراہ پر کچھ دیر نظر آتی رہی اور پھر کاروں اور دیو ہیکل ٹرکوں کے ہجوم میں کھو گئی۔

''میں ہوا کے بغیر کشتی رانی کر سکتی ہوں
میں چپو کے بغیر نیّا کھے سکتی ہوں
لیکن....
میں اپنے محبوب سے اشک بار ہوئے بغیر جدا نہیں ہو سکتی۔''

(''نکلے تری تلاش میں'')

وہ جو مہک آئی تھی یار کی اور دلدار کی وہ کب تک میری رُوح کو گرماتی.. میں بُری طرح ٹھٹھر رہا تھا، سخت ہو چکی برف پر یوں احتیاط سے قدم رکھتا تھا جیسے پُل صراط پار کر رہا ہوں اور اس کے باوجود پھسلتا تھا اور میمونہ، مجھے اُس کی لاچارگی پر ترس آتا تھا اور یہ وہ لمحہ تھا جب ہم پل دو پل میں برف کے مجسموں کی صورت منجمد ہو کر حنوط ہو سکتے تھے.. اگر میمونہ اس برفیلی حنوط شُدگی میں پہل کر جاتی تو مجھے کتنا دُکھ ہوتا کہ یہ خاتون زندگی بھر میرے پیار بھرے بولوں کے جواب میں سرد رہی اور اب سچ مچ سرد ہو گئی ہے اگرچہ اس کی بڑی بڑی آنکھیں اب بھی تتلیوں کی مانند پھڑ پھڑاتی ہیں.. اور اگر میں سبقت لے جاتا تو وہ کیسے کیسے بین کرتی کہ عمر بھر تم نے مجھ سے تغافل کیا اور اب بھی برف کے مجسمّے ہو کر مزید

ہے۔خالص پاکستانی ہاں!''

ماگریتا کا مختصر فلیٹ نفاست پسندی اور جمالیاتی حِس کا حسین مُرقع تھا۔ہم بالکونی پر چلے گئے۔ سٹاک ہوم کی درجنوں نہریں، خوبصورت جزیرے اور بلند عمارتیں بے ترتیبی سے ہمارے قدموں تلے پھیلی ہوئی تھیں۔ پورے شہر پر ایک سرمئی سا اندھیرا چھایا ہوا تھا جس میں لاتعداد برقی روشنیاں جذب ہو رہی تھیں۔ ماگریتا نے میری آمد سے قبل ہی بالکونی پر کھانے کی میز سجادی تھی۔ میز پر دماسک کا میز پوش بچھا ہوا تھا جس کے عین وسط میں سرخ پھول ایک سفید گلدان میں بڑی نفاست سے سجائے گئے تھے۔گلدان کے دونوں طرف بلّور کا ایک ایک شمع دان رکھا تھا جس میں درجنوں موم بتیاں روشن تھیں۔ نیچے سمندر سے ایک سیلی خوشبو کے ساتھ ہوا پہلو بدلتی ہوئی آتی۔ شمعوں کی لو تھرتھراتی اور اُن کا پرتو ماگریتا کے بلوچی لباس کے گول شیشوں میں منعکس ہو کر جھلمل جھلمل کرنے لگتا۔ ہم دونوں چپ چاپ ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔ تیز ہوا کے ایک جھونکے نے چند شمعیں گُل کر دیں۔ میں نے اسے اپنی دیوانگی کے بارے میں بتایا۔

''میں نے بچپن میں واشنگٹن ارونگ کی ''الحمرا کی کہانیاں'' پڑھی تھی۔غرناطہ جا کر مجھے خط لکھنا کہ وہاں کونسا ایسا فسوں ہے جو لوگوں کو سب کچھ چھوڑ کر وہاں جانے پر مجبور کر دیتا ہے۔''

میں نے ماگریتا کی طرف دیکھا۔اُس کا گول چہرہ، گول بلوچی شیشے اور درجنوں شمعوں کی لَو آپس میں مدغم ہو کر رہ گئے تھے۔اُس کی آنکھوں میں ستارے تھے یا شمعیں جھلملا رہی تھیں۔ میں فیصلہ نہ کر پایا۔

''میں تمہیں الحمرا کے ایوانوں میں بیٹھ کر خط لکھوں گا۔تم یہاں اس بالکونی پر بیٹھی بہتے پانی کی مدھم آواز اور فواروں کی سُریلی کُن مُن سُن لوگی۔''

ماگریتا مجھے ہوسٹل تک چھوڑنے آئی۔سنجیدگی نے اُس کے چہرے کا تاثر یکسر بدل دیا تھا اور وہ ایک مختلف انسان نظر آ رہی تھی۔ مسکراہٹ کے بغیر ماگریتا نامکمل تھی۔

''اگر تم پسند کرو تو میں کل صبح تمہیں سٹاک ہوم سے چند میل دور ناروے جانے والی شاہراہ پر چھوڑ آؤں گی۔''

''تمہیں خدشہ ہے کہ میں کہیں پھر واپس نہ آ جاؤں؟''

''ہوسٹل سکینڈک'' میں اپنے کمرے میں قدم رکھتے ہی میمونہ نے مستطیل کھڑکی کے آگے تنا ہوا پردہ وا کیا اور اُس کے پار جو کرسمس کارڈ برف میں سفید ہوتا منظر تھا اُس پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر سے پردہ کھینچ کر اُسے اوجھل کر دیا ''یہ برف منظر دور سے ہی، ایک کرسمس کارڈ پر نقش یا ایک کمرے کی کھڑکی سے ہی سحر طراز لگتے ہیں، انہیں دفع کرو.. اپنے پاکستان کے گرم موسموں میں چلتے ہیں.. جیسے اقبال بہت ہو گیا تھا، نپولین بہت ہو گیا تھا ایسے برف بھی بہت ہو گئی.. واپس چلیں..''

♦♦.....♦♦.....♦♦

تغافل کرتے ہو..

تو جب یہی پل دو پل کا معاملہ تھا کہ ہم کسی بھی پل برف کے مجسمے ہو جانے کو تھے جب میمونہ کے نیلے پڑتے ہونٹوں میں لرزش ہویدا ہوئی اور اُس نے ٹھٹھرتی ہوئی آواز میں کہا ''انقرہ''..

ظاہر ہے میمونہ کا دماغ بھی سردی کی شدّت سے چل گیا تھا ورنہ یہاں سویڈن میں انقرہ کیسے ہوسکتا تھا کہ وہ تو فی الحال تُرکی میں تھا..لیکن ہمارے میزبان ''انقرہ'' کا نام سُن کر چوکنے ہو گئے..کہاں ہے انقرہ..کدھر ہے انقرہ..

اُدھر..اُدھر..میمونہ نے برف ہو چکی انگلیوں سے اشارہ کیا۔

اُدھر..ایک برف آلود شاہراہ کے پار ایک عمارت پر انقرہ نام کے تُرک ریستوران کا بورڈ آویزاں تھا..

مجھے کبھی اپنی گزشتہ آوارہ گردیوں کے دوران تُرکی میں داخل ہوتے ہوئے اتنی مسرت نہ ہوئی تھی جتنی بے پایاں خوشی مجھے سویڈن کے شہر مالمو میں واقع اس انقرہ ریستوران کی گرم عافیت میں قدم رکھتے ہوئے ہوئی.. بالآخر ہم ایک حلال خوراک کی جستجو میں کامران ہو گئے تھے..اگرچہ اس کامرانی کے حصول کی خاطر ہم مرتے مرتے بچے تھے..

انقرہ کے ڈائننگ ہال میں داخل ہوئے تو تُرک بھائیوں نے ہمارے لیے مسلمان خوراک کے درجنوں طشت سجا رکھے تھے..اور ہم اُن کے شکر گزار ہونے کو تھے کہ بھلا ہمارے لیے اتنے تکلف کرنے کی کیا ضرورت تھی تو ویٹر حضرات نے جو ہماری آمد پر کچھ ایسے پر مسرت نہ ہوئے تھے، ہمیں خبر کی کہ..جناب صرف بیس منٹ کے بعد یہاں ایک تُرک بارات آنے کو ہے جس کے لیے یہ وسیع اہتمام ہے تو براہ کرم ان بیس منٹوں میں آپ جو کچھ کھا سکتے ہیں کھا لیجیے اور پھر شتابی سے رخصت ہو جائیے..

ہم نے جو کچھ بھی کھایا..چاول، آلو گوشت، کوفتے، پنیر چکن اور تُرک نان تو شتابی میں کھایا..

رات گئے ہماری کار پھر سے اُس پُل پر سے گزری اُس زیر آب سُرنگ سے گزری اور ہم ڈنمارک واپس آ گئے..

ہوئے کہتا تھا کہ چوہدری فلاں گاؤں کے فلاں چوہدری کا ایک بیٹا میں نے اپنی دِھی رانی کے لیے چھان پھٹک کر کے پسند کرلیا ہے اور میں بات پکّی کر آیا ہوں تو چوہدری اس رشتے کو قبول کر لیتا تھا..

ملّاح، اگر یہ گاؤں کسی دریا کنارے ہے تو وہ اپنی کشتی میں اپنی جاٹوں کو پار لے جانے کا فریضہ ادا کرتا تھا..

اور ہاں مسجد کا مولوی، اُسے روزانہ گندم کی روٹیاں اور اگر کبھی اتفاق ہو تو دیسی گھی کا حلوہ عطا کیا جاتا تھا تا کہ وہ ان پڑھ جاٹوں کے لیے کلمہ وغیرہ پڑھ سکے اور اُن کے مُردے نہلا سکے..

اور ان تمام سہولتوں اور ضرورتوں کو مہیا کرنے کے عوض میں چوہدری کے ذمہ داری نہ صرف خوراک کی ترسیل تھی بلکہ یہ کمتر لوگ اُس کے کھیتوں میں سے مُولیاں شلغم اکھاڑ سکتے تھے، گنّے توڑ سکتے تھے اور اپنے جانوروں کے لیے چارہ کاٹ سکتے تھے.. چونکہ یہ سب کام کے لوگ یعنی کمّی اپنی خوراک کے لیے جاٹوں پر انحصار کرتے تھے اس لیے جاٹوں نے کبھی یہ نہ سوچا کہ اُن کی مہیا کردہ زندگی کی بنیادی ضرورتوں کے بغیر وہ نہ کام کے تھے اور نہ کاج کے.. تو اُن میں ایک کھوکھلے اور پُرتکبر گھمنڈ نے جڑیں پکڑ لیں اور پھر زمانے کے پُلوں تلے سے وقت کے بہت پانی بہہ گئے اور وہ اپنی برتری کے خول میں پوشیدہ بے خبر رہے.. زمین نسل در نسل تقسیم سے اتنی کم ہوگئی کہ اُنہوں نے دوسروں کو تو خوراک کیا مہیا کرنی تھی اُن کے اپنے گھروں میں قال پڑنے لگا.. جنہیں وہ کمّی کمین اور حقیر جانتے تھے وہ کوئی نہ کوئی ہُنر رکھتے تھے.. وہ شہروں میں منتقل ہو گئے.. اور اپنی محرومیوں اور کمتریوں کو اپنے ہُنر سے کامیابیوں اور ایک ثروت مند حیات میں بدل دیا.. یہی جاٹ مجبوراً اُن کے کارخانوں اور کاروباروں میں معمولی مزدور ہو گئے.. اُن کے آگے سر جھکانے لگے جو کبھی اُن کے سامنے دم نہ مارتے تھے.. مجھ میں اگر کوئی تخلیقی جوہر موجود ہوتا تو میں اس جاٹ المیہ پر ایک پراثر یونانی ٹریجڈی ڈرامہ لکھ سکتا تھا کہ بہرطور اُن میں کُچھ خوبیاں تو تھیں، ایک وسیع فراخ دلی تھی، اُن کے گھر سے کوئی بھی سوالی خالی ہاتھ نہ جاتا تھا بے شک اُس کا خاندان اُس شب بھوکا سو جائے، یہ اُس کی انا کا تقاضا تھا کہ اُس نے خالی جھولی بھرنی ہے، چاہے اُس کی جھولی خالی ہو جائے، نادار ہو جائے.. وہ اپنے خون پسینے سے کشید کردہ خوراک باقاعدگی سے دوسروں میں تقسیم کرتا تھا، گاؤں میں دور دراز کی مسافتیں طے کرتے داخل ہونے والا ہر اجنبی اُس کا مہمان ہوتا تھا، اُسے حقّہ پانی، خوراک اور بستر مہیا کرنا اُس کا فرض ہوتا تھا.. وہ اپنی طے شدہ اخلاقی اقدار کی پاسبانی کرتا تھا.. منتقم مزاج تھا پر کمینہ نہیں تھا۔ اگر ایک دشمن اُس

''جاٹ سنڈروم اِن یورپ جٹ لینڈ''

میں اس جاٹ سنڈروم سے بے زار ہو چکا تھا..

ہالینڈ، بیلجیم اور ڈنمارک میں ہر دوسرا بندہ چوہدری تھا، جاٹ تھا..

ابھی کچھ زیادہ مدت نہیں گزری جب پنجاب کے دیہات میں بارٹر سسٹم رائج تھا.. جاٹ چونکہ زمین میں ہل چلا کر اُس میں سے دیگر اجناس کے علاوہ انسان کی بنیادی ضرورت یعنی خوراک بھی اُگاتا تھا تو وہ اس لحاظ سے دیگر ذاتوں سے برتر اور معتبر ٹھہرتا تھا.. وہ ہاڑی اور ساؤنی باقاعدگی سے اُن طبقوں تک پہنچاتا تھا جو سال بھر اُس کی چاکری کرتے اُسے زندگی کی دیگر سہولتیں مہیا کرتے تھے.. کمہار اُس کے لیے گھریلو برتن چاک پر چڑھاتے تھے، جولاہے اُس کا پیراہن بُنتے تھے، کھیس اور چادریں کھڈیوں پر تیار کرتے تھے.. لوہار اُس کا زرعی سامان بھٹیوں میں پگھلاتے اور کُوٹتے تھے.. تیلی اُس کے مہیا کردہ خام مال کو اپنے کولہو میں ڈال کر اُس کے لیے تیل نکالتے تھے.. نائی نہ صرف اُس کے بالوں کی تراش خراش بلکہ شادی بیاہ کے موقعوں پر زردے اور پلاؤ کی دیگیں چڑھانے کے بھی ذمہ دار تھے.. اُدھر نائن نہ صرف چوہدرانی کے پاؤں دابتی تھی بلکہ نو بیاہتا دُلہن کے ہمراہ اکثر ڈولی میں سوار ہو کر اُس کے سسرال پہنچ کر شب عروسی میں کبھی روپوش ہو کر اور کبھی ایک کونے میں بیٹھ کر خیال رکھتی تھی کہ بچی کے ساتھ کُچھ زیادتی نہ ہو جائے اور اسے ان معاملوں سے نپٹنے کے لیے کُچھ ٹپس وغیرہ بھی دیتی تھی.. داروگر چوہدری کے لیے بلکہ جاٹ کے لیے شُرلیاں، پٹاخے اور انار وغیرہ مینوفیکچر کرتا تھا جو خوشی کے موقعوں پر چلائے جاتے تھے، انہیں عرفِ عام میں اشت بازی کہا جاتا تھا.. میراثی حضرات کا موروثی پیشہ ان جاٹوں کے حقّے بھرنا، اپنی چرب زبانی سے اُنہیں محظوظ کرنا، شادیوں پر لوک گیت الاپنا اور اُن کی بیٹیوں کے لیے مناسب بَر تلاش کرنا ہوتا تھا.. میراثی دادا اس معاملے میں اتنا قابل اعتماد ہوا کرتا تھا کہ اگر وہ آس پاس کے دیہات کی آوارہ گردی کے بعد کاشتکار کے آگے تازہ دم حقّہ رکھتے

آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اگر میں ''چانن تے دریا'' میں چوہدری کی بیٹی کو ایک لوہار کے بیٹے کے عشق میں مبتلا کر دیتا تو کیسا غدر برپا ہوتا، میرا کیا حشر ہوتا..

ہالینڈ، بیلجیم، ڈنمارک اور غالباً ناروے میں آباد جتنے بھی جاٹ ہیں اور بہت ہیں اُن میں سے بیشتر وہ اپنا جھوٹا تکبر اور جعلی برتری ساتھ لے کر آئے ہیں اور یہاں دن رات اُس کی پرورش کرتے رہتے ہیں، مجھ پر یہاں آ کر کھلا کہ بہت سے لوگ میری توقیر صرف اس لیے کر رہے ہیں کہ میں بھی ایک جاٹ ہوں.. اُنہیں کچھ غرض نہیں کہ میں نے ادب میں بھی کچھ جھک ماری ہے.. اور یہ جاٹ حضرات بانہیں پھیلائے جوق در جوق ایک اور جاٹ سے ملاقات کرنے چلے آ رہے ہیں..

ایک صاحب پچھلے تیس برسوں سے ڈنمارک میں مقیم ایک عدد ڈنمارکی بیگم اور اُس کے بطن سے پیدا ہونے والے متعدد بچوں کو بیاہنے سے فارغ ہو چکے ہیں وہ صاحب.. ایک محفل میں میری جانب لپکتے چلے آتے ہیں.. واہ جی واہ آج کیسا خوش نصیب دن ہے.. کہ میں گجرات کی تحصیل پھالیہ سے تعلق رکھنے والے دوسرے شخص سے مل رہا ہوں..

''وہ پہلے شخص کون تھے؟'' میں مجبوراً مسکراتے ہوئے دریافت کرتا ہوں

''اپنے حاجی صاحب.. پھالیہ کے تھانے کے قریب پرچون کی دکان کرتے تھے.. اور پھر آپ سے ملاقات ہو گئی..''

میں اُن کا دل نہیں توڑنا چاہتا، یہ نہیں بتانا چاہتا کہ سکندر اعظم کے گھوڑے کے مدفن پھالیہ سے میرا آبائی گاؤں جو کالیاں ذرا فاصلے پر ہے اور میرے والد صاحب اُس علاقے میں میٹرک پاس کرنے والے پہلے جاٹ لڑکے تھے اور وہاں سے زرق روزگار کی خاطر لاہور اٹھ آئے اور میں نے اپنی پوری زندگی میں شاید دو چار دن ہی اپنے آبائی گاؤں میں گزارے ہوں تو میں کچھ زیادہ سکہ بند گجراتی نہیں ہوں.. دراصل لاہوریا ہوں.. اگرچہ ایک جاٹ ہوں..

ایک براہ راست نشر ہونے والے ریڈیو انٹرویو جاری ہے اور فون چلے آ رہے ہیں.. اور یہ سب محبتوں کے سندیسے ہیں جو ہوا کی دوش پر چلے آ رہے ہیں اور پھر ایک صاحب کی آواز آتی ہے.. تارڑ صاحب.. میں بھی تارڑ ہوں.. میں بتا نہیں سکتا کہ اپنی برادری کے ایک شخص کو ڈنمارک میں پا کر کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ کچھ وقت نکالیے میں آپ کی روٹی کرنا چاہتا ہوں.. ویسے سُنا ہے کہ آپ کچھ کتابیں وغیرہ بھی لکھتے ہیں.. اور ازاں بعد ایک بھرپور قہقہہ.. ہاہا.. بھلا جاٹوں کا لکھنے پڑھنے سے کیا

کی چوکھٹ کے اندر آ جاتا تھا تو سب کچھ فراموش کر کے اُسے گلے لگا لیتا تھا کہ.. یہ بندہ میرے گھر آ گیا ہے... جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ میں اس جاٹ المیہ پر ایک پُر اثر یونانی ٹریجڈی لکھ سکتا ہوں اگر مجھ میں تخلیق کا اتنا بڑا جوہر موجود ہوتا جتنا کہ یورپڈیس یا اسکلس جیسے یونانی ڈرامہ نگاروں کو ان کے دیوتاؤں نے عطا کیا تھا.. اس کے باوجود میں نے پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے جو بے شمار پنجابی ڈرامے لکھے اُن سب میں کہیں نہ کہیں اس جاٹ المیے کا پرتو تھا.. میں نے ایک طویل سیریل ''چانن تے دریا'' کے نام سے تحریر کیا جسے خالد محمود زیدی نے میری تمنا کے مطابق پروڈیوس کیا.. اس سیریل کی مقبولیت بھی ایسی تھی کہ دُلہا میاں نکاح ذرا اس لیے مؤخر کر دیتے تھے کہ وہ ساتھ والے کمرے مین جا کر اس کی تازہ قسط دیکھنا چاہتے تھے.. سرحد پار کے لوگوں کو آج بھی اُس کے متعدد مکالمے یاد ہیں.. اس سیریل کا ہیرو عنایت حسین بھٹی کا تب جواں سال بیٹا وسیم عباس تھا اور وہ ایک ایسے جاٹ کا بیٹا تھا جس کی زمین اتنی کم ہے کہ اکثر فاقوں کو نوبت آ جاتی ہے اور اس کے باوجود اُس کے تکبر میں کمی نہ آتی تھی، ہیروئن کا کردار شکیلہ قریشی نے ادا کیا جو ایک لوہار کی بیٹی ہے.. جس طور ہندوستان میں پروڈیوس ہونے والی بے شمار فلموں میں ہیرو ہمیشہ ہندو ہوتا ہے اور ہیروئن مسلمان کہ وہاں کے فلم بین یہ برداشت ہی نہیں کر سکتے کہ ہیرو مسلمان ہو اور ایک ہندو کنیا اُس کے عشق میں گرفتار ہو.. چنانچہ مجھے بھی مفاہمت کرنی پڑی ورنہ میری خواہش تھی کہ ہیروئن ایک جاٹ کی بیٹی ہو اور ہیرو ایک کمی کمین لوہار کا بیٹا.. اور اس احتیاط کے باوجود ایک مسئلہ کھڑا ہو گیا.. سیریل کے ایک ڈرامائی منظر میں وہ لوہار خم ٹھونک کر اُس پر تکبر اگر چہ نادار چوہدری کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تو ایک ہنر مند شخص ہوں، مشقت کر کے حق حلال کی روزی کماتا ہوں اور تم کیا ہو۔ ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر ناکارہ بیٹھے حقہ گڑگڑاتے گردن ٹیڑھی کیے مجھے حقیر سمجھتے.. ایک ایسا کل آ رہا ہے جب تم میری چاکری کرو گے، تمہاری ٹیڑھی گردن میرے سامنے جھک جائے گی وغیرہ.. اس منظر کے حوالے سے مجھے متعدد دھمکیاں ملیں، جاٹ حضرات نے اشتعال میں آ کر یہ تک کہہ دیا کہ اس کا مصنف تارڑ دراصل جاٹ نہیں ہے، کوئی کمی کمین ہے.. فیصل آباد کے نواح میں آباد ایک تارڑ برادری کی جانب سے باقاعدہ احتجاج ہوا اور کسی تارڑ صاحب نے فون پر رابطہ کرتے ہوئے کہا، آپ کیسے جاٹ ہو کہ جاٹوں کو بے عزت کرتے ہو.. مجھے ذرا کسی ایسے لوہار کا نام تو بتاؤ جو ایک جاٹ کے سامنے کھڑا ہو کر وہ مکالمے بولے جو تم نے لکھے ہیں..

کرنے کے لیے سینکڑوں مصوّروں کے خاکے رد کر کے میرا انتخاب کر لیا۔ اب صورتِ حال کُچھ یوں تھی کہ میں کامیو کے ناول کو ایک کینوس پر مصوّر کرتا تھا اور میرے بائیں جانب مادام کامیو اور وہ تب زندہ تھیں، ایک ارغوانی مے کا جام میرے لیے تھامے مسکراتی تھیں۔۔ میں ایک سٹروک لگاتا تھا تو وہ مجھے سُرخ شراب کا ایک گھونٹ اپنے ہاتھوں سے پلاتی تھیں، سمجھتے ہیں آپ؟''

''جی۔۔'' میں ایک غرض مند تھا کہ صادقین ایسا بڑا مصوّر میری پہلی کتاب کے لیے اگر کچھ لکیریں کھینچ دے تو میرے ایسے نو آموز مصنف کے لیے یہ کیسی خوش بختی ہوگی تو میں اُن کی خوشامد کرتا رہتا تھا۔۔

''آپ نہیں سمجھ رہے۔۔''

''جی میں نہیں سمجھ رہا۔'' میں نے سر جھکا کر کہا۔۔

''تارڑ صاحب۔۔ بُرا نہ مانیے گا۔ لیکن کہاں وہ دن جب ہم البرٹ کامیو کے ناول کو مصوّر کیا کرتے تھے اور میڈم کامیو ایک ارغوانی مے کا جام تھامے ہمارے بابر میں کھڑی ہوتی تھیں اور کہاں یہ دن۔۔''

میں جان تو چکا تھا کہ صادقین کیا کہنا چاہ رہے تھے لیکن میں نے بھولپن سے پوچھا کہ ''صادقین کون سے دن۔۔''

''یہی دن۔ کیسی بلندی اور کیسی پستی کے دن کہ۔۔ کبھی ہم کامیو کے ناول کو مصوّر کیا کرتے تھے اور آج۔ تارڑ کے ایک سفرنامے کی تصویریں بنا رہے ہیں۔''

میرے لبوں پر کچھ دیر ایک خوشامدی، مطلب پرست مسکراہٹ پھیلی رہی اور پھر۔۔ مجھے تاؤ آ گیا۔ اپنے آپ کو بہت روکا کہ رکے رہو اس عظیم مصوّر کو ناراض کرنے کا خطرہ مول نہ لو لیکن۔۔ مجھ پر ایک تارڑ غالب آ گیا۔ ''صادقین صاحب۔۔ اگر آپ میری کتاب کو مصوّر کر رہے ہیں تو مجھ پر بھی یہی قلق اور دُکھ طاری ہے کہ کیسی بلندی اور کیسی پستی۔۔''

صادقین نے کاغذ پر لکیریں کھینچتے اپنا ہاتھ روک لیا ''کیا مطلب۔۔'' اور وہ خاصے خشمگیں تھے۔۔

''ایک زمانے تھے کہ اس کتاب ''نکلے تری تلاش میں'' کا سرورق مصوّر شرق عبدالرحمٰن چغتائی بنایا کرتے تھے اور اب۔۔ یہ افتاد پڑ گئی ہے کہ صادقین سے بنوا رہے ہیں۔۔''

کام.. ہیں جی..وہ ایک فیض صاحب جو تھے وہ بھی تو جاٹ تھے کالا قادر کے..وہی جو شاعری وغیرہ کرتے تھے.. ہیں جی..

میں اس جاٹ سنڈروم سے بیزار نہ ہوتا تو کیا کرتا..میں اپنے جاٹ ہونے سے دستبردار بھی تو نہیں ہوسکتا تھا کہ اس کی سند مجھے صادقین نے دی تھی..

لاہور میوزیم کے برابر میں ایک خستہ حال کمرے میں صادقین میری پہلی کتاب ''نکلے تری تلاش میں'' کے ابواب مصوّر کررہے ہیں اور یہ اردو میں اُن کی پہلی کتاب تھی جسے وہ مصوّر کررہے تھے..وہ یکدم اپنا مارکر سفید کاغذ سے اٹھا کر ایک آہ بھرتے ہیں اور اُس لمحے وہ میری کتاب کے باب ''وینس میں موت بھی خوبصورت ہے'' کی تصویر کشی کررہے تھے..آہ بھرتے ہیں اور اپنی ٹیڑھی ہوچکی انگلیاں میری آنکھوں کے سامنے نچا کر کہتے ہیں ''تارڑ صاحب اسے کہتے ہیں،کیسی بلندی کیسی پستی..''

''کسے کہتے ہیں صادقین صاحب..کونسی بلندی اور کونسی پستی..''

تو صادقین جو حسب دستور اور حسب معمول مدھم خمار میں تھے، کہنے لگے ''تارڑ صاحب..جب میں پیرس میں ہوا کرتا تھا نوجوانی کے عالم میں تو اُن ایام میں البرٹ کامیو کا کوئی صد سالہ جشن منایا جارہا تھا..جانتے ہیں کون ہے کامیو؟''

''جی..''میں نے سر جھکا کر اُس کے ناولوں کے نام لے دیئے کہ جی پڑھ چکا ہوں۔

''تو فرانسیسی حکومت نے کامیو کے ناول ''دے آؤٹ سائڈر'' کو مصوّر کرنے کے لیے ایک مقابلے کا اعلان کیا..جانتے ہیں کہ یہ کون سا ناول ہے؟''

''جی..یہی ناول ''ایک اجنبی'' کے نام سے بھی شائع ہوا تھا، جانتا ہوں۔''

صادقین قدرے مایوس ہوئے کہ میں البرٹ کامیو کو جانتا ہوں..

''آپ کیا جانیں کہ البرٹ کامیو کس چڑیا کا نام ہے۔'' دراصل اُس شب اُن کا معتمد اور اُن کے کھانے پینے کا خیال رکھنے والا خالد بٹ موجود نہ تھا جو حساب کتاب رکھتا تھا..اور وہ اکثر اُس کا ہاتھ تھام کر کہا کرتے تھے..خالد..تو بہت کم ظرف اور خصیص ہے۔ذرا ایک اور گلاس بھر دے..تو انہوں نے ایک اور گلاس خود ہی بھر لیا تھا۔''تارڑ صاحب..فرانسیسی حکومت نے البرٹ کامیو کے ناول کو مصوّر

قدیم سوچ کی ترجمانی کرتے ہیں.. بلکہ ایک معروف ادیب اور اُن کا تعلق بھی جاٹ قبیلے سے ہے، یہ ناول پڑھ کر مجھ سے خفا ہو گئے کہ تارڑ صاحب نے جاٹ ہوتے ہوئے بھی اس ناول میں جاٹوں کو بہت بے توقیر کیا ہے تو یہ کیسے جاٹ ہیں.. اگرچہ اُنہوں نے جو کچھ لکھا ہے اُس کی سچائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا.. ویسے میں سمجھتا ہوں کہ میرے اندر تھوڑا بہت جو تخلیقی جوہر ہے وہ صرف اس لیے ہے کہ یہ صرف ایک کاشتکار ہوتا ہے، زمین کے اندر اپنے ہل کے پھالے کے ساتھ اپنا دل اتارنے والا کسان ہوتا ہے جو دھرتی کی آواز سُن سکتا ہے اور اپنی مٹّی کے ساتھ گہری وابستگی رکھتا ہے.. اُسے اپنی ماں سمجھتا ہے اور اُس کے ساتھ کبھی فریب نہیں کر سکتا.. بے شک اُس میں ایک بے جا تکبر اور جہالت ہوتی ہے لیکن صرف وہ ہے جو نمو اور تخلیق کے بھید جانتا ہے.. میرے لفظوں میں اگر کچھ تاثیر ہے تو یہ اُسی مٹی کی عطا ہے جس میں میرا باپ اور میرا دادا ہل چلایا کرتے تھے..

آپ یہ نہ سمجھ لیجیے گا کہ سبھی جاٹ اسی قدیم ذہنیت میں مبتلا ہوتے ہیں..

میرے ابّا جی کو اُس شب سانس کھینچنے میں دشواری پیش آ رہی تھی اور میں نے اُن کے کمرے کی دیوار پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا کہ اے اللہ.. تو جانتا ہے کہ اس شخص نے آج تک کسی کا دل نہیں دکھایا، خلق خدا کے لیے اپنے نام کی طرح ایک رحمت ہوا.. ہمیشہ سر جھکا کر چلا.. اس کے لبوں پر کبھی کوئی نازیبا لفظ نہیں آیا.. فرشتے تو معصوم ہونے پر مجبور ہوتے ہیں لیکن یہ شخص انسان ہونے کے باوجود اُن سے زیادہ معصوم تھا.. اور اگر یہ سب تُو جانتا ہے تو اسے یا تو کچھ سانس عطا کر دے اور یا پھر اس کی مُشکل حل کر دے.. تقریباً پچاس منٹ گزر رہے ہوں گے جب میرا چھوٹا بھائی زبیر میرے بیڈ روم کی کھڑکی پر دستک دیتا رو رہا تھا..

فیض صاحب بھی کالا قادر گاؤں کے ایک جاٹ تھے.. اُن جیسا ظرف معاف کر دینے کا اور عنصر، بردباری اور تحمل کا کسی اور میں آج تک آیا.. یہاں تک کہ اشفاق احمد نے اُنہیں رسول اللہؐ کے صحابہ کرام کی صف میں جا بٹھایا.. تو جاٹ کچھ اتنے برے بھی نہیں ہیں، میں اُن کے لیے صرف اس لیے کُڑھتا ہوں کہ وہ ابھی تک اپنی برتری کی دھند میں ملفوف ہیں اور زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں..

بہت عرصہ پہلے مجھے ایک ہندو جاٹ محقق کی ایک کتاب ''دی جاٹس'' پڑھنے کا اتفاق ہوا.. اُنہوں نے تاریخی حوالوں سے کیا سکندر اعظم اور کیا محمود غزنوی کو بھی جاٹ ثابت کر دیا.. بلکہ اُن کی تحقیق کے مطابق یورپ کے بیشتر باشندے بھی اسی ذات سے تعلق رکھتے تھے..

صادقین کچھ دیر تو سناٹے میں رہے اور پھر مار کر جو اُن کے ہاتھ میں تھا، اُسے کمرے کے ایک کونے میں پھینک کر غصّے سے بولے ''آپ رہے جاٹ کے جاٹ..''

اور اس زہرافشانی کا بھی ایک پس منظر تھا.. صادقین میری کتاب کو مصوّر کرتے ہوئے اکثر کہتے ''تارڑ صاحب یہ جو آپ کے ہم ذات جاٹ وغیرہ ہوتے ہیں تو ہمارے امروہہ میں یہ ہمارے مزارع ہوا کرتے تھے، سمجھتے ہیں آپ..'' اور میں لب بستہ رہتا۔ اگرچہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ حضور ہمارے ہاں گاؤں میں آپ جیسے سیّد حضرات کی بے حد تکریم کی جاتی ہے لیکن.. یہ ہم ہی جاٹ ہیں جن کے گھروں سے اُن کے لیے روٹیاں، دودھ اور حلوے وغیرہ جاتے ہیں۔

''نہیں کروں گا آپ کی کتاب کو مصوّر..'' صادقین واقعی طیش میں آ گئے تھے..

''جی بے شک نہ کیجیے.. ہاں میں ہوں جاٹ کا جاٹ..'' میں چپکے سے اٹھا اور گھر چلا آیا۔

اگلے روز مجھے شدید قلق ہوا کہ آخر میں نے یہ بدتمیزی کیوں کی.. ایک ایسا انسان جو مجھے دوست سمجھتا تھا اور بغیر کسی غرض کے میری کتاب مصوّر کر رہا تھا.. ایک ایسا بڑا مصوّر جو ایک کاغذ پر چند لکیریں کھینچ کر کسی کو عطا کر دیتا تھا تو وہ شخص عمر بھر اُس کا احسان مند رہتا تھا.. اور میرے لیے تو وہ نہ صرف کتاب کا سرورق، کم از کم تیس خاکے اور میرا پورٹریٹ بھی تخلیق کر رہا تھا تو میں کیسا احسان نافراموش ہوں کہ اُسے ناراض کر دیا.. میرے جیسے درجنوں ادیب اُس کی نظرِ عنایت کے لیے مرے جاتے تھے.. اُس کی مصوّری نے میرے سفرنامے کی تزئین اور توقیر میں اضافہ کرنا تھا، اُسے تو کچھ حاصل نہ ہونا تھا.. یہ میں نے کیا کہہ ڈالا.. اب شرمندگی اتنی تھی کہ میں معذرت کے لیے واپس بھی نہ جا سکتا تھا.. پورے تین روز بعد اُن کا فون آ گیا.. تارڑ صاحب آپ کے بغیر دل نہیں لگ رہا.. چلے آیئے.. دوستوں سے ناراض نہیں ہوا کرتے.. میں نے اُسی شب حاضر ہو کر بھرپور معذرت کی اور وہ میرا ہاتھ پکڑ کر.. اور وہ ہاتھ کو اتنی مضبوطی سے پکڑتے تھے جیسے ایک شکنجے میں کس رہے ہوں.. کہنے لگے ''ویسے ہم آپ کو مان گئے.. آپ ہیں جاٹ کے جاٹ..'' بعد میں دوستوں کی محفل میں وہ اکثر میری جانب شرارت سے تکتے یہ قصّہ بیان کرنے لگتے کہ میں نے تارڑ صاحب کو یہ کہا اور جانتے ہیں انہوں نے جواب میں کیا کہا.. اور شرم کے مارے مجھ پر گھڑوں پانی پڑ جاتا.. اور یہ حماقت مجھ سے صرف اس لیے سرزد ہوئی کہ میں ایک عدد جاٹ تھا..

میرے ضخیم ناول ''خس و خاشاک زمانے'' کے بیشتر کردار جاٹ سائیکی اور اکھڑ ثقافت کی

''ننھی جل پری چین سے واپس آ گئی''

ڈنمارک میں یہ ہمارا آخری دن تھا..

ہمیں آج رات ساڑھے سات بجے کی پرواز سے کوپن ہیگن سے ایمسٹرڈیم لوٹ جانا تھا..

اور یہ لوٹنا اتنا آسان نہ تھا..ہمارے اندر وسوسوں کا ایک ہول تیرتا پھرتا تھا کہ مسلسل برفباری کے باعث یورپ کے طول وعرض میں پروازیں معطّل ہو رہی تھیں..اگر ہم یہاں ڈنمارک میں محصور ہو گئے تو کیا ہوگا..وقت پر ہالینڈ واپس نہ پہنچ سکے تو پاکستان جانے والی فلائٹ ہمارے بغیر پرواز کر جائے گی..بس یہی وسوسے تھے جب وہ صدف نام کی خاتون اُسی سفید کوٹ میں ملبوس ایک لاہوری محاورے کے بقول پوپٹ لگتی وارد ہوگئی..

''ہوٹل سیکنڈک..'' سے چیک آؤٹ کرتے ہوئے ہم نے مستطیل کھڑکی کے پردے ہٹا کر اُس کرسمس کارڈ سفید منظر کو آخری بار دیکھا..ایسے برفیلے منظر ایک کھڑکی میں سے ہی سہانے اور سحر انگیز لگتے ہیں،ان منظروں کے اندر ہونا کیسا ہولناک تجربہ ہوتا ہے،یہ ہم پچھلی شب سویڈن میں کُھلا تھا..

چونکہ ہماری پرواز ساڑھے سات بجے شام روانہ ہونی تھی اس لیے طے ہوا کہ تب تک ہم کوپن ہیگن کے اُن مقامات کی دید کر لیں جو قابلِ دید تھے..ڈرائیور کی نشست پر ایک صاحب اونی ٹوپی آنکھوں تک کھینچے کوئی مُبتدی شرلاک ہومز سے لگ رہے تھے،آج کے دن ہم اُن کی سُپرداری میں تھے،یہ اعجاز چوہدری تھے..ہم نے وہ سب کچھ دیکھا جو کسی بھی بے وقوف ٹورسٹ کو دیکھنا چاہیے..ہم نے ڈنمارک کی ملکہ عالیہ کا محل دیکھا جس کے باہر ایک اکڑا ہوا نگہبان پہرا دے رہا تھا..اعجاز صاحب کہنے لگے،میں کار روکتا ہوں،آپ اس گارڈ کے پہلو میں کھڑے ہو کر ایک تصویر اتروا لیجیے،یہ بہت ضروری ہے..

''کیوں ضروری ہے؟'' یہ اعجاز صاحب رُوکھے بہت تھے،کم گو تھے اور ہماری موجودگی سے

ڈنمارک میں مجھے یہ جاٹ محقق بے حد یاد آئے..انہوں نے اپنی کتاب میں ڈنمارک کے مختلف جزیروں کا حوالہ دیتے ہوئے ''جُٹ لینڈ'' کا خصوصی تذکرہ کیا ہے اور انکشاف کیا ہے کہ یہ دراصل ''جَٹ لینڈ'' ہے..

تو یہاں ڈنمارک آ کر کُھلا کہ اُس ہندو جاٹ کی تحقیق..اب جا کر واقعی ثابت ہوگئی کہ یہ ایک جَٹ لینڈ ہو چکا ہے..

ہر دوسرا بندہ یہاں چوہدری تھا، جاٹ تھا..

میں واقعی اس جاٹ سنڈروم سے بے زار ہو چلا تھا..

♦♦.....♦♦.....♦♦

اب ننھی جل پری علم کی اتنی متلاشی بھی نہ تھی کہ چین چلی گئی ہو.. ویسے میں جب سے کوپن ہیگن آیا تھا ہر دوسرا شخص مجھے اطلاع کرتا تھا کہ تارڑ صاحب صد افسوس کہ آپ ننھی جل پری کو نہ دیکھ سکیں گے کہ وہ تو.. چین گئی ہوئی ہے..

''کیسے چین گئی ہوئی ہے..'' میں نے ذرا بھنّا کر کہا.. ''صدف بی بی وہ تو ایک مجسمہ ہے، کہیں کیسے آ جا سکتا ہے.. تمہارا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی چٹان پر سے اٹھی اور مارکو پولو کے نقش قدم پر پیدل چلتی چین چلی گئی.. کہ چلتے ہو تو چین کو چلئے..''

صدف بی بی نے کچھ تبسم کیا ''تارڑ صاحب.. لٹل مرمیڈ ایک بین الاقوامی شہرت یافتہ مجسمہ ہے اور اُسے چین لے جایا گیا ہے تاکہ چینی اہل نظر اُس پر ایک نظر ڈال سکیں.. ویسے آپ بُرا نہ مانیے گا لیکن آپ سٹھیا گئے ہیں..''

''میں قطعی طور پر سٹھیا نہیں گیا کہ میں ساٹھ کا نہیں ستّر کا ہو چکا ہوں تو اگر کچھ ہوا ہوں تو ستّرا گیا ہوں.. میں اُس واہیات چھوٹی سی پتھریلی جل پری کو گئے زمانوں میں متعدد بار دیکھ چکا ہوں تو صرف اُسے میمونہ کو دکھانا چاہتا تھا..''

''لیکن وہ تو چین گئی ہوئی ہے۔''

''بے شک وہ چین گئی ہوئی ہے لیکن اُس کے ساتھ وہ چٹان تو نہیں چلی گئی جس پر وہ براجمان تھی، کم از کم اُسے دیکھ لیں گے، کیوں میمونہ..''

اور میمونہ ابھی تک سویڈن کی برف آلود شب کے انجماد سے پوری طرح صحت یاب نہ ہوئی تھی، بیزار ہو کر بولی ''ویسے میں اس ننھی جل پری کو ڈنمارک کے ہر پکچر پوسٹ کارڈ پر.. ہر پوسٹر اور ہر گلی کوچے میں دیکھ چکی ہوں.. اور وہ بے چاری وہاں ننگی بیٹھی ہے.. نہ چادر میں ہے اور نہ حجاب میں.. تو اُسے دیکھ کر اپنا اخلاق کیوں خراب کرنا..''

میں نے اُس نادان بیگم صاحبہ کو سمجھایا کہ.. ان یورپ والوں کی اخلاق باختگی اور عریانی کی کوئی حد نہیں، یہ ابھی تک ہمارے عقیدے کے زریں اصولوں کی زد میں نہیں آئے اور ان کی عاقبت بہت خراب ہوگی.. یہ لوگ تو فلارنس میں مائیکل اینجلو کا تراشیدہ حضرت داؤد کا مجسمہ بھی سراسر برہنہ ایستادہ کیے ہوئے ہیں.. اور ویسے بھی بیگم یہ جو جل پریاں ہوتی ہیں، یوں بھی کپڑے نہیں پہنتیں.. ننگی پنگی، برہنہ حالت میں جل میں تیرتی پھرتی ہیں.. سمندر میں ہوتی ہیں اور سمندر میں اعتراض کرنے

بظاہر زیادہ خوش نظر نہ آتے تھے..

''اس لیے کہ کوپن ہیگن آنے والا ہر سیاح یہاں تصویر اتر واتا ہے۔''

میں نے مُونا کی جانب دیکھا تو اُس کی سیاہ آنکھوں میں صاف درج تھا کہ.. دفع کرو ڈنمارک کی ملکہ کو.. میں نے معذرت کر ڈالی کہ قبلہ میں نے بے شک ایک زمانے میں بلکہ جوانی کے زمانے میں بکنگھم پیلس کے باہر تعینات سمور کی سیاہ ٹوپیوں میں آنکھوں تک پوشیدہ گارڈز میں سے ایک کو گدگدی کرنے کی کوشش کی تھی کہ ہم سب لڑکے لڑکیاں جوانی کے خمار میں تھے لیکن اُن کے ہمراہ بھی میں نے تصویر نہیں اتروائی تھی.. اور وہ تو ملکہ برطانیہ کے محل کے پہریدار تھے اور ملکہ ڈنمارک کے یہ دو چار پہریدار تو یُوں بھی اپنی ملکہ کی مانند مسکین اور بے چارے سے لگتے ہیں تو چلے چلئے..

ایک مرتبہ پھر ٹاؤن ہال اور ہانز کرسچن اینڈرسن کا مجسمہ، نہروں کے کنارے دیدہ زیب مکان اپنی قدامت میں محفوظ شدہ.. پارک اور معروف شاپنگ سنٹر.. اعجاز چوہدری نے اپنے موبائل پر کسی صاحب کو کُچھ ہدایات جاری کیں، کار کو ایک فٹ پاتھ کے پہلو میں روکا اور جتنی دیر میں وہ رُکی وہ صاحب مشروبات اور کھانے کی اشیاء کا ایک پلندہ اٹھائے چلے آ رہے تھے.. معلوم ہوا کہ اعجاز چوہدری کوپن ہیگن کی وُہ مُنّی ہیں جو اس کی ہر گلی میں نیک نام ہے.. یعنی ہر کوچے، ہر بازار میں کوئی نہ کوئی پاکستانی اُن کا مطیع ہے جو ایک فون پر کشاں کشاں چلا آتا ہے..

''اور کیا دیکھیں گے؟'' شرلاک ہومز صاحب نے اپنی ٹوپی کو ذرا سا اوپر کر کے ماتھے کو نمایاں کیا..

''اب ہم ڈنمارک کی پہچان یعنی اینڈرسن کی ننھی جل پری کا مجسمہ دیکھنا پسند کریں گے جو ایک چٹان پر براجمان ساحل سمندر پر افق پر اپنی پتھریلی آنکھیں جمائے ہوئے ہے.. میمونہ اُس کا دیدار کرنا چاہے گی..''

اور میمونہ نے میری بات منقطع کر دی کہ اُسے دیکھنا اتنا ضروری بھی نہیں ہے.. باہر بہت سردی ہے اور سمندر کے کنارے تو بہت ہی سردی ہوگی.. رہنے دو..

''بیگم یہ ننھی جل پری میرے ناول ''خس و خاشاک زمانے'' کا ایک کردار ہے اور میں اُسے زندہ کر کے پاکستان سے لے آیا تھا جہاں وہ ایک بی بی مریم کی مانند روشن کی موت پر سوگوار ہوتی تھی..''

''پھر بھی رہنے دو..''

اب صدف سفید کوٹی چہکی ''ہم اُسے یُوں بھی نہیں دیکھ سکتے کہ وہ تو چین گئی ہوئی ہے..''

کارآمد ثابت نہ ہوا..جیسے ایک بوڑھے شخص کے ساتھ بے شک نوجوان چار جرلگا دیئے جائیں تب بھی وہ ٹھس ہی رہتا ہے۔ چنانچہ اعجاز چوہدری نے اپنے موبائل کے ساتھ ہماری چند تصویریں اتاریں لیکن وہ ابھی تک منظر عام پر نہیں آ سکیں..

اب یہ جو اعجاز چوہدری تھے، یہ ایک ٹیولپ کے پھول کی مانند دھیرے دھیرے کھلے.. ٹیکسیوں کی ایک فلیٹ کے مالک تھے اور آج کے دن صرف میری محبت میں ڈرائیور ہو گئے تھے..میری تحریروں سے آشنائی رکھتے تھے، سرسری طور پر میری کسی کتاب کا کوئی حوالہ دے دیتے مجھے متاثر کرنے کے لیے نہیں، یونہی سرسری..دلدار پرویز بھٹی اور اعتزاز احسین کے علاوہ بہت سے معروف لوگوں کے قریب رہے تھے..عمدہ شاعری کا بھی ذوق رکھتے تھے..بے شک کم گو اور چُپ سے تھے لیکن جب کبھی بولتے تو جی چاہتا کہ کچھ اور بھی بولیں..میں نے اُن سے شکایت کی کہ اعجاز آخر آپ ہمیں پہلے کیوں نہیں ملے، آخری دن ہی کیوں ملے تو شرمندہ سے ہو کر کہنے لگے، مجھے آج ہی آپ کی آمد کی اطلاع ہوئی تو میں چلا آیا..

صدف کے بقول کوپن ہیگن کی یاترا مکمل ہی نہیں ہو سکتی تھی جب تک ہم اُس مقام کو نہ دیکھ لیں جہاں ایک زمانے میں عورتیں مچھلیاں فروخت کیا کرتی تھیں۔ میں نے سوچا کہ دیکھیں تو سہی کہ وہ عورتیں کیسی ہوتی ہیں جو مچھلیاں فروخت کرتی ہیں..کہ مجھے مچھلیوں سے تو چنداں دلچسپی نہ تھی..تب صدف نے میری جہالت پر تقریباً سینہ کوبی کی کہ تارڑ صاحب..یہ تو پرانے زمانوں کی بات ہے جب وہاں ایک مچھلی منڈی ہوا کرتی تھی اب تو وہاں اُس مقام کی یادگار کے طور پر ایک عظیم الشان سُپر سٹور تعمیر ہو چکا ہے اور اُس کی عمارت کے ماتھے پر ایک مچھلی نقش ہے..

ہم صدف بی بی کے اصرار پر اس سُپر سٹور میں گئے..اور وہ ہمیں خاص طور پر اس سٹور کے مرکز میں واقع ایک شیشہ تالاب تک لے گئی جس کے اندر رنگ رنگ کی مچھلیاں تیرتی پھرتی تھیں اور میں صدف کا دل نہ دُکھا سکتا تھا کہ کہیں وہ تاؤ میں آ کر ہماری واپسی کے ٹکٹ کینسل نہ کروا دے ورنہ ایسی مچھلیاں تو علامہ اقبال ٹاؤن میں مچھلیوں کے جوا یکوئرم تھے..شیشے کے بند تالاب برائے فروخت تھے اُن میں بھی کثرت سے تیرتی پھرتی تھیں..البتہ اس سُپر سٹور میں آنے سے مجھے ایک فائدہ ہوا کہ وہاں چاکلیٹ سے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے سانتا کلاز سجے ہوئے تھے جن میں سے میں نے دو قدرے مسخرے لگتے فادر کرسمس اپنے پوتے یاشار کے لیے خرید لیے..

والے مولوی حضرات نہیں ہوتے..تو چلتے ہیں..

کار کی ونڈ سکرین پر برف گرتی چلی جاتی تھی..

ہم ساحل کے قریب ہوئے تو ارد گرد جتنے بھی شجر تھے، وہ تیز ہوا سے دوہرے ہوتے جاتے تھے اور جتنی جھاڑیاں تھیں وہ اُس کے سرد زور سے سمٹتی جاتی تھیں، اور جو گھاس تھی، اُس کے تنکے سر نہ اٹھا سکتے تھے، بچھتے جاتے تھے اور میمونہ کار کے حدّت آمیز اندرون میں اُنہیں دیکھتی ٹھٹھرتی جاتی تھی..

ہم کار سے باہر آئے تو کٹیلی سرد یلی ہوا کے تھپیڑے ہمارے رخساروں پر تھپڑوں کی مانند برسے اور اُنہیں منجمد کر کے لال گلال کر دیا..ہوا کی شدّت اتنی تھی کہ کھڑا ہونا بھی مشکل ہو رہا تھا..ایک قدم اٹھاتے تھے تو یوں لڑکھڑا جاتے تھے جیسے مے خانے سے نکلتے آخری شرابی لڑکھڑاتے ہیں..

میں اپنے لرزیدہ، بوسیدہ بدن کو سنبھالتا ساحل کی جانب دو چار قدم چلا، سمندر نظر میں آیا اور پھر وہ چھوٹی سی چٹان نظر آئی جس پر ننھی جل پری جلوہ افروز ہوا کرتی تھی اور..وہ اب بھی جلوہ افروز تھی..وہاں موجود تھی..

میں نے ایک بچے کی مانند خوش ہو کر اپنے پیچھے چلی آتی لڑکھڑاتی، سرد ہوا کے تھپیڑے سہتی میمونہ کو آواز دی..بیگم چلی آؤ..وہ چین سے واپس آ گئی ہے..یہ صرف صدف تھی جو خاصی مایوس ہوئی کہ آخر یہ کیوں ایسے واپس آ گئی ہے کہ مجھے بھی خبر نہ ہوئی..

برسوں پہلے جب میں نے اس ننھی جل پری کو دیکھا تھا تو مجھے یہ یونہی سی دو نمبر قسم کی جل پری لگی تھی لیکن اس بار میری نظر اُس پر ٹھہری تو..ٹھہری ہی رہی اور یہ نظر ٹھٹھرتی ہی رہی..اُس کا بدنی تناسب اور خوبصورتی تو بہ شکن تھی..کربناک سردی کے باوجود میں اُسے دیکھتا چلا گیا..اگر میں تب اُن گئے زمانوں میں اُس کے برہنہ خدوخال سے متاثر نہ ہوا تھا تو اس لیے کہ اُن زمانوں میں ہم دیگر جینوئن جل پریاں بھی دیکھا ہی کرتے تھے تو اُن کے موازنے میں یہ ہمیں معمولی لگی تھی لیکن اس عمر میں جب جل پریاں آپ سے پرے پرے رہتی ہیں، پاس نہیں پھٹکتیں تو یہ والی جل پری بھی غنیمت تھی..افسوس اس بات کا ہوا کہ وہاں دو سردار حضرات اُس کے بدن پر ہاتھ پھیرتے اُس کے ہمراہ تصویریں اتروا تے تھے اور وہ بھی نہایت واجبی سے بے ہودہ سردار..ننھی جل پری پر یہ زمانے بھی آنے تھے..

میرے کیمرے کی بیٹری ڈنمارک میں قدم رکھتے ہی شدید برفباری کی تاب نہ لا کر ٹھس ہو چکی تھی اور میں اپنے ساتھ اس کا چارجر لانا بھول گیا تھا..طرح طرح کے چارجر آزمائے لیکن کوئی بھی

ہمارے لیے ڈنمارک کے مہنگے ترین اور مشہور عالم چاکلیٹوں کا ایک بیگ اٹھائے چلے آئے..بقول اُن کے.. پاکستانی فلموں کی چند مشہور نیک پروین اداکارائیں جن میں سے کُچھ اپنے گھروں میں غالب کی مانند جوئے کا اہتمام کرتی تھیں اُن سے انہی چاکلیٹوں کی فرمائش کرتی تھیں..

کوپن ہیگن ایئرپورٹ کے باہر برف گرتی تھی لیکن اُس کے اندر ہمیں رخصت کرنے والے اعجاز چوہدری اور صدف مرزا کی مہربانیوں اور اُلفتوں کی حدّت تھی..

یورپ کے مختلف شہروں کی جانب روانہ ہونے والی پروازیں دھڑا دھڑ معطّل ہو رہی تھیں..

پراگ..معطّل..پیرس..کینسل..وی آنا..معطّل..کہ یہ ایئرپورٹ برف سے بھر چکے تھے..

اور ایمسٹرڈیم..قدرے تاخیر..انتظار کیجیے..

صد شکر کہ ہم مکمل طور پر معطّل نہ ہوئے، دو تین گھنٹوں کی تاخیر کے بعد بہر طور مائل پرواز ہو گئے..

ایمسٹرڈیم میں اترنے کے بعد ہم نے بیرونی دروازے کے شیشوں سے ناک لگائے مضطرب منتظر ہم نے جس شخص کو دیکھا اُسے قطعی طور پر ناپسند کیا..

یہ اعجاز سیفی کا چہرہ تھا..

وہ ہمیں ہالینڈ سے الوداع کہتے ہوئے بتا چکا تھا کہ اسے مانچسٹر میں رہائش پذیر اپنی ہمشیرہ کے ہاں جانا ہے تو واپسی پر وہاں موجود نہ ہو سکے گا..اور وہ وہاں موجود تھا۔رات کے اس پہر ایئرپورٹ کے بیرونی لاؤنج کی کھڑکیوں میں سے جھانکتا ''تارڑ صاحب..یہ تو نہیں ہو سکتا کہ آپ ڈنمارک سے واپس آئیں تو میں یہاں آپ کا استقبال کرنے کے لیے نہ آؤں..مجھے آنا تھا..'' میرا دل اس شخص کے لیے رکنے کو آیا..وہ ہیگ سے ڈرائیو کرتا ہوا اس رات میں صرف میرے لیے یہاں ایمسٹرڈیم کے سکپ ہول ایئرپورٹ پر آ کر شیشہ دیوار کے ساتھ چہرہ لگائے میرا منتظر ہوا تھا..

وہاں ایئرپورٹ کے باہر حسب معمول شاہد ہمارے لیے کار کے دروازے وا کرتا تھا اور جب ہم ہیگ پہنچے تو اعزاز اور ناجیہ ابھی تک سوئے نہ تھے، رات کے کھانے کی میزبانی پر ہمارا انتظار کر رہے تھے..

♦♦.....♦♦.....♦♦

دوپہر کے کھانے کے لیے ہمیں ایک پاکستانی پیزا ریستوران میں لے جایا گیا۔ میز پر ہمارے لیے جو پیزا سجایا گیا اُس کا دل پاکستانی تھا، خوب مرچیلا اور لاہوری ذائقے والا۔ اور وہاں وہ تلی ہوئی مچھلی بھی تھی جو صرف ایک پاکستانی ہی تل سکتا ہے۔ یہاں ہماری ملاقات پیا نام کے ایک دلچسپ لاہوری کردار سے ہوئی اور وہ بھی ایک حنوط شدہ شخص تھا۔ ابھی تک گوالمنڈی، گاندھی سکوئر اور ریلوے روڈ پر رہتا تھا۔ وہی لب ولہجہ اور وہی باتونی پن۔ وہ میرے ایک دیرینہ اگرچہ ناقابلِ اعتبار کم از کم بیویوں کی تعداد میں ناقابل اعتبار دوست راشد حسن رانا کا بقول اُس کے ایک لنگوٹیار ہا تھا۔ رانا، بیویوں کے علاوہ لنگوٹ بھی اکثر بدلتا رہتا تھا۔ میں پھر کبھی اس گوالمنڈی کے رہنے والے رانا کے بارے میں تفصیل سے لکھوں گا جو آقا بیدار بخت کا شاگرد تھا۔ بنیادی طور پر ایک سیاسی سُرخا جانور تھا، پنجابی کا ایک سوہنا شاعر تھا۔ اور کم از کم ایک موقع پر اُس نے مجھے لاچار کر دیا جب ایک ٹیلی ویژن شو کے دوران میری ایک نوخیز اور بہت ہی سُریلی ساتھی میزبان نے ازاں بعد مجھ سے میری ایک کتاب پر آٹوگراف حاصل کیے اور پھر اپنی والدہ صاحبہ سے میرا تعارف کروایا تو اُن خاتون نے ذرا لجا کر کہا کہ۔ ''تارڑ صاحب... ویسے یہ تو آپ کی بیٹی ہے۔'' یقین مانئے میں لرز گیا۔ کیا جانئے کہاں کس مقام پر کچھ لغزش ہوگئی تھی تو میں نے گھگھیاتے ہوئے ایک مسکین آواز میں اپنی گھگھیائی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ ایک لکنت آمیز لہجے میں کہا۔ ''مم۔ مم۔ میری بیٹی۔''

''آپ کے دوست کی بیٹی۔ آپ کی بیٹی ہی تو ہوئی۔'' اُن خاتون نے کہا۔ ''میں راشد حسن رانا کی بیوی ہوں۔ آپ کی بھابھی۔''

میں نے بعد میں رانا کو بہت مطعون کیا کہ کمبخت مجھے بتا تو دیا کرو کہ ان دنوں میری بھابھی کونسی ہے۔

یہی راشد حسن رانا۔ اور برسوں سے ہماری ملاقات نہ ہوئی تھی یہاں ڈنمارک میں پھر سے زندہ ہوگیا تھا۔

ہم اُس شب ایئرپورٹ کی جانب روانہ ہوئے تو کوپن ہیگن کی وہ شب ایک برف آلود سفیدی سے تاریکی کی جانب سفر کرتی تھی۔

راستے میں اعجاز چوہدری کسی مقام پر رُکے، کسی شاپ میں شڑپ سے گئے، واپس آئے تو

بھی بہت دور ہوتا ہے.. چنانچہ وہ کئی چوک عبور کرتی طویل فٹ پاتھ طے کرتی چلتی گئی اور ہم دونوں ہانپتے ہوئے شکایت بھی نہ کر سکتے تھے کہ اتنے مہربان میزبانوں سے کسی بھی نوعیت کی شکایت کرنا جائز نہیں ہوتا.... سویڈن کی مانند ہیگ میں بھی کرسمس کی آمد آمد تھی، اس کے کوچۂ و بازار سجاوٹ کی روشنیوں سے دمکتے ہلکی برفباری میں کسی سرد پرستان کا روپ دکھائی دیتے تھے.. اور پرستان میں پریاں وغیرہ تو ہوتی ہی ہیں لیکن یہاں وہ ڈچ قومیت کی تھیں اور فٹ پاتھوں پر اِٹھلاتی پھرتی تھیں اگرچہ ان میں سے بیشتر کے ہمراہ مقامی جن حضرات بھی تھے..

ناجیہ نے ہمیں ہالینڈ کی ملکہ کا محل دکھلایا تو شدید مایوسی ہوئی.. ثابت ہو گیا کہ واقعی ڈچ لوگ بے حد کنجوس ہوتے ہیں.. اور ان کی ملکہ بھی ایک کنجوس ملکہ.. بلکہ کنجوسوں کی ملکہ.. بھئی ہمارے ہاں کے کئی دو نمبر سیاستدانوں.. ایسے جرنیلوں جو بغیر کوئی جنگ لڑے فاتح وغیرہ ہو گئے.. بے چارے سے بیوروکریٹوں اور ایماندار ججوں وغیرہ کے بھی ایک نہیں متعدد گھر ہوتے ہیں، اس ملکہ کے گھر سے کہیں شاندار اور عالی شان ہوتے ہیں اور اُن کے ماتھوں پر.. یعنی گھروں کے ماتھوں پر ''ماشاءاللہ'' کے بورڈ بھی آویزاں ہوتے ہیں اور اُن کے اندر درود وسلام کی ایمان افروز محافل برپا ہوتی ہیں.. بس کفار اور مومنین میں یہی فرق ہوتا ہے.. یہ کنجوس کفار کرپٹ بھی تو نہیں ہوتے اسی لیے تو اُن کی ملکہ اتنے معمولی گھر میں گزر اوقات کرتی ہے..

ہیگ کے گلی کوچوں کی رونقوں میں سیر کرتے ہوئے میں نے ناجیہ کو ایک سازش میں شریک کیا.. یہ میری بیگم میرا کہا تو مانتی ہی نہیں.. اور یہ دو چار برس نہیں تقریباً نصف صدی کا قصہ ہے کہ کبھی میرا کہا اس نے نہ مانا تو تم کسی نہ کسی طرح اسے کوئی اونی کوٹ یا سویٹر وغیرہ خریدنے پر مائل کر لو.. ڈھیر سارے یورو بیکار پڑے ہیں..

''فکر ہی نہ کریں تارڑ صاحب..'' اُس نے نہایت اعتماد سے کہا..

ہم ایک نہایت پرہجوم سٹور میں داخل ہوئے تو ناجیہ ایک تیر کی مانند سیدھی زنانہ ملبوسات کے شعبے میں اتر گئی اور فوری طور پر ایک جیکٹ کی خوشنمائی پر نچھاور ہوتی جذباتی ہو گئی.. ''میمونہ آپ میری مانیں تو اس جیکٹ کو ہاتھ سے نہ جانے دیں.. اتنی ارزاں اور نہایت خوش نظر جیکٹ دوبارہ نہیں دستیاب ہو گی..'' میمونہ بھی پل بھر کے لیے ناجیہ کے دام میں آ گئی اور اُس جیکٹ کو پہن کر ایک آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا سراپا ملاحظہ کیا اور پھر اُسے اتارتی ہوئی بولی ''ناجیہ ایک تو یہ جیکٹ مجھے پوری نہیں آ رہی

''ہالینڈ کی کنجوس ملکہ اور ناجیہ کی ناکام سازش''

ایک پنجابی کہاوت ہے کہ موسیٰ موت سے ڈرا تو موت آگے کھڑی تھی..ہم بھی ڈنمارک اور سویڈن کی برفباری سے ڈرے تھے اور ہالینڈ پہنچے تو یہ موت آگے کھڑی تھی۔اگرچہ اس میں ابھی شدت نہ آئی تھی، وقفوں کے ساتھ برف کے گالے ہمارے گالوں پر گرتے پگھلتے رہتے..ناجیہ کے ہاں اُن کے ایک جاننے والے بریگیڈیئر یوسف اور اُن کی اہلیہ آئے ہوئے تھے..بریگیڈیئر صاحب جو یقیناً لائق فائق ہوں گے، صبح سویرے کسی ٹرین پر سوار ہو کر جانے کہاں اور کیوں نکل جاتے اور اُن کی اہلیہ ناجیہ کو آگے لگائے کیش بہ کف ایک شاپنگ کروسیڈ پر نکل جاتیں..سرِشام واپس آتیں تو اپنے وزن سے زیادہ بھاری شاپنگ بیگز یوں گھسیٹتی ہوئی آتیں کہ ہلکی برف پر اُن کی گھسٹ سے ایک راستہ سا بن جاتا اور آپ آسانی سے یہ نقشِ شاپنگ بیگز ناپتے اُن سٹوروں تک پہنچ سکتے تھے جہاں سے اُنہوں نے شاپنگ کی تھی..اور میں شدید احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتا کہ میری بیگم ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی رہتی تھی اور میں اصرار کرتا رہتا کہ بھلی مانس اپنے لیے کچھ تو خرید لو..کوئی اونی کوٹ، کوئی سویٹر، کوئی خفیہ جامہ زیبی تو وہ کہتی..ریت کے ذرّے جتنا کوئی ایمسٹرڈیم کا ہیرا تو تم نے مجھے لے کر نہیں دیا تو یہاں سے کیا خریدوں..ویسے بھی بہترین شاپنگ تو امریکہ میں ہوتی ہے..اور مجھے کسی شے کی ضرورت بھی نہیں..میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ یہ ایک عدد نادان بیگم تھی کہ ضرورت کی اشیاء خریدنا تو کاروبارِ حیات کی مجبوری ہے..بے ضرورت خریداری کو ہی تو شاپنگ کہتے ہیں، تو بیگم نکل لو..پر کہاں..

ایک روز ناجیہ بصد اصرار ہمیں ہیگ کے قابلِ دید مقامات اور دیدہ زیب گلی کُوچوں کی سیر کے لیے پیدل ہی لے نکلی..کہ بس ہم نے اس پُل کے پار اُس نہر کنارے تک جانا ہے..قریب ہی ہے..یہ بھی بیگم کی مانند ایک نادان ناجیہ تھی جو نہیں جانتی تھی کہ اس عُمر میں جو کچھ بھی قریب ہوتا ہے وہ

طور پر عوام نے بھی ایک پرخلوص اور قابل قدر کاوش کی..اعزاز نے اس سلسلے میں بھی ایک تفصیلی رپورٹ پیش کی..اُن کا کہنا تھا کہ جہاں پاکستانی سفارت خانے کی بھرپور مہم کے نتیجے میں ہالینڈ کی حکومت نے سرکاری طور پر تقریباً بارہ ملین یوروسیلاب زدگان کی مدد کے لیے وقف کیے وہاں عام ڈچ لوگوں نے گلی کوچوں میں اس سیلابی المیے سے نبرد آزما ہونے کے لیے تقریباً بائیس ملین یورو کی خطیر رقم جمع کی..راہ چلتے، عام اور معمولی حیثیت کے لوگوں نے پاکستان کے سیلاب زدگان کے لیے اپنے دل کھول دیئے اور جیبیں الٹ دیں..اور یاد رہے کہ یہ وہی ڈچ لوگ ہیں جن کی سب سے بڑی پہچان دنیا کا عظیم ترین مصوّر فان خوخ ہے جس کے پوتے کو ایک دستاویزی فلم ''فتنہ'' کی ہدایتکاری کے ''جُرم'' میں ایک پاکستانی نے نہایت بے دردی سے ہلاک کر دیا تھا..اور اس کے باوجود کہ وہ بہت دکھی ہوئے اُنہوں نے صرف ایک فرد کے مجنونانہ فعل کے باعث پوری پاکستانی قوم کو مطعون نہ کیا..کہ وہ انسانیت پر یقین رکھتے ہیں جو ایک ابدی قوت ہے جب کہ مذہبی تنگ نظری اور جہالت ایک عارضی پاگل پن ہیں..کچھ یوں دوبارہ موازنہ کر لیجیے کہ اگر پاکستان میں مقیم ایک ڈچ نژاد گورا جو پاکستان کی سہولتوں سے لطف اندوز ہوتا اپنا رزق کماتا اپنے خاندان کو ایک بہتر اور درخشاں مستقبل کے راستے دکھاتا، صرف پاکستان کی وجہ سے..وہ گورا ڈچ اگر خدانخواستہ کھلے عام علامہ اقبال کے پوتے کو قتل کر دیتا تو پھر ہمارا ردعمل کیا ہوتا، کیا ہم اُسے معاف کر سکتے..اور اُس کے ہم وطنوں کی مصیبت کی گھڑی میں اُن کے لیے اتنی خطیر رقم گلی کوچوں میں مانگ تانگ کر روانہ کرتے..

ڈائننگ روم کے منقّش چوبی آتش دان کے اردگرد پاکستانی خوراکوں کی میزیں لبریز ہوتی تھیں اور حسب روایت یعنی پاکستانی روایت عوام الناس اُن پر پل پڑے اور لمحوں میں اُن کا صفایا کر دیا..اور پھر کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز..اور یہ بندہ..یعنی میں قدرے بُھوکا رہا کہ میری پلیٹ میں جو ایک آدھ چکن بوٹی تھی وہ ان چھوئی یا کنواری ہی رہی اور وہ جو نان کا ایک قتلہ تھا وہ بھی حلق آشنا نہ ہوا کہ میرے ہم وطن مجھ سے گفتگو کرنے کے تمنائی مجھے اتنی مہلت ہی نہ دیتے تھے اگرچہ خود مسلسل مشغول رہتے تھے..بہرطور میں نے کسی نہ کسی طرح سلاد کا کچھ گھاس پھونس وغیرہ نذر شکم کر ہی لیا..

اور جب یہ اجتماعی شکم پُری اختتام کو پہنچی تو میرے اعزاز کی محفل کا آغاز ہو گیا، اب جگر تھام کے بیٹھ کہ میری باری آئی بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اب شکم تھام کے بیٹھ کہ میری باری آئی..

اور اگر میرے سائز کی ہوتی تو بھی میری عمر ایسی نوخیز جیکٹ پہننے والی نہیں..نہیں خریدوں گی..''

ساری منصوبہ بندی اور سازش دھری کی دھری رہ گئیں..

اور اُس شب ہیگ میں بھی برف گرتی تھی اور ساز بجتے تھے..

اعزاز کا اصرار تھا کہ ٹھیک ہے ہیگ، برسلز اور کوپن ہیگن میں آپ کے اعزاز میں تقریبات منعقد ہوئیں لیکن اعزاز کو بھی تو یہ اعزاز دیں کہ پاکستانی سفارت خانے کی جانب سے آپ کے اعزاز میں ایک چھوٹی سی محفل ہو جائے..بے شمار دوست ہیں جو ہیگ کی محفل میں نہ آسکے اُن سے دو چار باتیں کر لیجیے گا..میں نے صدقِ دل سے عرض کیا کہ اعزاز میں وہ دو چار باتیں تو بار بار کر چکا، تو اب میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں، تو پلیز رہنے دیں..کہنے لگے، آپ کے لیے کوئی خاص بندوبست نہیں کروں گا..میں جب سے یہاں تعینات ہوا ہوں ہر دو چار ماہ بعد پاکستانی کمیونٹی کو اپنی رہائش گاہ میں مدعو کر کے اُنہیں سفارتخانے کی کارکردگی سے آگاہ کرتا ہوں، اُن کی شکایات کا مداوا کرتا ہوں، اُن کے مسائل سُن کر اپنے اہلکاروں کو اُنہیں حل کرنے کی ہدایت کرتا ہوں تو آپ کے بہانے یہ میٹنگ بھی ہو جائے گی..انکار کی گنجائش کیسے ہو سکتی تھی..

سفیرِ پاکستان کی رہائش گاہ کا مرکزی ہال اُس شام چھت سے لٹکتے فانوسوں کی سفید روشنیوں میں ڈوبا پاکستانی مہمانوں کی موجودگی کی اپنائیت محسوس کر رہا تھا..وہاں مقامی صحافی، سفارتکار، صنعت کار اور زندگی کے دیگر شعبوں سے متعلق اور نامور پاکستانی کثیر تعداد میں موجود تھے..اعزاز نے حسبِ روایت سب سے پہلے سفارت خانے کی مکمل کارکردگی کی رپورٹ پیش کی، اس کی بہتری کے لیے تجاویز کی درخواست کی..شکایات اور مسائل نہایت تحمل سے سن کر اپنے جونیئر سفارت کاروں کو انہیں فوری طور پر حل کرنے کی ہدایت کی..اُن کا روّیہ ایک سفیر کا ہرگز نہ تھا، بلکہ ایک ہمدرد درخواست گزار کا تھا..اعزاز کو ہالینڈ میں ایک عوامی سفیر کیوں کہا جاتا ہے یہ اُس شب کھلا..اور ہالینڈ کی قربت میں جو یورپی ملک ہیں وہاں کے پاکستانی یہ خواہش کیوں کرتے ہیں کہ کاش اعزاز کی پوسٹنگ اب ہمارے ہاں ہو جائے..پاکستان کے طول و عرض میں سب کچھ بہا لے جانے والے ہولناک سیلاب کی تباہ کاریوں کے مداوے کے لیے دنیا بھر میں امدادی کوششوں میں ہالینڈ کی حکومت اور خاص

''ذاتی ڈائنوں کے ہمراہ ایک ایرانی ریستوراں میں اور کیا پاکستانی بھی پھولوں سے پیار کرتے ہیں''

ہیگ کے اُس سب سے اعلیٰ خوراک تیار کرنے والے ایرانی ریستوران کے در و دیوار ایسی معمولی درجے کی تصاویر سے سجے تھے جو اہل مغرب کے مشرق کے تصور کے عین مطابق تھیں یعنی کہیں عمر خیام ایک لامبی گردن اور ترچھی آنکھوں والی منگول دوشیزہ کے ہاتھوں میں تھامی ہوئی صراحی سے اپنا جام لبریز کر رہا ہے اور کہیں شیراز کے جعلی سے گلاب کھلتے ہیں اور ایک سفید ریش مولانا وجد کی حالت میں رقص فرماتے ہیں..

دنیا بھر میں جو بھی غیر ملکی ریستوران پائے جاتے ہیں وہ مقامی گاہکوں کے ذوق کے مطابق آراستہ کیے جاتے ہیں.. مثلاً چینی ریستورانوں میں چینی لالٹینیں جھولتی ہیں اور اژدھے پھنکارتے ہیں.. ہندوستانیوں کے ہاں ہر جانب ہاتھی ہی ہاتھی نمائش پر ہوں گے چاہے ریستوران کے مالک نے ساری عمر کوئی ہاتھی دیکھا بھی نہ ہو.. اُدھر پاکستانی ریستوران چونکہ یہ طے نہیں کر پاتے کہ پاکستان کی ثقافت ہے بھی کہ نہیں اور ہے تو کیا ہے.. چنانچہ وہاں ہندوستان اور پاکستان کا ملا جلا پروگرام ہوتا ہے.. ہاتھی بھی ہوتے ہیں اور تاج محل بھی.. اگر کسی کو خیال آ گیا تو شالیمار بھی ہو سکتا ہے.. یہ الگ بات ہے کہ کسی بھی پاکستانی ریستوران میں داخل ہونے والے کو پہلے تو ایک اندھیر نگری نظر آتی ہے جس میں باریش حضرات غیض و غضب کے عالم میں لڑکیوں کے سکول نذرِ آتش کر رہے ہیں.. غیر ملکی کرکٹ ٹیموں پر حملہ آور ہو رہے ہیں.. کفار کو جہنم واصل کرتے جنت کما رہے ہیں اور لاشوں پر کھڑے ہو کر اللہ اکبر کے نعرے بلند کر رہے ہیں لیکن پھر اُنہیں احساس ہوتا ہے کہ نہیں ہم پاکستان میں تو نہیں.. اپنے امریکہ یا ہالینڈ وغیرہ میں ہیں اور اس دوران اُن کی نظر کسی ہاتھی یا شالیمار پر جا ٹھہرتی ہے اور وہ اطمینان

مجھے حاضرین کے سامنے ایک منقش شاہانہ کُرسی پر بٹھا کر پیش کر دیا گیا..اور وہاں جتنے بھی پاکستانی تھے اُن سب کی آنکھوں میں میرے لیے چاہت کے سوا کچھ نہ تھا..میں نے کُچھ بے ربط سی گفتگو کی..کُچھ سوال و جواب ہوئے اور اس دوران میمونہ دیگر خواتین کے ہمراہ اگلی نشستوں پر براجمان مجھے ہر گز فخر سے نہیں بلکہ مجھ پر طنزیہ نگاہیں ڈالتی دیکھتی رہی کہ..تم خوش بخت ہو..بے سروپا باتیں کرتے ہوئے بھی لوگ تم سے جانے کیوں محبت کرتے ہیں..ایسی باتیں تو تم دن رات کرتے ہو..

اس تقریب ملاقات کا سب سے یادگار لمحہ میرے لیے وہ تھا جب ایک صاحب..اور مجھے بدقسمتی سے اُن کا نام یاد نہیں..ہجوم میں سے اٹھ کر آئے اور مجھ سے نہیں، حاضرین سے مخاطب ہو کر کہنے لگے..تارڑ صاحب پہلی بار تقریباً پینتالیس برس پیشتر ہالینڈ میں آئے تھے اور انہوں نے اپنے پہلے سفرنامے ''نکلے تری تلاش میں'' میں ہالینڈ کے حوالے سے ایک لوک گیت درج کیا تھا کہ..جب موسم بہار ہو گا تو میں تمہارے لیے ایمسٹرڈیم سے ٹیولپ کے پُھول لے کر آؤں گا..جب مجھے تارڑ صاحب کی ہالینڈ میں آنے کی خبر ملی تو میں نے اگرچہ ان دنوں خزاں کے موسم ہیں، ٹیولپ کے پُھول کہیں نہیں کِھلتے، اس کے باوجود میں نے ایک نرسری سے ٹیولپ کے کچھ زرد پھول حاصل کر لیے جو میں اُن کی خدمت میں پیش کرتا ہوں..

یہ جو آپ کی ناقص تحریر کی اُلفت ہے اُس کی شدت سے کیسے کیسے بے موسم پُھول بھی کِھل جاتے ہیں..گُلوں میں رنگ بھرتی ایک بادِ نو بہار بیگ کی اُس شام میں چلنے لگی جب میں نے اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے کی ناکام کوشش میں ٹیولپ کے اُن زرد پھولوں کو وصول کیا..

♦♦.....♦♦.....♦♦

اُن دنوں جب میں سرد سویرے جوگرز پہن کر ریموٹ کا بٹن دبا کر اُس سفید محل کے آہنی گیٹ کو کُھلنے پر مجبور کر کے ہیگ میں سیر کے لیے نکل جاتا تھا تو اس دوران میں نے ایک قدیم اور پتھریلی گلی میں ایک مختصر سی پھولوں کی دکان دریافت کی..اور اس دکان کے باہر فٹ پاتھ پر مختلف اقسام کے پھول، پتّے اور بلب گملوں میں سے پھوٹتے تھے..میں دروازہ کھول کر اندر چلا گیا تو ایک ادھیڑ عمر ڈچ خاتون اپنی جواں سال بیٹی کے ہمراہ رنگ رنگ کے شوخ رنگ پھولوں کی تراش خراش کرتی اُنہیں گُل دستوں میں ترتیب دے رہی تھی..وہ دونوں کچھ دیہاتی سی لگتی تھیں اور اُن کے رخسار سرخ تھے اور بدن صحت مند..وہ مجھے دیکھ کر قدرے متعجب ہوئیں کہ یہ کون آیا سویرے سویرے..تب میں نے ذرا جھجکتے ہوئے پوچھا..کہ میں آپ کے ہاں سے کچھ پھولوں کے گملے اور اُن میں سے اُگتے ہوئے کچھ بلب اپنے ساتھ اپنے ملک لے جانا چاہتا ہوں تو کیا یہ وہاں زندہ رہ جائیں گے..پھول دے جائیں گے..

اور ظاہر ہے اُس ڈچ خاتون نے اپنے ایپرن پر ہاتھ پونچھتے پوچھا ''کس ملک میں؟''

''پاکستان..''

وہ خاتون لمحہ بھر کے لیے ٹھٹکی..''پاکستان؟..کیا وہاں بھی لوگ پھولوں سے پیار کرتے ہیں؟''

''ہاں..'' میں نے صرف اتنا کہا..اور بہت بے چارگی سے کہا..''پاکستانی پھولوں سے بہت پیار کرتے ہیں..''

میں جانتا تھا کہ محض پاکستان کہنے سے اُس بوڑھی ڈچ خاتون کے تصوّر میں صرف فان خوخ کے پوتے کے قاتل اور جنون اور تنگ نظری کے سوداگر ابھرتے ہیں اور وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ ہم پاکستانیوں کی نمائندہ تصویر نہیں ہے..ہرگز نہیں ہے کہ ہم تو اپنے محبوب کو بھی ایک پھول موتیے کا مار کر جگاتے ہیں..ہمارے ہاں گُل خان، گُلریز خان..یاسمین..نرگس اور گلابو جیسے نام ہوتے ہیں، ہمارے شمال میں، گلگت بلتستان میں، گھروں کی کچی دیواروں پر گھی کے خالی ٹینوں اور پلاسٹک کے گملوں میں پھول کھلے ہوتے ہیں، بلتی لوگ اگر ایک گھاٹی میں کوئی پھول کھلا دیکھتے ہیں تو اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اُسے توڑ کر اپنی ٹوپی میں سجا لیتے ہیں..فیئری میڈو کی برفوں میں سے نمودار ہونے والے سٹرابری کے پہلے پھول سے بہار کا آغاز ہوتا ہے..

''آپ کے ہاں پاکستان میں ان دنوں کیسے موسم ہوتے ہیں..شاید قدرے گرم ہوتے ہیں..یعنی منفی درجہ حرارت سے ایک دو ڈگری اوپر ہوتے ہیں..''

کا سانس لیتے ہیں..

اعزاز اور خاطر مدارات پر اصرار لازم وملزوم تھے کہ ہم نے اب تک آپ کی مناسب میزبانی نہیں کی، گنگناتے گیت الاپتے جمیل کے بنائے ہوئے کھانے گھر میں کھلاتے رہے ہیں تو ہم آپ کو ڈائن آؤٹ کروانا چاہتے ہیں..اگر آپ کی انگریزی کمزور ہے تو یاد رکھیے یہ وہ والی ڈائن نہیں ہے جس کا نام لے کر آپ کی امّاں جان آپ کو بچپن میں ڈراتی تھیں کہ چپ ہوتے ہو کہ نہیں ورنہ ڈائن آ جائے گی، تمہیں کھا جائے گی بلکہ یہ ڈنر والی ڈائن تھی جو آؤٹ تھی اور ایک ایرانی ریستوان میں تھی.. یہاں بریگیڈیئر صاحب یونی فارم میں نہیں تھے بلکہ فُل فارم میں تھے اور اپنے مصر کے قیام کے قصّے سناتے تھے جہاں وہ ہر فلیٹ اور ہر گھر سے اس لیے نکالے جاتے تھے کہ اُن کے رفیق قیامت کی نظر رکھتے تھے اور یہ نظر آس پاس کی تمام خواتین پر مسلسل رکھتے تھے..اُن کی بیگم کسی ایسے کمبل کے لیے کف افسوس ملتی تھیں جو بہت کم قیمت پر برائے فروخت تھا اور وہ اسے خرید نہ سکیں، اعزاز کی بیٹی جو اس لیے بھی دھان پان تھی کہ کھانے پینے سے شدید گریز کرتی تھی لیکن اُسے ایرانی چکن اور چاول اتنے مرغوب تھے کہ وہ سر جھکائے اُنہیں رغبت سے کھاتی چلی جاتی تھی..خوراک کے خوش ذائقہ ہونے میں کچھ کلام نہ تھا..یہ ایک یادگار شام تھی..ایک ڈائن آؤٹ شام..جس میں مرد حضرات اپنی ذاتی ڈائنوں کے ہمراہ شریک ہوئے..

ہماری واپسی کے لمحے قریب آ رہے تھے اور ہم نے محسوس کیا کہ جمیل کے سنگ سونگ لہجے میں بھی کچھ سوگواری آ رہی ہے..او دُور کے مسافر ہم کو بھی ساتھ لے لے..ہم رہ گئے اکیلے.. یا پھر ہالینڈ کی محبت کو دل سے نہ جدا کرنا..اور..او جانے والے رے ٹھہرو ذرا رُک جاؤ..

اور ہم رُک نہ سکتے تھے..

پاکستان بات ہوتی تو میری بہوطیبہ کہتی کہ بابا جان یا شار راتوں کو اٹھ کر کہتا ہے، میں نے دادا، دادی کے پاس جانا ہے..وہ بیمار ہو گیا ہے..آپ آ جایئے..

نومبر کے آخری سانسوں میں وہ یخ بستگی اتر چکی تھی جو بدن کی رگ رگ میں برفیلی کرچیاں بھرتی تھی..

کا پوپلا مُنہ کُھل جائے..کیوں کُھل جائے، ابھی کچھ دیر بعد بیان کرتا ہوں..

ہم نے اُس شاہانہ گھر میں اپنا آخری دوپہر کا کھانا کھایا، اعزاز ہمیں رخصت کرنے کی خاطر سفارت خانے سے آ چکے تھے..ناجیہ نے چوری چھپے چند تحفے ہمارے سامان میں رکھ دیئے تھے..کھانے کے بعد میں ہیگ میں اپنا آخری سگرٹ پینے کے لیے اُس سفید مینڈرلے کے باغ میں چلا گیا جس کا پتہ پتہ بُوٹا بُوٹا حال ہمارا جانے تھا..اس کے بلند قامت اشجار کی شاخوں پر جب میں آیا تھا اگرچہ خزاں کی زردی کے حُزن میں مبتلا کچھ پتے تھے اور وہ اب سب کے سب جدا ہو چکے تھے..کسی بھی آوارہ گردی کے شیڈیول میں بہرطور اداسی شامل ہوتی ہے..گھر سے جدا ہوتے ہوئے اور پھر اُسی گھر کو واپس ہوتے ہوئے..نہ گھر چھوڑنے کو جی چاہتا ہے اور نہ پھر کسی پرائے دیس میں قیام کرنے کے بعد گھر لوٹنے کو جی چاہتا ہے..اور یہ جو اپنے آخری پتوں کو رخصت کر دینے والی درختوں کی برہنہ شاخیں تھیں، مجھے ہمیشہ میرے دوست اختر حسین جعفری کی اُس نظم کی یاد دلاتی تھیں جس کا عنوان ''ایذرا پاؤنڈ کا نوحہ'' ہے..

تجھے ہم کس پھول کا کفن دیں
کہ تو جدا ایسے موسموں میں ہوا
جب درختوں کے ہاتھ خالی تھے

تو میں بھی ہیگ سے ایسے موسموں میں جدا ہو رہا تھا جب درختوں کے ہاتھ خالی تھے..

جس شخص نے ہم دونوں کو ہالینڈ میں اترنے کے بعد وصول کر کے ہیگ پہنچایا تھا، وہی شاہد اب ہمیں ایمسٹرڈیم کی جانب لیے جا رہا تھا اور ہم اُسے احتیاط سے ڈرائیو کرنے کو کہتے تھے کہ ہمارے ایک سُوٹ کیس میں کانچ کا کچھ سامان تھا..مرزا غالب نے جب پنشن کی رقم وصول کرنے کے بعد سب سے پہلے ایک ٹھیلے میں شاید میرٹھ سے خرید کردہ شراب کی بوتلیں لادیں اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے رزق کا تو وعدہ کیا ہے، شراب کا نہیں تو اس کا بندوبست خود کرنا پڑتا ہے تو راستے میں کسی نے اُن کی متاع عزیز کو ذرا بے احتیاطی سے چھوا تو اُنہوں نے کہا تھا کہ صاحب ذرا احتیاط سے..کانچ کا سامان ہے..

اہل مغرب پاکستان کے گرم موسموں کا تصور بھی نہیں کر سکتے..اُن کے ہاں اگر بدن سے بھاری اونی کوٹ اتر جائیں..صرف ایک سویٹر میں گزارا ہو جائے تو یہ گرمی کی آخری شدت ہے تو میں نے ڈچ خاتون کو اپنے موسموں کے بارے میں آگاہ کیا..

''نہیں..میں صرف اپنے پودے اور پھول فروخت کرنے کی خاطر تم سے جھوٹ نہیں بولوں گی..میں تمہیں انہیں خریدنے سے روک نہیں سکتی لیکن نہیں..یہ تمہارے ہاں پنپ نہیں سکتے..''

میں مایوس ہو کر باہر آ گیا..اور باہر برف گرتی تھی..

میں اُن سویروں میں سیر کرتا ہمیشہ اُس فلاور شاپ کے قریب سے گزرتا، رک جاتا..

بے شک تم نہ پنپ سکو، میرے وطن کے موسموں کو سہار نہ سکو اور مرجھا جاؤ لیکن میں نے تمہیں لے جانا ہے..تم بے شک میرے صحن میں نہ کھلو..پژمردہ ہو جاؤ لیکن میں نے تمہیں لے جانا ہے..

جس شام مجھے ہالینڈ سے پاکستان کے لیے پرواز کر جانا تھا اُس کی ہیگ سویر میں سیر کرتا ہوا میں اُس فلاور شاپ کے اندر داخل ہوا اور میں نے کہا..''خاتون میں کچھ خوش نظر پتوں والے گملے اور کچھ کھلنے والی کلیاں خریدنا چاہتا ہوں..بے شک یہ میرے وطن کے موسموں میں مرجائیں..''

''کیا تم وہی پاکستانی ہو جو چند روز پیشتر میری فلاور شاپ میں آئے تھے اور میں نے تم سے کہا تھا کہ ہالینڈ کے یہ بلب جو پھوٹ رہے ہیں شاید تمہارے ملک کے گرم موسموں کو نہ سہار سکیں؟''

''میں بالکل وہی ہوں۔''

''مجھے بعد میں افسوس ہوا کہ میں نے ایسا کیوں کہا..پھول موسموں کے نہیں محبت کے محتاج ہوتے ہیں..موسم چاہے کتنے ہی موزوں کیوں نہ ہوں اگر اُن میں محبت شامل نہ ہو تو کلیاں لب بستہ ہی رہتی ہیں..مجھے یقین ہے کہ یہ پاکستان میں ضرور کھلیں گے..''

میں نے دو گملے ہائی سنتھ کے پسند کیے جن کے بلب پھوٹ چکے تھے..ایک گملا امریلس کے جہازی سائز بلب کا خریدا اور اُس کے مُنہ میں سے بھی ایک کلی جھانک رہی تھی..اور ایک نہایت دیدہ زیب پتوں والا بُوٹا پسند کیا جس میں سے سفید پھول جھانک رہے تھے، اور کچھ کلیاں کھلنے کی منتظر تھیں..اُس گُل فروش ڈچ خاتون نے ان چاروں گملوں کو دبیز کاغذ میں اتنی نفاست اور احتیاط سے پیک کیا جیسے ایک نومولود بچے کو سردی سے بچانے کے لیے ایک کمبل میں پیک کرتے ہیں..

اگر وہ گُل فروش ڈچ مائی اتفاقاً آج یہاں لاہور میں میرے صحن میں آ نکلے تو حیرت سے اُس

''ایمسٹرڈیم ایئرپورٹ ''پلیٹزر پرفیوم''
آئس کریم اور ٹیولپ کے بلب''

ہم دونوں ایمسٹرڈیم سکپ ہول ایئرپورٹ کی وسیع کائنات میں بھٹکتے پھرتے تھے..ہماری پرواز میں چار گھنٹوں کی تاخیر کا اعلان ہو چکا تھا..دنیا کے دیگر ایئرپورٹوں میں ڈیوٹی فری شاپس ہوتی ہیں..آپ وقت گزاری کے لیے اُن میں تانک جھانک کرتے ہیں اور کچھ دیر بعد اُن کا اختتام ہو جاتا ہے اور آپ پھر سے اُنہی شاپس میں مقرر تانک جھانک شروع کر دیتے ہیں لیکن ایمسٹرڈیم ایئرپورٹ ایک ڈیوٹی فری شہر ہے جس میں چلتے چلتے آپ کے جوگرز گھس جاتے ہیں اور وہ اختتام کو نہیں پہنچتا..ہماری جیب یوروز سے گرم ہوتی تھی اور ہم چاہتے تھے کہ ان کی گرمی میں کُچھ کمی آ جائے، ہم کچھ نہ کچھ خرید لیں یعنی ایمسٹرڈیم کے کسی ہیرے کے سوا لیکن وہاں ہمارے خریدنے کے لیے کچھ بھی نہ تھا، امریکہ کے اتنے پھیرے لگے تھے اور وہاں دنیا کی بہترین شاپنگ تھی کہ میری وارڈروب میں اب نہ مزید ٹی شرٹس، جیکٹوں یا قمیضوں کی گنجائش تھی اور نہ ہی شوز کی کچھ کمی تھی بلکہ دو تین شوز ابھی تک میرے پاؤں سے ناآشنا کنواری حالت میں دُھول جمع کرتے تھے..ڈریسنگ ٹیبل پر اتنے پرفیوم، یُو ڈی کلون اور طرح طرح کے چھڑکاؤ خوشبوؤں کی بھرمار تھی کہ اُس پر ایک چھوٹی سی ڈیوٹی فری شاپ کا گمان ہوتا تھا..میمونہ اپنی وارڈروب کھولتی تھی تو اُس میں ٹھنسے ہوئے ہینڈ بیگ اور وہ بھی دنیا کے بڑے اور مہنگے برینڈز کے، اُس کے سر پر گرتے تھے..ان میں سے بیشتر اشیاء بچہ لوگوں کی جانب سے ہمیں مسلسل وصول ہوتی رہتی تھیں...اُن کا خیال تھا کہ اُن کے والدین بے چارے ابھی تک نہایت نادار حالت میں زندگی گزارتے ہیں..والد صاحب صبح کی سیر کے لیے جاتے ہیں تو اُن کے بدن پر نہ کوئی ٹی شرٹ ہوتی ہے، نہ کوئی سویٹر اور نہ ہی سردی سے بچاؤ کی خاطر کوئی ایک جیکٹ..اور والدہ صاحبہ بے چاری گھر سے

ہمارے اُس ایک سُوٹ کیس میں ایمسٹرڈیم سے خرید کردہ ایک بانسائی اور ہیگ کی گُل فروش مائی سے حاصل کردہ چار گملے تھے اور یہ ہمارا کانچ کا سامان تھا..

منظر رخصت ہوتے جاتے تھے..گزر جاتے تھے..

ٹیولپ کے کھیت کے کھیت ابھی پلاسٹک کی چادروں تلے نمود کے دنوں کے منتظر تھے..

دائیں جانب ہم سب کو ایک سکائی سکریپر قسم کا بلند و بالا انسانی کان نظر آنے لگا..حجم میں اتنا بڑا جیسے وہ کائنات کی کُل سرگوشیاں سننے کے لیے وہاں آویزاں کیا گیا ہو..

''تارڑ صاحب یہ ایک دنیا بھر میں سب سے منفرد اور یکتا میوزیم ہے جس میں مختلف انسانی اعضاء کے دیوہیکل تفصیلی مجسّمے ہیں۔ایسے کہ آپ ان کے اندر داخل ہو کر ان کی اندرونی ساخت اور پیچیدگیوں میں گھوم پھر کر ان سے آگاہ ہو سکتے ہیں..آپ کسی بھی انسانی عضو کے اندر سیر کر سکتے ہیں.. اور آپ اگر ایک کان میں داخل ہوتے ہیں تو تصور ہی نہیں کر سکتے کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے تخلیق کرتے ہوئے اُس میں کیسے کیسے معجزے بھر دیئے ہیں..''

ہم ٹھہر نہ سکتے تھے کہ ہمیں پاکستان کے پرواز پکڑنی تھی..ورنہ بہر صورت ٹھہر جاتے..انسانی اعضاء کا وہ میوزیم بہت پیچھے رہ گیا لیکن میرے پراگندہ تصور کا مُنہ زور گھوڑا بے قابو ہو کر بگٹٹ بھاگتا چلا جاتا تھا..کہ آپ ایک کان میں، پھیپھڑوں اور دل میں..جگر اور مثانوں میں داخل ہو کر اُن کی ابوالعجبی کا مشاہدہ کر سکتے ہیں تو پھر وہ جو دیگر اعضاء ہوتے ہیں تو اُن کے اندر داخل ہو کر آپ کیا محسوس کریں گے، وہاں کونسی دنیا کی شہوت ہو گی، کیسی ساخت ہو گی جس نے حضرت انسان کو زندگی بھر بھٹکایا، گناہ کی جانب مائل کیا..

آسمان ابر آلود تھا اور اُس پر کچھ اعتماد نہ کیا جا سکتا تھا کہ کب اُس کی سرد ابر آلودگی میں سے برف کے گالے اترنے لگیں..

ایک خاموش سی اگرچہ صاف ستھری عمارت گزر گئی..

''تارڑ صاحب یہ بوڑھے جانوروں کا ہوم ہے..جیسے اولڈ پیپل ہوتے ہیں..یہاں لاچار ہو چکے عمر رسیدہ جانور..گدھے، گھوڑے، خچّر، بلیاں وغیرہ اپنی عمر کے آخری ایام اطمینان سے آسودگی سے بسر کرتے ہیں..انہیں اپنے جانوروں کا بھی اتنا خیال ہے اور عراق اور افغانستان میں ہلاک ہونے والے بچوں کا کچھ خیال نہیں..'' شاہد کہتا جاتا تھا اور اُس کے لہجے میں آزردگی تھی..

♦♦.....♦♦.....♦♦

''پلیز ایک اور پرفیوم خریدلو..''

''پلیز'' پرفیوم کی خریداری کے بعد ہم بالکل ہی فارغ ہو گئے اور ابھی پاکستان کے لیے پرواز میں ایک مدت حائل تھی..اب کیا کریں؟

وہاں ایمسٹرڈیم ایئرپورٹ کے شہر میں ایک پھولوں کی دکان بھی تھی جہاں سے میں نے ٹیولپ کے بلبوں کے چند پیکٹ خریدے اور ایک خوش بدن خاتون سے جو کہ اُس فلاور شاپ کی نگہبان تھی، ٹیولپ کو پاکستان میں اُگانے کے بارے میں رہنمائی کی درخواست کی کہ وہ خاتون ہر نوعیت کے پھولوں اور خاص طور پر ٹیولپ اُگانے کے فن میں عالم فاضل تھیں بلکہ منشی فاضل تھیں..

''آپ نے انہیں کم از کم چار ہفتے..ٹیولپ کے ان بلبوں کو اپنے فریج میں رکھنا ہے..اور جب انہیں بہت سردی لگے گی تو وہ یوں کانپنے لگیں گے..'' خاتون نے کندھے سکیڑ کر اپنے ہونٹوں سے ہُو ہُو کر کے ٹھٹھرنے کا مظاہرہ کیا''اور وہ پھوٹنے لگیں گے، تب آپ انہیں گملوں میں منتقل کر دیجیے گا.. مجھے یقین ہے کہ ہالینڈ کے یہ ٹیولپ آپ کے وطن میں بھی کھل جائیں گے..''

ایمسٹرڈیم سے اٹھتی لاہور کی جانب روانہ ہوتی پی آئی اے کی پرواز کے اندر ہر سُو پاکستان کی مہک تھی..وہی شور شرابہ..مسافروں کی وہی بدنظمی اور غسل خانوں کی وہی مہک آور ابتری لیکن..اس جہاز کے اندر ایک اپنائیت تھی جو اعصاب کو سکون دیتی تھی..ہم اپنے آپ کو بُرا کہنے اور مطعون کرنے کے چیمپئن ہیں لیکن پی آئی اے اتنی بری نہیں بلکہ بہت سوں سے اچھی ہے..عینی ہمیشہ کہتی تھی کہ ابو.. لاہور سے نیویارک جاتے ہوئے پی آئی اے کی پرواز کے دوران پاکستان میرے ساتھ پرواز کرتا ہے..اور میں آپ کے لیے اداس نہیں ہوتی اور جب نیویارک سے فلوریڈا کی فلائٹ پر بیٹھتی ہوں تو وہاں اجنبی چہرے اور اجنبی زبانیں ہوتی ہیں..کچھ بھی شناسا نہیں ہوتا اور تب یکدم مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں پاکستان سے اور آپ سے بچھڑ گئی ہوں اور میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں.. تو پی آئی اے اتنی بری نہیں ہے..

ہماری پرواز پاکستان کے سرزمین پر اتر کر ہولے ہولے رینگتی تھم گئی اور جب ہم دونوں ایک اژدہا مانند سُرنگ میں سے نکل کر لاہور ایئرپورٹ میں داخل ہوئے تو وہاں سُمیر کھڑا تھا..وہ ان دنوں اے ڈی کسٹم کے طور پر لاہور ایئرپورٹ پر تعینات ہوا تھا اس لیے وہ کہیں بھی سرکاری طور پر موجود ہو سکتا تھا..

نکلتی ہیں تو ہاتھ خالی ہوتے ہیں، وہ اپنے پیسے دوپٹے کی گرہوں میں باندھ کے رکھتی ہیں تو کیوں نہ انہیں کوچ کا ایک بیگ بھیج دیا جائے.. اُنہیں ہم پر اس لیے بھی ترس آتا ہے کہ اُن کے خیال میں اُن کی اماں جان اگر کسی ڈنر پر جاتی ہیں تو وہ اپنے لباس پر یا تو عطر پھلیل چھڑکتی ہیں اور یا پھر وہ تیز عطر لگاتی ہیں جو مولانا حضرات کی داڑھیوں کو خوشبودار کرتا ہے.. میک اپ کے لیے اُن کے پاس تبت سنو کے سوا کچھ بھی نہیں..

چنانچہ ہم اپنے یوروز کو جلا دینا چاہتے تھے لیکن ہمیں کسی بھی نوعیت کی شاپنگ کے جواز کی ماچس نہ ملتی تھی تب میں نے میمونہ کے کان میں سرگوشی کی ''آئس کریم کھاؤ گی؟''

''کھاؤں گی..'' اُس نے فوراً ایک بچے کی مانند سر ہلایا..

وہ ایک امریکی آئس کریم پارلر تھا جس کے کاؤنٹر کے پیچھے ایک لڑکی ایک پُتلی کی مانند گھومتی، پھرکتی گاہکوں کو بھگتاتی مسکراتی تھی.. اس دوران ایئرپورٹ کے فرش کو ایک کُوچی سے مصفّا کرتا ایک قدرے گندمی رنگ کا سیاہ بالوں والا شخص آیا اور وہ لڑکی اُس کے ساتھ گپ لگانے لگی اور میں نے اندازہ لگایا کہ یہ گپ بازی ڈچ زبان میں نہیں کسی اور زبان میں لگائی جا رہی ہے اور یہ زبانِ یارِ من ترکی تھی اور وہ دونوں تُرکی جانتے تھے کہ تُرک تھے.. آئس کریم کے متعدد سکوپ کھا کر میمونہ چہکنے لگی.. میں نے اُس کی چہچہاہٹ کا فائدہ اٹھا کر کہا.. کُچھ نہ کُچھ تو خرید لو..

''ناجیہ نے کہا تھا کہ ان دنوں سینٹ لارین کی پرفیوم 'پلیژر' بہت اِن ہے.. لیکن میرے پاس تو پہلے سے ہی اتنے پرفیوم ہیں کہ میں اُن سے چھٹکارا حاصل کرنے کی خاطر اُنہیں گھریلو ملازموں میں بانٹتی پھرتی ہوں تو ایک اور پرفیوم کیا کروں گی۔''

میمونہ کے اس بیان نے میری ایک اُلجھن حل کر دی.. ہمارے گھر میں کام کرنے والی ایک تعلیم حاصل کرنے کے شوق میں غرق بچی جب کبھی میرے قریب سے گزرتی تو مجھے شائبہ ہوتا کہ میمونہ گزری ہے.. صرف اس لیے کہ وہ وہی خوشبو لگائے پھرتی تھی جو میمونہ لگاتی تھی.. میرے ایک عزیز دوست بھٹی صاحب بھی ایک بار اسی مخمصے کا شکار ہوئے تھے.. فیکٹری سے واپس آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ اُن کی بیگم فرش پُونچھ رہی ہیں، وہ قدرے والہانہ انداز میں اُن کی جانب ملتفت ہوئے تو عین موقع پر صد شکر کہ انکشاف ہو گیا کہ وہ تو گھریلو ملازمہ ہے جنہیں اُن کی بیگم نے اپنا ایک پسندیدہ سُوٹ عطا کر دیا تھا جسے وہ زیب تن کیے ہوئے ہے..

دسمبر کے اوائل کی اُس شب، سرد سیاہ شب میں جب میں نے اس سفرنامے کا آغاز کیا تو چار چیزیں تھیں جو مجھے ہالینڈ کی قربت کی یاد دلاتی تھیں، اُن چاروں میں نہ تو قادر آباد کی جھیلوں کا کوئی شکار منظر تھا، نہ کوئی دریا اور نہ ہی سوات کا ایک سلیٹی منظر اور نہ ہی کوئی چوک چکلا تھا بلکہ چار گُل بدن بُوٹے تھے جنہیں میمونہ نے اتنی احتیاط سے ایک سُوٹ کیس میں پیک کیا تھا کہ ایمسٹرڈیم سے لاہور تک کے فضائی سفر کے دوران اُن کی نازکی کو کُچھ گزند نہ پہنچی..وہ گُل بوٹے اور اُن کا پتہ پتہ ہالینڈ میں ہمارا حال جانے تھا..سنگ مرمر کے گملوں میں بوئے ہوئے ہائی سنتھ پھولوں کے بلب جو ابھی پُھوٹ رہے تھے وہ تو لاہور کے نسبتاً گرم موسموں میں یوں کھلے، ایسے گُل بہار ہوئے کہ اُن کے جامنی اور گلابی پھولوں کی مہک ایک خمار کی مانند سارے گھر میں سرایت کر گئی..ہم خوابیدگی سے پہلے انہیں صحن میں سے اٹھا کر بستر کے برابر میں سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیتے..راتوں میں جب کبھی بیدار ہوتے تو اُن کی مست مہک ہمیں مدہوش کر کے پھر سے سُلا دیتی..وہ ہمارے خوابوں کو بھی یُوں معطر کرتے جیسے وہ کسی فریدالدین عطار کی دکان میں کشید کردہ ہوں..

اور وہ جوشیر کا چہرہ سرخ امریلس پُھول تھے..اور ہر سبز نمود پر تین تین پھول، وہ اتنے بڑے تھے کہ اُن کے بوجھ سے پلاسٹک کا گملا اوندھے منہ گر جاتا..جاپانی بانسائی.....کا مختصر درخت بھی خوش دکھائی دیتا تھا..اُس کے پتوں کی تازگی اور ہریاول خبر کرتی تھی کہ فی الحال وہ پاکستانی موسموں میں پنپ سکتا تھا..

اور آج دسمبر کی اُس سیاہ شب کو بیتے ہوئے تقریباً پونے چار ماہ گزر چکے ہیں، یہ مارچ کے بہار یہ دن ہیں..جب میں اس سفرنامے کی آخری سطریں تحریر کر رہا ہوں..ابھی تک سرما کی ٹھنڈک ٹھہری ہوئی ہے..یہ ٹھنڈک عُمر کی بھی ہے کہ میں یکم مارچ کو بہتّر برس کا ہو گیا ہوں..ماڈل ٹاؤن پارک کے میرے سیر کے ساتھیوں نے میری سالگرہ کے موقع پر اور یقین کیجیے میں مانتا نہ تھا، ایک جشن برپا کر دیا تھا..سویر کی اُس ہوا میں جس میں بقول غالب شراب کی تاثیر تھی سینکڑوں لوگوں کی موجودگی میں میں نے اُس رسیلے چاکلیٹ کیک پر چُھری سے وار کیا جسے عادل کے شامی کیک ماسٹر نے خصوصی طور پر تیار کیا تھا اور وہ کیک اُس میز سے بھی بڑا تھا جس پر اُسے رکھا گیا..اُدھر ڈوگر صاحب کے ہرکارے رات گئے گوجرانوالا پہنچے اور وہاں کے مشہور زمانہ پائے بنانے والے غنی کی کم از کم چار دیگیں اٹھا لائے تھے..ان کے سوا چنیوٹی ''کُناں'' گوشت کی متعدد دیگیں تھیں..ڈوگر کے گھر میں شب بھر تیار ہوتا گاجر کا حلوہ

''آپ کے سامان میں اگر کچھ ایسا ہے جو ڈکلیئر کرنا چاہیے تو پلیز کر دیں.. میں آپ سے بھی کچھ رعایت نہیں کر سکتا۔'' وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا..

''تمہاری امی کی خرید کردہ 'پلیژر' پرفیوم کی ایک بوتل ہے اور.. کچھ کانچ کا سامان ہے..''

''کانچ کا سامان؟''

''ہاں.. ایک بانسائی مختصر درخت.. کچھ گملے، پھوٹتے ہوئے کچھ گل بوٹے اور ٹیولپ کے چند بلب.. اب ہمیں گھر لے چلو۔''

اور وہ جو شب تھی دسمبر کی، سرد اور سیاہ شب جب میری سٹڈی کے باہر دسمبر کی رُت کے پالے اترتے تھے، چیڑ کے درخت کے بالوں میں ایک ہلکی دُھند اترتی تھی.. یہاں تک کہ گارڈن لائٹس کی روشنیاں بھی ٹھٹھرتی مدھم ہوتی تھیں تب میں نے اس سفرنامے کا آغاز کیا تھا، یہ اتنا ہنگامہ خیز، مہمات سے بھرپور اور جنوں انگیز تو نہیں ہے جتنے میرے ماضی کے سفرنامے ہوا کرتے تھے، اس لیے کہ عمر کے پلوں تلے برسوں کے بہت سے پانی بہہ چکے تھے اور اُن کے ساتھ میری نوخیزی، بے دریغی کے ساتھ وحشتیں اور محبت کی حدّتیں بھی بہہ چکی تھیں.. میں وہ نہ رہا تھا جو کہ کبھی تھا تو یورپ کا میرا یہ سفرنامہ کیسے ایک ''نکلے تری تلاش میں''، ''اندلس میں اجنبی'' یا ''خانہ بدوش'' ہو سکتا تھا... میں نے اسے اس لیے تحریر کر دیا کہ مجھے اس مختصر سفرِ یورپ کے دوران ایسے محبت بھرے اور مہربان لوگ ملے جن کا میں مقروض ہو گیا.. اگرچہ یہ قرض بے جا محبتوں اور چاہتوں کا چکائے نہیں چکتا.. اور کیا جانیے کہ عُمر کا یہ رخش گھوڑا کہ نہ پاؤں رکاب میں ہے اور نہ ہاتھ میں لگام ہے تو اب کبھی نہ رُکے مجھے فنا کی وادیوں میں لے جائے تو اس سفر کو قلمبند کر دو اس سے پیشتر کہ دل کے ساتھ قلم بھی بند ہو جائے.. اور ہم رہیں، نہ رہیں.. بقول امیر مینائی..

قیامِ روح پہ قالب میں اعتماد نہ کر — کُچھ اعتبار نہیں مہماں رہے نہ رہے
شب وصال غنیمت ہے پھر خدا جانے — کہ صُبح کو وہ قمر مہرباں رہے نہ رہے
دو روزہ زیست غنیمت ہے ذکر حق کر لے — بدن میں جاں دہن میں زباں رہے نہ رہے
امیر جمع ہیں احباب درد دل کہہ دے — پھر التفاتِ دل دوستاں رہے نہ رہے

تھا اور پارک میں نصب شدہ تنور میں سے گرم گرم نان برآمد ہو رہے تھے.. کشمیری چائے یا گرم کافی اور ازاں بعد لسّی وغیرہ کا تو کیا ذکر از کار..

یہ ایسے بے لوث لوگ تھے کہ اُن کی محبت نے مجھے آبدیدہ کر دیا کہ اُنہیں مجھ سے کچھ کام نہ تھا، کچھ غرض نہ تھی.. تو یہ ٹھنڈک صرف مارچ کے مہینے کی ہی نہ تھی میری عُمر کی بھی تھی جسے ان لوگوں نے گرما دیا..

مارچ کے اس مہینے میں میرے صحن میں ٹیولپ کھلنے لگے...

ایمسٹرڈیم ایئرپورٹ کی اُس فلاور شاپ سے حاصل کردہ ٹیولپ کے بلب.. جنہیں میں نے کُچھ روز فریج میں سٹور کر دیا تھا اور جب وہ پھوٹنے لگے تھے تو اُنہیں گملوں میں منتقل کر دیا تھا، وہ کھلنے لگے ہیں مجھ سے ملنے کے لیے جو کوئی بھی ملاقاتی آتا ہے وہ اُن کی نایاب شکلیں اور انوکھے رنگ دیکھ کر ٹھٹک جاتا ہے.. ان میں گلابی نگت کے علاوہ نیم سیاہ رنگوں کے کچھ ٹیولپ بھی ہیں جو ایک حسین سوگواری میں میرے صحن میں بہار دیتے ہیں.. اور یہ پھول ٹیولپ کے مجھے گُل لالہ کی سرزمین میں یوں لیے جاتے ہیں جیسے ہولے ہولے بڑھتا نشہ آپ کو کسی عشق خاص کی جانب لیے جاتا ہے..

''جب موسمِ بہار کا آغاز ہوگا میں ایک مرتبہ پھر..
اپنی محبوبہ کے لیے ایمسٹرڈیم سے گُلِ لالہ لے کر آؤں گا..
ہاں، ایک محبت بھرے دل کا تحفہ..
میں تمہارے لیے ایمسٹرڈیم سے گُلِ لالہ لے کر آؤں گا..''

10 مارچ 2011ء

♦♦.....♦♦.....♦♦

WITHDRAWN
From Toronto Public Library



TORONTO PUBLIC LIBRARY
37131 141 898 965
DR Dawes Road

Tārar̤, Mustanṣir Ḥusain.
"Hello Hālainḍ" :

www.sangemeel.com
ISBN-10: 969-35-2454-3
ISBN-13: 978-969-35-2454-3
9 789693 524543